

چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

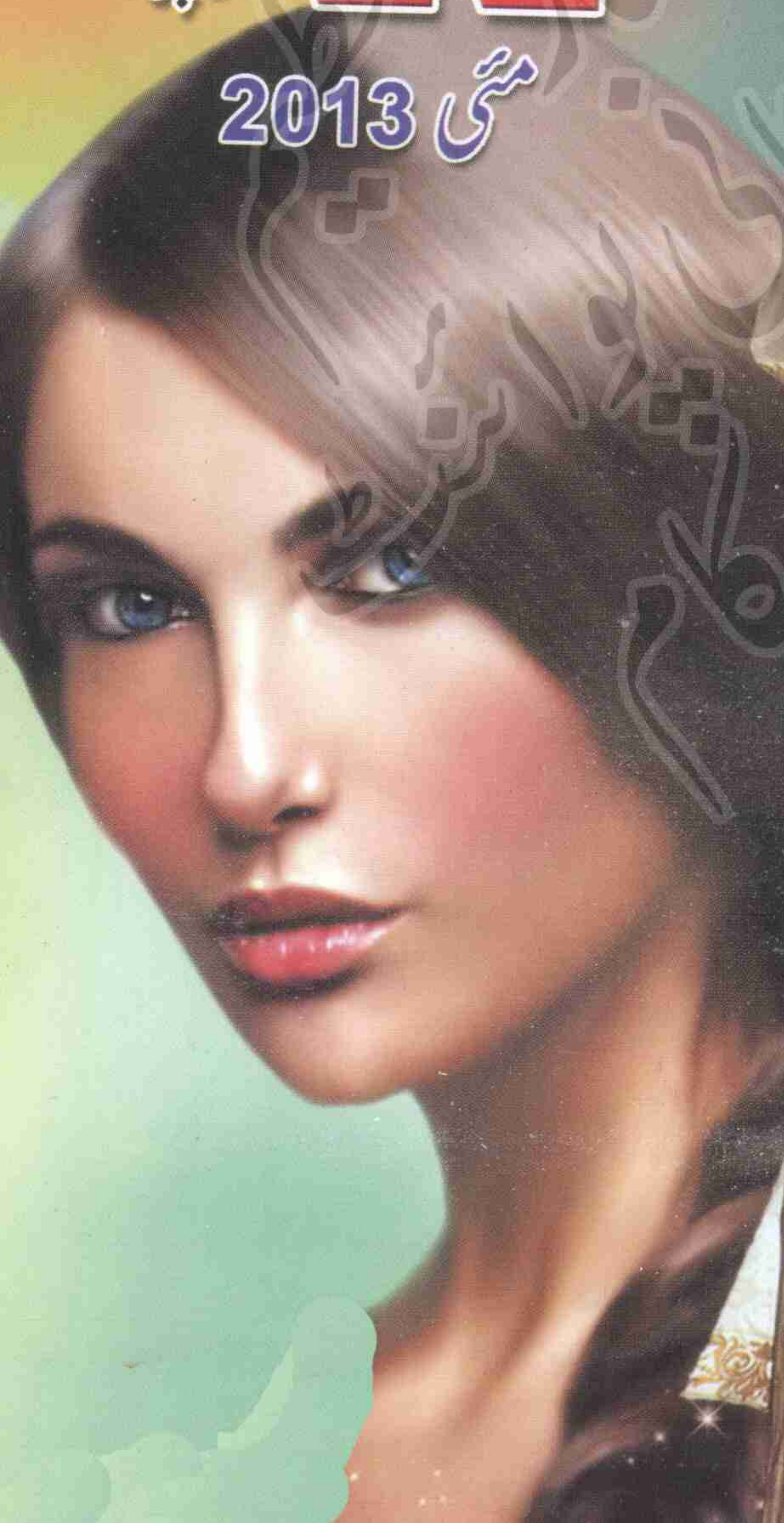
ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

دکھ

مئی 2013



درتوبہ

ساحل دعا بخاری

16

سب رقتاری سے دل و دماغ کو درد کے
گھٹنے میں جکڑتی ہوئی ایک شاہکار کہانی

آغوش

راشد نذیر طاہر

33

انجی کہتیں کہ حلائی لوگوں کے لئے ایک
گوشِ ظہیر، حیرت انگیز مگر سبق آموز کہانی

عشق حیات ہے

اقصیٰ رباب

41

چاہت و غلوں سے سرشار ایک نوجوان کی
روداد جس نے محبت کی خاطر موت پر غلبہ پایا

رولوکا

اے وحید

50

وہ دینی پر امر و نہی کا ملک تھا جس کی حیرت انگیز
ادھ جہلی کفر و ساری آپ کو کفر کے دہانے کی

غیر انسانی مخلوق

محمد رضوان قیوم

71

یہ کہا کہ ایک دوست ہے کہنا دیدہ اور بارہائی
مخلوق دینش عام انسانوں کی طرح واقعی ہیں

موت کی مسکراہٹ

عثمان غنی

79

پیش و نشاط کے گرداب میں غوطہ زن جسم
پرستہ طاری کرتی ایک حیرت ناک روداد

انتقام

نظارت نصر

87

ظفر، دلفان و دشت ناک اور تیر انگیز
کہانیوں کے حلائی لوگوں کے لئے تحفہ کہانی

خونی مردے

صفدر شاہین

92

رات کے گھناؤپے مجرم جس نے ختم لینے والی
ایک عجیب و غریب حیرت ناک انوکھی کہانی

سنہری تابوت

ایم اے راحت

110

شاہکار کہانیوں کے حلائی لوگوں کے لئے
انجی جس واقعی حیرت انگیز اور تیر انگیز کہانی

شعلے کی موت

ایس امتیاز احمد

133

عجیب حیر انگیز..... تیر انگیز اور دل و دماغ
دہلاتا اور رو گھٹنے کھڑے کرتا شاخسانہ

ہمدرد روح

ساجدہ راجہ

139

کیا یہ حقیقت ہے کہ بعض رو جس بھی سالہا
سال سرگرداں رہتی ہیں۔ ایک دلکش کہانی

موت کی سختی

غلام نبی نوری

149

آکھشت بدنماں اور جسم و جاں پر خوف و لرزہ
طاری کرتی سبق آموز اور حقیقی روداد

قبر

احسان سحر

155

دل و دماغ پر دھشت اور دھشت طاری کرتی
انجی نوعیت کی ایک خوف ناک اور ڈرائی کہانی

آخری دعا

کے۔ اے۔ راجپوت

167

رو گھٹنے کھڑے کرتی..... رنگ و بے میں
سنسنی پھیلائی جسم پر لرزہ طاری کرتی کہانی

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

174

جس اور سسٹم سے بھرپور واقعات جو
پڑھنے والوں کو ہر طرح حیرت میں ڈال دیں گے

سنیاسی راج کمار

عامر ملک

197

حرفِ حرف اور سطر سطر جس اور انجی میں
واقعی حقیقت سے دوچار دلکش اور غریب کہانی

قوس قزح

ادارہ

211

قارئین کے جیسے گئے اشعار جنہیں قارئین
بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں.....

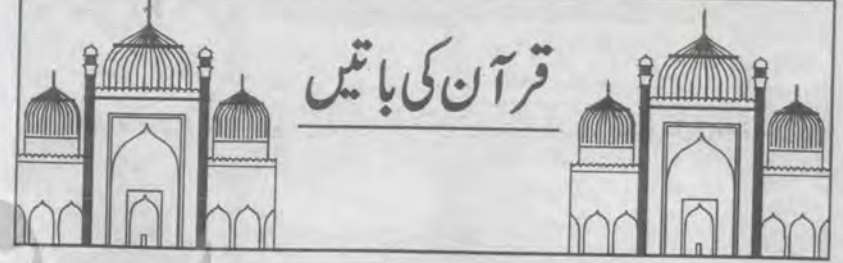
خونی سفر

شہزادہ چاند زیب عباسی

216

سوچ کی دادی میں مجھے پرواز دل و دماغ
کو فرحت بخشی دل فریب اور تیر انگیز کہانی

قرآن کی باتیں



☆ اگر تم بارش کے سبب تکلیف میں ہو یا بیمار ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں کہ تمہارا تار رکھو مگر ہوشیار ضرور رہنا اللہ نے کافروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 102)

☆ اور بارش میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز کر دیتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 164)

☆ اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہ نکلے۔ پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آگیا۔ اور جس چیز کو زیر یا کوئی اور سامان بنانے کے لئے آگ میں جاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور پانی جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے اس طرح اللہ صحیح اور غلط کی مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ (سورۃ رعد 13 آیت 17)

☆ اور وہی تو ہے جو لوگوں کے نامید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا اور اپنی رحمت یعنی بارش کی برکت کو پھیلا دیتا ہے اور وہ کارساز اور سرزاور تعریف ہے۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 28)

☆ تو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے بے شک ہم ہی نے پانی برسایا۔ پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا پھر ہم نے اس میں اناج اگایا۔ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گنے گنے باغ اور میوے اور چارباہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چارپایوں کیلئے بنایا۔ (سورۃ عنکس 80 آیت 24 سے 32)

☆ اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے۔ اور جو کچھ گھٹ رہا ہے اسے بھی جانتا ہے، اور جو کچھ بڑھ رہا ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 8)

☆ ہم نے انسان کو مٹی کے سست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو تو کھڑے کی شکل دی۔ پھر کھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔

☆ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا پس بڑی ہی برکت ہے اللہ۔ (سورۃ مؤمنون 23 آیت 14)

☆ اس نے انسان کی پیدائش کی ابتدا گارے سے کی ہے۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے سست سے چلائی

جو حقیر پانی کی طرح ہے۔ (سورۃ جمدہ 32 آیت 8)

☆ ہم نے انسان کو ایک مخصوص نطفے سے پیدا کیا۔ (سورۃ دھر 76 آیت 2)

☆ اللہ نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا۔ پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔ پھر اس کے لئے زندگی کی راہ آسان کی۔ (سورۃ عنکس 80 آیت 19 سے 20)

☆ انسان کو ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ (سورۃ طارق 86 آیت 6)

☆ پڑھو، اے نبی! اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جسے ہوئے خون کے ایک قطرے سے انسان کی تخلیق کی پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا ہے جسے وہ نہ جانتا تھا۔ (سورۃ علق 96 آیت 1 سے 5)

☆ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری ہے گی اور عمل نیک کرے گی اس کو ہم دونا ثواب دیں گے اور اس کے لئے ہم نے عزت کی روزی تیار کر رکھی ہے۔ اسے پیغمبر کی پیروی! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم پر ہیزار گارہنا چاہتی ہو تو کسی اجنبی شخص سے نرم نرم باتیں نہ کیا کرو تاکہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہے کوئی امید نہ پیدا کر لے۔ اور ان میں دستور کے مطابق بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہارِ جہل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ اور نماز پڑھتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتی رہو۔ اے پیغمبر کے اہل بیت، اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کا میل پکھیل دور کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔ اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں پڑھیں جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بے شک اللہ باریک بین اور باخبر ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 31 سے 34)

☆ یا ان کی مثال مینہ کی سی ہے کہ آسمان سے برس رہا ہو اور اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو اور بادل گرج رہا ہو اور بجلی کو ندر رہی ہو تو یہ کڑک سے ڈر کر موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور اللہ کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کی بصارت کو اچک لے جائے جب بجلی چمکتی اور ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں کی شنوائی اور آنکھوں کی بینائی دونوں کو زائل کر دیتا۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 19 سے 20)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“، بشکریہ شیخ بک ابجدی کراچی)

ساجدہ راجہ ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے ڈرکی تمام ٹیم اور قارئین کو السلام علیکم، ڈرکا ٹائل دن بدن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے اور معیار رتوں کا شروع سے ہی بلند ہے اور انشا اللہ ہمیشہ بلند رہے گا (آمین) مارچ کا تمام شمارہ بہت زبردست تھا لیکن بلیک ٹائیگر سے کافی مایوسی ہوئی بلکہ ہر ماہ ہوتی ہے۔ مارچ کے شمارے میں نوشین خان صاحبہ آپ نے مجھ سے دوستی کی ریکویسٹ کی..... موٹو دیکھ نوشین جی..... پچھلے ماہ آپ کا خط اس وقت پر حجاب خط پوسٹ کر چکی تھی اس لئے جواب دے پائی اس کے لئے معذرت۔ اپنے بارے میں ضرور بتائیے گا۔ اول تو ہر کسی سے فریڈ شپ کرنی نہیں جب ہو جائے تو ہمیشہ ساتھ دیتی ہوں، آپ مجھے ہمیشہ غصے پائیں گی، کہانیاں موصول ہونیں کہ نہیں ضرور بتائیے گا، بنام آدم خور، کرکٹ بیچ اور عذاب الہی..... آدم خور میری پسندیدہ ترین ہے ضرور پڑھے گا۔ خوش خبری کا انتظار ہے گا..... اجازت جانتی ہوں۔ خدا حافظ۔

☆ ☆ ساجدہ صاحبہ: کہانیاں موصول ہو چکی ہیں امید تو ہے کہ اچھی ہوں گی۔ ایک عام قاری اور رانٹر کی نظر میں فرق ہوتا ہے لہذا رانٹروں سے گزارش ہے کہ پلیز اپنے خیالات اور تحریریں اگر ہر ماہ ارسال کرو یا کریں تو میں نوازش ہوگی۔ آپ کے خط کا بھی شدت سے انتظار ہے گا۔

شگفتہ حسین کراچی سے، ڈرکے تمام پڑھنے اور لکھنے والوں کو میرا پیار اسلام، 3 مئی کے بعد حاضر ہوئی ہوں، اس کے لئے (Sory) کیونکہ مصروفیت کی وجہ سے ڈرکے میں خط نہیں بھیج سکی، اس کے لئے دوبارہ (Sory) اب آتے ہیں اس ماہ کی کہانیاں کی طرف تو دیکھیں تو اس ماہ کی ساری ہی کہانیاں اچھی ہیں۔ پہلے نمبر پر ”سنہری تابوت“ دوسرے نمبر پر ”بلیک ٹائیگر“ ”خون میکر“ بدعا، آسیب، بے چین روح، موت کا گھر، روح کا مسکن یہ سب کہانیاں بھی Best تھیں۔ آخر میں سب ڈرکے پڑھنے اور لکھنے والوں کے لئے بہت سی دعائیں اور ڈرکے لئے بھی دل سے دعا، ڈرڈا بجٹ دن رات ترقی کی منازل طے کرے۔ آمین۔

☆ ☆ شگفتہ صاحبہ: نوازش نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانیاں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی خط لکھنے کے لئے ٹھیکس۔ آج کل مصروف زمانہ سب ہیں، وقت ملتا نہیں بلکہ اکثر وقت نکالا جاتا ہے، کیوں ٹھیک ہے تیار۔

اقصی رباب فیصل آباد سے، السلام علیکم کرامی عمر سے بعد خط کے ذریعے ڈرڈا بجٹ میں شمولیت اختیار کر رہی ہوں، مگر اس عمر میں خطوط کی محفل تک تیار پڑھتی رہی ہوں، ہر ماہ ان تمام لوگوں کا شکریہ جنہوں نے میری کہانیاں پسند کیں۔ آپ سب کی تعریف میرے لئے بہت قیمتی ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے جب خطوط میں اپنا نام دیکھتی ہوں۔ بہت شکریہ سب کا۔ ابھی تک ”ڈرڈا بجٹ“ کے ایک اچھے رانٹر کی موت کا دکھ دل میں محسوس ہوتا ہے۔ جنہیں ٹیلم کی لہروں نے اپنے اندر چھپا لیا۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ سب کے لئے دعائیں۔ اور سب کی دعاؤں کی طلبگار۔

☆ ☆ اقصیٰ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ڈرکی محفل میں شمولیت اختیار کی اور امید وائش ہے کہ آئندہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع دیتی رہیں گی۔

آستور وندھاوا کراچی سے، السلام علیکم، اپریل کا ڈرڈا بجٹ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہاتھوں میں آیا۔ پڑھ کر کوئی خوشی ہوئی، میری نظر میں شروع سے آخر تک کی تمام تحریریں اپنی مثال آپ ہیں۔ کسی ایک کی تعریف میں ملتی ہوئی کیونکہ تمام رانٹروں نے اپنی جگہ خوب سے خوب تر لکھا اور یہ خوبی بھی ڈرڈا بجٹ کی ہے کہ اپنے تمام قارئین کا گھر پور خیال رکھتا ہے اور چھوٹے بڑوں کی پسندیدہ کہانیاں شائع کرتا ہے، ویڈیو ڈرڈا بجٹ، میں ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں اور امید ہے کہ شکریہ کا موقع ملے گا۔ ڈرکی مزید ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆ ☆ آستر صاحبہ: خط لکھنے، کہانیاں اور رانٹروں کی تعریف کے لئے دیر ویری دیر کی تھیں، آپ کی کہانی بہت ہی چھوٹی ہے، کہانی کے صفحات کچھ اور بڑھائیں اور تمام تحریر پر دو بار قلم گھمائیں تاخیر کو بے کار کر دیتا ہے امید ہے غور فرمائیں گی۔

صدف حسین کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈرکا پورا اسٹاف خوش و خرم ہوگا۔ دو مئی کے بعد ڈرکی محفل میں حاضر

ہو رہی ہوں، اس کی جیسے مصروفیت رہی، اس کے باوجود ڈرکا مطالعہ ضرور کیا اور کوئی کہانی، آرٹیکل، خطوط، قرائن کی باتیں، قوس و قزح اور غزل غرض کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ سب سے پہلے میں فروری کے شمارے کی بات کروں گی۔ قسط وار کہانیوں کو ہٹا کر (کیونکہ وہ تو ہوتی ہی زبردست ہیں) فرسٹ نمبر پر ”خلاء سے داپسی“ سیکنڈ پر ”شیطان کی کھوپڑی“ اور تھرڈ پر ”کلون“ تھی، ان رانٹروں کو بہت بہت مبارکباد دی گئی۔ اب آتے ہیں مارچ کے شمارے پڑھنا ٹائل کی بات کروں گی، پچھلے مئی بہت ہی زبردست تھا اس کے برعکس اس ماہ کا ٹائل بھی اچھا نہیں تھا۔ خطوط کی محفل میں سب دوستوں سے ملاقات ہوئی، بہت اچھا لگا۔ قاریہ تبسم، اسرارہ نوشین، غلام نبی نوری، احسان عمر، ایس اتیاز احمد، شرف الدین جیلانی اور مبارک رمضان کو میرا بہت سلام۔ آرٹیکل بہت زبردست تھے۔ اشعار کی محفل میں ”محمد اسحاق انجم، حکیم خان حکیم، غلام نبی نوری، افشار رمضان، فریدہ خانم، واجد گینگوئی اور بلقیس خان کی شاعری بہت زبردست تھی۔ کہانیوں میں پہلے نمبر پر ”پاگل بچی“ پسند آئی۔ عمران فریش میرے Favourite رانٹر ہیں۔ دوسرے نمبر پر ”ڈیجھ ہاؤس“ اور ”بد دعا“ تیسرے نمبر پر ”خون میکر“ اچھی لگی۔ کہانی ”بد دعا“ کے جو رانٹر ہیں راجندر سنگھ بیدی بہت اچھے اور بڑے رانٹروں ہیں۔ دوسری کہانیوں میں ”موت کا گھر“ فرار، بے چین روح، ٹیلی گٹھی اور بدروحوں کا مسکن“ اچھی لگیں۔ ”آسیب“ اچھی نہیں تھی۔ قسط وار کہانیوں میں رولو کا ہر ماہ کی طرح بیٹ آف دی مٹھ رہی۔ ”سنہری تابوت“، ”کرکٹ تھی“۔ ”بلیک ٹائیگر“ کو اب پلے جانا چاہئے۔ آخر میں سب کے لئے ڈیروں و دعائیں اور سلام۔ اللہ حافظ۔

☆ ☆ صدف صاحبہ: بڑی خوشی کی بات ہے کہ سب وعدہ آپ آئندہ اپنی مصروفیات سے ڈرکے لئے آدھا گھنٹہ لکھنے کے لئے نکال لیا کریں گی۔ قلمی لگاؤ سے کہانیاں کی تعریف اور آئندہ بھی شکریہ کا موقع دینے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

اسمارہ نوشین فیصل آباد سے، السلام علیکم، اپریل کا ڈرڈا بجٹ پڑھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا، میری خبری کہانی دن بیاں ارسال خدمت ہے، امید ہے پسند آئے گی، بہت ساری دعائیں اور سلام، بلقیس خان، شرف الدین جیلانی، ایس حبیب خان، قازمہ رزق، شگفتہ حسین، عائشہ رمان، زاہدہ عطا محمد، قاریہ تبسم، غلام نبی نوری، صدف حسین، محمد علی چغتائی، محمد اسلم جاوید، راجہ باسط مظہر، محمد وارث آصف، ایس اتیاز احمد، حفیظ منی، قدیر انارڈا ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام رانٹروں اور پڑھنے والوں کے لئے اور بہت سارا پیار کا کلمات بلوچ، ساجدہ راجہ اور اقصیٰ رباب کے لئے اور اقصیٰ رباب کے لئے Advance Happy Birthday کا بیج۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں۔

☆ ☆ اسمارہ صاحبہ: کئی ماہ بعد آپ کی کہانی موصول ہوئی، بہت بہت شکریہ اور اب امید کرتے ہیں کہ طویل غیر حاضری کے متعلق غور فرمائیں گی اور پھر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ ادارہ اور تمام قارئین کی طرف سے بھی اقصیٰ رباب صاحبہ کو سالگرہ مبارک ہو۔

قاریہ تبسم شینگ موڑھو سے، آداب! ڈرکے تمام قارئین رانٹروں، اسٹاف اور تمام غلے کو میری طرف سے سلام، اپریل 2013ء کے شمارے سے جلد ہی ملاقات ہوئی، سرورق نہایت شاندار تھا۔ جلدی سے خطوط دیکھے، اپنا خط پا کر خوشی ہوئی، بلقیس خان کا شکریہ، دیگر خطوط میں غلام نبی نوری، نورین اعظم، ساجدہ راجہ، ساحل دعا بخاری، شفیق علی اور مریم ماہمیر کے خطوط محبت بھرے انداز میں بھیجے تھے۔ کہانیوں میں رولو کا بیٹ آف مٹھ تھی۔ سنہری تابوت اور بلیک ٹائیگر بھی اچھی تھیں۔ اس کے علاوہ ناگ منی، راج دلاری، مافوق الفطرت، مسکن اور مہمان اور جاتی و جدالی میں بول کرنے والی تھیں، افشار رمضان، انوری، اقصیٰ رباب اور نوشین خان پلیز واپس آئیں، آپ کا انتظار ہے۔ قوس قزح میں اقصیٰ رباب و غلام نبی نوری و انوری رمضان، نوشین خان، شرف الدین جیلانی اور مریم ماہمیر کے کلام اچھے دل موہ لینے والے تھے، بھائی غلام نبی نوری صاحب میں نے آپ کی ولیم کتاب خرید کر بھیجی، واقعی میں انتہائی دل افروز تھی، اللہ آپ کے قلم میں مزید نکھار پیدا کرے۔ آمین۔

☆ ☆ قاریہ صاحبہ: قلمی لگاؤ کے ساتھ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، ڈرڈا بجٹ سے آپ کی لگن واقعی قابل دیدہ ہے، امید ہے ہر ماہ ایسی لگاؤ کے ساتھ شکریہ کا موقع دیتی رہیں گی۔

ساحل دعا بخاری بھیر پور کا ڈرڈا بجٹ آپ کا سال کرڈو نوازش نامہ بابت کہانی ”دروہ“ ملا تھا اور اس کے جواب میں لکھا گیا تھا کہ آپ کی کہانی موصول نہیں ہوئی، جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں، دراصل ہر کہانی رجسٹر میں انٹری ہوتی ہے اور جو صاحب انٹری کرتے ہیں ان سے آپ کی کہانی انٹری ہونے سے رہ گئی۔ اور آپ کے خط کے پیش نظر ان کی اچھی چھان چکھ ہوئی اور تلاش

☆ شرف الدین صاحب: آپ کا قلمی خلوص نامہ پڑھ کر دل خوش ہوئی ہے اور آپ کی چاہت ڈرڈائجسٹ سے قابل دید ہے۔ ہماری اور قارئین کی دعا میں آپ کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

☆ اسحاق انجم: کلنگن پور سے، السلام علیکم، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے! ماہنامہ ڈرڈائجسٹ شمارہ اپریل 2013ء ملا، خوب صورت ٹائٹل اور وہ بھی رولو کا والی حسینہ کا بھی لگا دیا۔ قسط وار تحریریں بہت اچھی جاری ہیں اور دیگر تحریریں بھی خوبصورتی کے ساتھ تحریر کی گئی ہیں جو کہ بہت خوب ہیں! شعبہ غزل میں غلام نبی نورانی اور فارسیہ تبسم صاحبہ نے ایک میری غزل اور ایک مسکان فاطمہ کی غزل، غزلوں کو ٹھوس سی ترمیم کر کے آپ کو بھیج دیں جو کہ آپ نے اپریل 13 کے شمارے میں شامل اشاعت بھی کر دیں! جبکہ یہ دونوں تحریریں ڈرڈائجسٹ کے پرانے شماروں میں شامل اشاعت ہیں! یہ دونوں افراد میرے ہی علاقے کے ہیں..... اب کیا شکوہ ان سے "انتخاب لکھ دیتے۔" "چلو کوئی گل نہیں۔"

☆ اسحاق صاحب: آپ کی بات بالکل درست ہے غزل یا اشعار ارسال کرتے وقت اکثر قارئین نہ جانے کیوں انتخاب لکھتا بھول جاتے ہیں، خیر آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ آئندہ ماہ قلمی خلوص نامہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں۔

☆ غلام نبی نورانی: کھڑیاں خاص سے، ڈر کے تمام قارئین، رانٹرز حضرات اور دیگر شائق کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام و محبت پیش کرتا ہوں، ڈرڈائجسٹ شمارہ اپریل 2013ء بہت لیت موصول ہوا، دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، خطوط کی شکل میں آئے تو اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی، شکریہ۔ دیری گزشتہ کئی ماہوں میں سب سے پہلے رولو کا پڑھی، پھر سہتی، اس کے بعد بلیک ناٹنگز منتر و سہتی، سہتی تاوت مصالحتی، باوقظ الفطرت خوب صورت تھی، جتنی دنیا ڈر کے اچھے لیول پر تھی، مہمان بہت ہار تھی۔ ناگ منی، مسکن، خاموش موت، خونی اسپتال، خون عمل اور انوکھا کھانسی ٹھیک تھیں۔ قوس قزح میں تمام شاعروں نے اچھا لکھا۔ آخر میں مجھے اجازت دیں۔ لیکن یہ بتا دیں کہ میری کہانی بنام خوفناک دنیا تک تک شائع ہوگی۔

☆ غلام نبی صاحب: خوش ہو جائے آپ کی خوفناک دنیا، بنام موت کی سختی جلوہ گر ہو گئی ہے، آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔

☆ محمد علی چغتائی: خیر پورا میاں سے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! مجھے ڈرڈائجسٹ سے دور ہوا اور مجبور ہوا وہ اس لئے کہ ایک قومیت تھے دوسرے کہ قلمی میں چار پانچ شادیاں اکٹھی برپا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے ڈرڈائجسٹ میں شرکت نہ کر سکا۔ بہر حال اب فری ہوا ہوں اور فروری، مارچ، اپریل، مئیوں شمارے اکٹھے خرید لیا ہوں اور پڑھ رہا ہوں، کیونکہ ڈرڈائجسٹ کے بغیر باقی نہیں جاتا۔ حسب دستور معمول سب سے پہلے رولو کا اور سہتی تاوت پڑھی جو کہ توقع کے عین مطابق پھر سہتی اور بلیک ناٹنگز بالکل ہی ماضی ہو گئی ہے اور ہاں آپ سے ایک شکوہ ہے وہ یہ کہ ایک Funy Poetry ارسال کی تھی اور ارسال کرنے کی Hope جس طرح کھسی ہے اسی طرح شائع ہو گئی۔ ایک ریکویسٹ کرنی تھی اور وہ یہ کہ آپ رولو کا کے صفحات بڑھادیں جب کہانی کا لطف آنے لگتا ہے تو کہانی ختم اور اس کے بعد انتظار؟؟؟ اگلی قسط کا جو کم از کم مجھ سے تو ہونیں پاتا پیلیز، میری یہ ریکویسٹ ضرور مان لیں اور ہاں پیچہ قریب ہیں پیلیز دعا کریں۔

☆ محمد علی صاحب: ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مجبوریاں دور کرے اور خوشیوں سے نوازے۔ طے آپ کی خواہش پر آئندہ رولو کا کے صفحات اور بڑھادیں گے۔ غزل شامل اشاعت ہے، آپ سے بھی ریکویسٹ ہے کہ آئندہ بھی خلوص نامہ ارسال کر دیا کریں۔ اور آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیاب و کامران کرے۔

☆ عثمان غنی: پشاور سے، السلام علیکم! ماہنامہ ڈرڈائجسٹ ماہ اپریل کا شمارہ 22 مارچ کو مل گیا۔ مارچ اپریل 2013ء کا جاذب نظر تھا۔ خوب صورت حسینہ ماہ جس پر خطر حسن کے ساتھ ڈر کے سرورق پر جلوہ افروز تھی۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے، جو کہ بہت اچھے لگے، ساحل دعا بخاری کا خط پڑھا کہ ایسا کچھ جسے ان کے الفاظ ہمارے لئے ہی ہوں۔ ہم بھی ہر مہینے بڑی آس و امید کے ساتھ ادارے کو اپنے آرٹیکلز، اسٹوری، اینڈ Poetry سینڈ کرتے ہیں۔ مگر ہر بار آس بے باس کر دیتی ہے۔ واقعی ہم بھی اب رنر رفتہ، اس ہی وجہ سے اور انکل کی محبت کی وجہ سے اپنی شامل تحریر بھیج رہے ہیں۔ بہر حال ساحل دعا بنام اللہ آپ کے انکل کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں میں ڈائری، شعبہ شیرازی کی لا جواب تحریر تھی۔ خاموش موت، اچھی لگی، جتنی دنیا، رولو کا کی طرح تھی۔ رولو کا نے مزہ دہا لایا۔ خوب صورت نے نئے انداز میں خود کو منوایا۔ انوکھا کس واقعی خوب صورت تحریر رہی، خونی عمل نے متاثر کیا جبکہ اس ماہ

کی ہر دین تحریر راج دلاری رہی، مجیرہ فاطمہ کی مہمان نے بھی تاوت اپنی رہی۔ لیکن بلیک ناٹنگز ارہ چال گئی۔ باقی سب نے بھی اچھا لکھا..... قوس قزح، ناٹنگز، بلیک ناٹنگز غزلوں میں فارسیہ تبسم نے اچھی کوشش کی۔ غزلوں میں بلقیس خان اور مریم ماہمیر نے زبردست انداز میں دل موہ لئے، باقی ڈرڈائجسٹ دن گئی رات چوٹی ترقی دے۔ آمین۔

☆ عثمان صاحب: خوش ہو جائے۔ آپ کی کہانی "موت کی مسکراہٹ" شامل اشاعت ہے اور بغور اس کہانی کا جائزہ لیجئے گا کہ کہانی میں کتنا اتار چڑھاؤ آیا ہے۔ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ عمل کا بغور جائزہ لیا جائے ایک کلاس میں کبھی بکھار یا پھر یورڈ کے امتحان میں کئی بڑا طالب امتحان دیتے ہیں مگر فرسٹ ایک ہی طالب علم آتا ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ کا بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دینا بھولیں گے نہیں۔

☆ قندیلہ زانا راولپنڈی سے، آداب۔ آپ کی خیریت کا طالب ہوں، اپریل کا ڈرڈائجسٹ پڑھ کر دل خوشی ہوئی، دو غزلیں ارسال ہیں۔ معیاری ہونے کی صورت میں کسی بھی اشاعت میں جگہ دے کر منگور فرمائیں۔

☆ قدیر صاحب: آپ کی معیاری غزلیں شامل اشاعت ہیں، ہر ماہ نیک تناسوں کے ساتھ ڈرڈائجسٹ شمولیت کے لئے دیری ویری تھینکس۔

☆ جاوید اسلم فیصل آباد سے، السلام علیکم سب کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، ضروری کام کے سلسلے میں شہر چھوڑا، واپسی پر یکم اپریل 2013ء کا شمارہ پڑھا، قسط وار قسطوں میں سرورق بہت اچھا لگا اس بار پرچہ کچھ لٹ ہو گیا اور ہر ماہ کی مقررہ تاریخ کو ہی مل جاتا تھا۔ یہ ایک معیاری جزیہ ہے۔ ایسا خوبصورت پرچہ اس مہینے کے دور میں نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ خطوط میں یاد آوری اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بڑے خوب صورت ہیں مثلاً خطوط، قرآن کی باتیں، قوس قزح، غزلیں وغیرہ اس بار ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی وہیے ڈرڈائجسٹ کامیاب تحریروں کا حسین اور دلکش پھولوں سے مہکتا ہوا گلہ استہ ہے آپ کا خلوص اور دعا میں ہمیں ہمارے لئے کافی ہیں۔ اس بار شہر کے چکر پرچے کے بارے میں لگا لگا کے میں تھک گیا تھا۔ تمام قلم کاروں کو ان کی کہانیوں پر میری طرف سے مبارکباد دیتا۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں، کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں، بشرط آپ کا تعاون رہے، موسم آہستہ آہستہ بدل ہی گیا مگر ملک کے معاشی حالات تھیں بدلے ہر طرف کوڈشنگ ہے اور ہر چہرہ پریشان دکھائی دیتا ہے۔

☆ جاوید صاحب: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی خواہش اور سکھ شائستگی کے پیش حالات اور موسم میں تغیر لاتا ہے مگر ہمارے ملک کے کرتا بھرتا لوگ اپنے حال میں مست ہیں۔ ہر روز کو اپنی بڑی ہے، بڑوں کو اپنی ضرورتوں اور مستقبل کی فکر ہے، بدل عوام کی کوئی فکر نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ انجام گلستان کیا ہوگا۔ بس ہم اور آپ اللہ سے صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔

☆ محسن علی: جنت ساہیوال سے، جناب میری کہانی بے وقار لوگ کی اشاعت کا انتظار رہے گا۔ جبکہ میری دوسری کہانی جس کا نام دیما نرکی محبت اور دیما نرکی آواز ہے آپ کی کہانی کے متعلق جواب کا انتظار رہے گا۔ ڈرڈائجسٹ 2013ء کا شمارہ جب مجھے ملا تب بارش ہو رہی تھی، وقت تقامیر سے پاس پورا ہی ایک مرتبہ پڑھ لیا۔ بہت اچھی تھی مگر کچھ آئی کچھ نہیں، مجھے اس کا End اچھا لگا۔ خاموش موت اچھی تھی۔ رولو کا دیری گزشتہ خوب صورت بھی اچھی لگی، خونی عمل قابل تعریف ہے، خونی اسپتال ناٹنگز شیر تو اور اس دنیا میں جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، سہتی تاوت پھر تھی۔ مہمان اچھی کہانی تھی۔ بلیک ناٹنگز سو سو قوس قزح میں ٹیکنیوں کا کلام اچھا لگا۔ تمام شعرا نے اچھا لکھا۔

☆ محسن صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، اپنے وقت مقررہ پر آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہوگی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجتا بھولیں گے نہیں۔ Thanks۔

نوٹ: اکثر غزل اور اشعار کے شوقین حضرات کے متعلق شکایت آتی ہے کہ کسی اور کی غزل پر اپنا نام لکھ بھیجتے ہیں جو کہ بالکل غلط ہے، اگر انتخاب لکھ دیا جائے تو کوئی عزت خراب ہو جائے گی۔ اپریل کے شمارے میں "عصمت اقبال" منگلا ڈیم کی ایک غزل پر ایک صاحب نے اپنا تخلص لکھ کر چھپوایا ہے، جو کہ سراسر غلط ہے۔ امید ہے آئندہ ان باتوں کا شوقین حضرات خیال رکھیں گے اور انتخاب کی جگہ انتخاب ضرور لکھا کریں گے۔ شکریہ۔

سائل دعا بخاری - دیہ پالپور - سیالکوٹ

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، قبر میں مردے کا کفن کھلتے ہی جھٹ
مردے کا وجود ہوا میں معلق ہوا، اور وہ قبر کے باہر موجود
تھا، اس کی قہر برساتی چنگاریوں سے بھری ہوئی آنکھیں اپنے
سامنے وجود پر مرکوز ہو گئیں اور پھر.....

سبک رفتاری سے دل و دماغ کو درد کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی ایک شاہکار کہانی

رات کی سیاہ چادر شام کے لگنے اندھیرے
کو پوری طرح ڈھانپ چکی تھی، دسویں کے چاند کو سیاہ
مائل سرمئی بادل اپنے شکنجے میں بکڑے ہوئے تھے۔
اکادکا ستارے سیاہ بادلوں کے عقب سے جھانکتے
تو ایسا لگتا گویا جتنو جھلملا رہے ہیں۔ پورا گاؤں نیند کی
محو رکن وادیوں میں گم تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے
ایسے دور تھی جیسے افق پر چاند، زمین سے دور تھا۔ بے
چینی میری رگ رگ میں چٹکیاں بھر رہی تھی، بیس
پراہر سے ادھر پھر لگاتے میری ٹانگیں شل ہونے لگی
تھیں۔ تاہم میں چاہ کر بھی ایک جگہ تک کرنہ بیٹھ سکتا
تھا۔ کہ اضطراب میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ
گردش کر رہا تھا، میں اضطرابی انداز میں ہاتھ میں
موجود سیل فون پر گاہے بگاہے ٹائم دیکھ رہا تھا اور وقت
کے پرچے کسی ماورائی قوت سے پل ڈالے تھے۔

ایک ایک لمحہ پچھوے کی سی رفتاری سے رینگ
ریگ کر گزر رہا تھا، جونہی دس بجے، میں برقی روکی
مانند سیڑھیاں پھلا لگتا نیچے اترا۔ براہ آدے کا بلب روشن
کیا اور اسٹور روم سے اپنا مطلوبہ سامان اٹھا کر یہ آہستگی
ستون کے سہارے لگایا اور کھٹ بلب بجھا دیا، بے
پاؤں آگے بڑھ کرائی کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔

چھوٹے زیر و کے لب کی روشنی میں وہ خواب خرگوش میں
گم تھیں میں مطمئن ہو کر سامان اٹھاتا ہر نکل گیا۔
میرے قدم کھیتوں کے نیچ بنی پگڈنڈیوں
کو تیزی سے روند رہے تھے قریب دس منٹ بعد میں
قبرستان میں پہنچ گیا۔ قبرستان کا شگت دروازہ ہلکا دھکیلنے
پر زبردست چرچاہٹ سے کھلتا چلا گیا خوف کی گھات
لگائے بیٹھے روندنے کی طرح مجھ پر ایک دم جھٹ
کر حملہ آور ہوا۔ میں نے سر جھٹک کر قدم آگے
بڑھادیے تاریکی میں قبروں کے کتبے عجیب و غریب
بلاؤں سے مشابہ معلوم ہو رہے تھے میں قبروں کے
پتوں نیچ چلتا، جا بجا اگی جھاڑیوں سے دامن بچاتا
مطلوبہ قبر تک پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر میری وہی حالت ہوئی جو ہمیشہ
ہوتی تھی۔ ایک گہری اداس اور پرانیت میرے دل
میں ہی نہیں روم روم میں گزرتی۔ سارے کا نازک سراپا
میری آنکھوں میں ٹھیک پانی بھر گیا، ہوا کے ایک زوردار
جھکڑے ماضی کے کوڑا حمل گئے اور میرا ذہن ماضی کی
بجول بجلیوں میں بھٹکنے لگا۔

☆.....☆.....☆

میں اماں کے پاس رہتا تھا۔ بابا نے انہیں

چھوڑ دیا تھا، حارث بھائی اور ڈاکٹر بابا کے پاس رہتے تھے، میں ان دونوں سے چھوٹا تھا۔ بابا ہر ماہ اچھی خاصی رقم اخراجات کے لئے بھیجتے تھے، امی اور بابا نے ہم پر کوئی پابندی نہ لگائی تھی، میں کئی دن بابا کے پاس رہتا ہے، حارث بھائی اور ڈاکٹر بھی ہمارے پاس رہتے تھے۔

سارہ صمیر چاچا کی بیٹی تھی، چاچا انگلینڈ میں رہتے تھے جبکہ ان کی پوری فیملی یہیں رہتی تھی۔

میں اور سارہ اچھے دوست تھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے روٹھتے مناتے یہ دوستی کب محبت میں تبدیل ہوئی، ہم دونوں ہی نہ جان پائے تھے۔ ہم بس یہ جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسکول سے واپسی پر ہم اکثر جمیل کنارے گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے اور وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ ویسے یہ اچھا وقت ہمیشہ پر لگا کر اڑتا کیوں چلا جاتا ہے؟ لاکھ قسمی میں بند کرنے کی کوشش کرو، مقید ہی نہیں ہوتا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔

”سامی! ایک بات بتاؤ۔“ میں نے جمیل کے شفاف پانی میں کنکر پھینکا، پانی اس قدر شفاف تھا گویا شیشہ بہہ رہا ہو، تہہ میں نیلگوں مائل سبز رنگی گھاس اور چھوٹے بڑے پتھر واضح دکھائی دیتے تھے۔

”پوچھو۔“ اس نے اپنی بڑی بڑی سبز آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

”اگر میں مر گیا تو؟“ میرا لہجہ عجیب تھا۔

”اللہ نہ کرے۔“ وہ لرز اٹھی۔ ”اگر بندے کی شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لینی چاہئے۔“ اس کی آنکھیں بالبال پانیوں سے بھر گئیں۔

میں بری طرح بوکھلا گیا۔ ”سوری۔“

”جان نکال کے سوری؟“ اس کی سبز آنکھوں میں خفگی کا تاثر تھا۔ چلوں سے ٹوٹے ستارے اب اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔

”پلیز! دیری دیری سوری۔“ میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں پر ستارے چنے۔

”اوکے۔“ لیکن آئندہ ایسی کبواس نہیں کرو گے۔“

”اوکے۔“ میں نے جھٹ وعدہ کر لیا، اس کی خفگی برداشت کہاں ہوتی تھی مجھ سے۔ ہم لوگ ابھی وہیں تھے کہ ایک عجیب واقعہ ہوا، ایک پرندہ ہمارے سامنے تھوڑی دور موجود بڑے سے پتھر پر آ کے بیٹھ گیا۔

اس کے پریمورے بال اور آنکھوں کا رنگ عجیب سا تھا۔ وہ کچھ عاٹھے ہمیں گھورتا رہا پھر اس نے پر پھر پھڑپھڑائے اور اڑان بھر کر ہمارے گرد چکرانے لگا، وہ برابر دائرے میں چکرارہا تھا اور اس دائرے کے بیچوں بیچ ایک وحشی چمکتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی لمبی زرد چونچ اٹھا کر عجیب سی آواز نکالی اور فضا کی وسعتوں میں پرواز کر گیا۔

”یہ کیا تھا راجیل؟“ سامی کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا اس کے پوچھنے پر میں بے اختیار چونکا۔

”کچھ نہیں پرندہ تھا اور کیا؟“ میں نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی ایک عجیب سا احساس مجھے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا دائرے میں وہ وحش ابھی بھی بدستور چمکتی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگست کا وہ دن اداسی میں لیٹا تھا۔ فضاؤں میں ایک عجیب سی سوگواری کھلی تھی میرا دل اضطراب کے ٹکٹے میں جکڑا تھا۔ میں امی کو بتا کر سامی سے ملنے چلا گیا۔ نزہت چچی کو سلام کر کے میں نے سامی کے بارے میں پوچھا، پچھلے چند دن سے ہماری ملاقات نہ ہوئی تھی ”وہ چھپت پر ہے۔“ راجیل بنا! پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے ہر وقت کوٹھی کوٹھی سی رہتی ہے یکدم ڈر جاتی ہے تم پتہ کرو۔ مجھے تو کچھ بتانی نہیں۔“

میں اثبات میں سر ہلاتا نہ پتہ چڑھ گیا۔ وہ ستونوں سے ٹیک لگائے گم سم کھڑی تھی یہاں تک کہ اسے میری آمد کی بھی خبر نہ ہوئی۔ ”سامی کہاں کوٹھی ہوئی ہو؟“ میں اس کے سامنے جا کر ہاتھ لہرایا۔ وہ چونکی اور ایک لمبی سی چیخ اس کے یاقوتی لبوں سے

برآمد ہوئی۔

”تم..... تم؟“ وہ ہراساں تھی۔ ”کیا ہوا؟ تم اتنا ڈر کیوں گئیں؟“ تشویش بھرے لہجے میں، میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔ اس کے چہرے پر برائیوں کے سائے تھے گلابی کھلی رنگت مر جھانکی گئی تھی، جمیل جیسی آنکھوں میں ایک عجیب وحشت ڈر پڑا ڈال چکی تھی۔

”کیا..... کیا ہوا ہے تمہیں سامی؟“ میں نے اسے بے قراری سے پوچھنا ڈالا۔

وہ بری طرح بکھر گئی اور میرے سینے سے لگ کر بری طرح رونے لگی۔ ”راجیل۔“ میں نے اسے متاع حیات کی طرح ہاتھوں میں سمیٹ لیا بچکیوں سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ ”سامی پلیز! بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ وہ اپنی ٹھٹھوں میں میری شرٹ جکڑے بری طرح رو رہی تھی۔ ”سامی کی بچی! اب بس بھی کرو کیا جان لوگی میری؟“ اس کے آنسو میری برداشت سے باہر تھے۔

”کچھ نہیں ہوا ہے۔“ درشتی سے بولتی وہ ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہوئی ”تم چلے جاؤ یہاں سے، میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی مجھے نفرت ہے تم سے۔ سنا تم نے؟“ وہ چلائی تو میں ششدر رہ گیا۔

”یہ کیا کر رہی تھی وہ؟“ مجھ سے نفرت اور سامی؟“ میں نے بچی کے حصار میں تھا۔

”ہاں ہاں تم سے نفرت ہے مجھے۔“ وہ ہز یانی انداز میں حلق چھا کر چلا اٹھی۔

میں بے ساختہ لاکھڑایا، قدموں نے میرا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا ”لیکن..... کیوں؟“ مجھے سانس لینے میں بے حد دشواری ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ سانس حلق سے ٹکرا کر پچھلے پھوٹوں میں بھرتی جا رہی ہے۔ دل پاتال کی افتاد گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا، پیروں میں عجیب سنساہٹ ہو رہی تھی۔

”وقت پر تمہیں ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“ وہ رخ پھیرے کھڑی تھی۔

”ابھی بتاؤ سامی!“ مجھے اپنی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”راجیل! میں نے کہا نام کو معلوم ہو جائے گا ابھی تم جاؤ۔ تمہیں میری قسم پلیز!“ اس کا نام لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا اور میں کسی ہارے ہوئے جوار کی مانند پلٹ آیا۔

☆.....☆.....☆

میں جمیل کنارے بیٹھا پانی میں کنکریاں پھینک رہا تھا۔ دل بھجا بھجا سا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا جب وہ اپنی مخصوص جگہ آ کر بیٹھی تھی میں گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا اس کی زرد آنکھوں کی چمک ماند پڑی ہوئی تھی اور گالوں پہ آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔

”میں ریمز سے شادی کر رہی ہوں۔“ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔

میں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ وہ جمیل کی تہہ میں نگاہ جمائے ہوئے تھی۔ میرا دایاں ہاتھ پوری قوت سے اس کے گال پر پڑا۔

”کچھ کہو، کس سے شادی کر رہی ہو؟“ میرے دھیسے لہجے میں اڑدھس کی سی پھنکا تھی۔

”ریمز سے۔“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

”ریمز سے؟“ میں سناٹوں کی زد میں تھا۔ سر پہ آسمان رہا تھا نہ قدموں تلے زمین۔

”مجھ سے وجہ تم پوچھا۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تمہاری کوئی بھی وضاحت میرے وجود کے ریزے نہیں سمیٹ سکتی کبھی نہیں۔“ مجھے اپنی آواز بے حد اجنبی لگ رہی تھی۔ مجھے پوری دنیا تھی کہ اپنا وجود تک اجنبی لگ رہا تھا۔ ”سامی تم..... تم میرے ساتھ جو مرثی کرلو، میری جان لے لو..... مگر..... میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ خدا کے لئے ایسا مت کرو۔“ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گیا میرا دل پھٹ رہا تھا۔

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو راجیل؟“ اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔
”جی ہاں، میں نے تم سے کبھی نہیں چلا کر میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں؟“ میں نے جی سے ہنسا۔

”مجھے خوش دیکھنا چاہیے ہو؟“ میرا سر اثبات میں ہل گیا۔

”تو پھر میری خوشی اسی میں ہے۔“ وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر چلی گئی۔ ہاں وہ چلی گئی۔

شام میں کھلی گاڑھی رات کی تاریکیاں میری آنکھوں میں آئیں۔ دل کو کوئی بیروں سے رونہ رہا تھا۔ شہر رگ پہ بے پناہ دباؤ تھا جو بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کی شادی 9 ستمبر کو طے پاتی تھی۔ اواخر اگست کے دن تھے وہ، اضطراب میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا تھا۔ بے چینیوں روم روم میں سائی تھیں اور دل ہمہ وقت تڑپ کے شعلے میں جکڑا پڑا تھا۔ جوں جوں اس کی شادی کے دن قریب آرہے تھے میرے اضطراب میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ کسی اور کی ہو جائے گی، اس کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام جڑ جائے گا۔ وہ سر سے پاؤں تک کسی اور کی ملکیت ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔ چھوئے گا۔ پیار کرے گا۔“ میری جان پل پل نکل رہی تھی میں لمحہ لمحہ مر رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں محبوب کی خوشی ہی ہماری خوشی ہے وہ کسی اور کا ہوا تو کیا ہوا۔ مگر میرے لئے یہ آسان نہ تھا۔ بہت کٹھن، بے حد جان لیوا تھا۔ بھلے اس میں اس کی خوشی تھی مگر میرے لئے بے حد جان لیوا تھا، اسے کسی کے ساتھ سوچنا بھی میں پل پل کی اذیت کی سولی پر لٹک رہا تھا۔

بالآخر سات ستمبر کا دن آن پہنچا۔ اس دن اس کی مایوں کی رسم تھی۔ میں نے سرشام ہی گولیاں چھانک لیں۔ مگر نیند نہ تو ہمیشہ کے لئے محبت کے عوض گروی رکھی جا چکی تھی چند منٹ کے لئے نیند کا جھونکا آتا تو جھٹ آنکھ کھل جاتی اس کی باتیں، اس

کے وعدے، میرے بغیر نہ رہنے کے دعوے یاد آتے اور دل اذیت سے تڑپ تڑپ جاتا۔ لوگ محبت کے نام پر کسی کے جذبات سے کیوں کھیلے ہیں؟ محض اپنا وقت رنگین بنانے کے لئے، کسی کو سزا کے لئے کرب و اذیت کی بھیٹی میں جھونک دینا کہاں کا انصاف ہے؟ صرف ناغم پاس کرنے کے لئے کسی کے دل کو ہمیشہ کے لئے بھری آگ میں سلگانا کہاں کا قانون ہے؟ کتنا آسان ہوتا ہے لوگوں کے لئے کسی کے خلوص بھرے جذبات سے کھینکا پھر پل بھر میں بھول جاتے ہیں وہ..... اور ہم جیسے لوگ سدا کے لئے خود کو روک لگا لیتے ہیں۔ روگ، جو ہمیشہ دل کو جکڑے رہتا ہے، روگ میں سوگ کے سوا کچھ نہیں ملتا بھی کچھ نہیں ملتا انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے اس سے فرار ممکن نہیں کیونکہ یہ دل کو ہی نہیں، روح کو بھی کسی آکنوہیں کی مانند جکڑے رکھتا ہے اور اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔

وہ سارا دن جس کرب کے عالم میں گزرا، ناقابل بیان ہے۔ بعض دفعہ دکھ ایسا شدید ہوتا ہے کہ احاطہ الفاظ میں لانا ناممکن نہیں ہوتا۔ شام ہوتے ہی میری جان نکلنے لگتی تھی اب اس کے ہاتھ پہ اس کے نام کی مہندی لگ رہی ہوگی۔ اب لڑکیاں اسے آچھل کی چھاؤں تلے اسٹیج پہ لا رہی ہوں گی۔“ غرض لمحہ لمحہ جان لیوا تھا۔ اس اذیت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس سے گزرا ہو۔ وہی جان سکتا ہے جس نے یہ کرب جھیلا ہوا۔ میں تڑپ تڑپ کر اللہ سے دعا کر رہا تھا کہ ”یا تو میرا دل بے حس کر دے، پھر کر دے یا پھر مجھے موت دے دے۔“ لیکن دعا بھی کب قبول ہوتی ہے؟ میں تو..... میں تو پہلے ہی اللہ کی قدرت، اس کے ہر شے پر قادر ہونے، اس کی وحدانیت اس کے قوی ترین ہونے پر قوی یقین رکھتا تھا۔..... پھر..... پھر وہ مجھے کیوں آزار رہا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر سکتے گا۔

اب جو دور ہوا ہے، تو احساس ہوا ہے مجھ کو کہ وہ شخص میرے دل کے قریب کتنا تھا

جو وہ کہتا تھا وہی کس اُبھرتا تھا اس میں میرے دل کا آئینہ بھی عجیب کتنا تھا اس کی آنکھوں میں دھنک رنگ خواب تھے جس کے وہ شخص بھی لوگو! خوش نصیب کتنا تھا شب بھر کئی اپنی تو تارے گنتے اس کے پہلو میں خوش، رقیب کتنا تھا! جب وہ غم کی ملکیت ہوا، دل پہ اترا یا تھا سکوت مرگ روح میں جو پھیلا تھا، سناٹا سمیٹ کتنا تھا ہر دعا فلک سے بے نیل و مرام لوٹ آتی تھی دعا نصیب بھی اپنا اس شب بد نصیب کتنا تھا؟

9 ستمبر کا وہ قاتل دن آن پہنچا..... حالانکہ میں نے کتنی دعاں مانگی تھیں اس دن کے کل جانے کی، نہ آنے کی مگر..... مگر پھر بھی وہ قاتل دن اپنی تمام تر سفاکیوں سمیت آن پہنچا۔ میں نے سلیپنگ پلو کی پوری شیشی تھیلی پر الٹ لی، گولیاں نکل کر میں نے گاں کے سامنے دیوار پہ دے مارا۔ ایک جھٹکا ہوا اور کرچیاں اپنے ریزہ ریزہ وجود پر ماتم کناں فرش پر پکھر گئیں، مجھے ان میں آپ نظر آیا۔ میں بھی یونہی ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ ”اے اللہ! تو آج کل میری ہر دعا و ذکر رہا ہے کم از کم مجھے آج موت ہی دے دے۔ اس کے بعد کا عذاب قابل قبول ہے۔ بے شک مجھے جہنم کا ایندھن بنا دینا۔“ یہ میری بے بسی و بے کسی کی انتہا تھی۔ لاشعور میں اب بھی جتنی سنوری سائی تھی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا.....

چھوڑ گیا ہے کل شام وہ شخص مجھے میرے دل کو اذیتوں کے حوالے کر کے ہم تو اس سے کوئی شکوہ بھی نہیں کر سکتے دعا تازیت تاریکیاں سوپ دیں جس نے، چند لمحے اچالے کر کے بے ہوشی اور خود فراموشی کا وہ عالم نہانے کب تک طاری رہا۔ پہلا احساس درد تھا سر پہ گویا کسی نے پہاڑ رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے اپنے پو بھل پوئے بشکل وا کئے اور خالی خالی نظروں سے چھت کو دیکھنے لگا

بعد میں پتہ چلا کہ وہ اسپتال کی چھت تھی۔ موت نے بھی مجھے ٹھکرا دیا تھا خدا نے مجھے موت بھی نہیں دی تھی تقدیر لیوں پہ فاحشا نہ سکر اہٹ سچائے مجھے ہرا کر میری بے بسی پر مسکرا رہی تھی۔ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ میرا دل بے اختیار چاہا کہ اس کے لیوں پر کھیتی مسکراہٹ نوج لوں، ٹھیک اسی طرح جس طرح اس نے میرے لیوں کی مسکراہٹ چھٹی تھی۔ مگر میں ”بے بس“ تھا اور یہ ”بے بسی“ کس قدر بے بس، بے اختیار اور لاچار لفظ ہے، کاش! میں لفظوں میں بیان کر سکتا.....

اس دن میں نے خود سے ایک عہد کیا۔ ”خدا سے کبھی کچھ نہ مانگنے کا عہد..... قسمت کو ہرانے کا عہد.....“ خدا نے میری کوئی دعا قبول نہیں کی تھی۔ مجھے بے سہارا چھوڑ دیا تھا اور مجھے بھی اب اس سے کچھ نہیں مانگنا تھا اور قسمت جس نے میری سب سے بڑی خوشی، میری محبت چھین لی تھی تو اب مجھے قسمت کو ہرا کر اپنی محبت حاصل کرنی تھی۔ کبھی ہار نہیں مانی تھی اہاں اگر موت آجائے تو الگ بات ہے۔

مگر میں بھول گیا تھا کہ میں تو کیا، کوئی بھی خدا کے سہارے کے بغیر کچھ بھی نہیں..... کچھ بھی نہیں..... خاک کا اک ذرہ بھی نہیں..... اور تقدیر سے لڑنا ممکن ہی نہیں کیونکہ تقدیر کوئی انسان یا کوئی مخلوق نہیں ہے کہ بندہ اس کا گریبان تھام کر لڑنا شروع کر دے یہ تو ایک نادیہ چیز ہے مگر اس کے ہونے کا احساس قوی تر ہے۔ بہر حال میں نے خود سے عہد کیا اور پھر..... اور پھر.....

☆.....☆.....☆

میں اس دن اہی کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک گیا کیونکہ انہیں السر کی شکایت تھی وہ چیک اپ کے لئے گئے تو میں نے وقت گزاری کے لئے اخبار اٹھا لیا ایک اشتہار پر میری پھسلتی نظر جرم کر رہی گئی ”محبوب آپ کے قدموں میں“ کسی عامل کا اشتہار تھا۔ ساتھ ہی اس کی تعریف میں قلابے ملائے گئے تھے۔ ”رام پال دریا“ میں نے زیر لب نام دہراتے ہوئے پتہ لوٹ کر لیا۔

اگلے ہی روز میں وہاں تھا۔ اگرچہ فلیٹ تو عام سا ہی تھا مگر ماحول کو عجیب سی وحشت نے لپیٹ میں لے رکھا تھا اس کے کمرے میں الو، ہد ہد اور جنگلی کبوتروں کے پتھرے لٹکے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر ایک بڑی سی مورنی موجود تھی ایک لٹکلے کو تو میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ مگر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں کون سا ان پرائمان لے آیا ہوں۔ میں تو صرف اپنے کام سے آیا ہوں۔ اس کے ساتھ پر تلک لگا تھا۔ اس نے میرا مسئلہ بغور سنا اور اگلے روز آنے کو کہا۔

”نن..... ہمیں سائی! تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔“ میں عالم دیوانگی میں تھا۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

مجھے یوں لگا ملک الموت نے اس کی نہیں، میری روح قبض کر لی ہو۔ اس کی سر و اور زندگی سے عاری کلائی تھامے میں سناٹے نہیں تھا۔ سوچتے سمجھتے کی صلاحیتیں صلب ہو کر رہ گئی تھیں، میں نے بے جان ہاتھوں سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ مجھے قسمت ایک بار پھر ہر ایک کی بھی اور یہ بار یہ شکست برداشت کرنے والی نہیں تھی ہرگز نہیں تھی۔

اگلے روز جب گیا تو اس نے بتایا کہ ”رہیڑ نے اسے شادی کے لئے مجبور کیا تھا اس نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے انکار کیا تو وہ نہ صرف اسے اس کے والدین بلکہ تمہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔“
 رام گوپال کی بات نے مجھے حیران نہیں کیا، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ کس طرح اسے مجبور کیا گیا ہوگا۔

تین روز بعد میں سارہ کے گھر گیا۔ ڈاکٹر اور حارث بھائی بابا کے ساتھ یورپ ٹرپ پہ گئے ہوئے تھے۔ ریمیزیر اور پارکا کزن تھا۔ میں اس کے گھر گیا تو ملازمہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر چلی گئی قریباً بیس منٹ بعد مجھے ایک نوائی چیخ سنائی دی۔ میرا دل یکدم سڑکا کر رہ گیا۔ چیخ بلاشبہ سائی حی تھی۔ اس کی آواز تو میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ میں تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر لپکا، بیڈ روم کی دہلیز پر ایک ٹاشیے کو میرے قدم زمین میں کڑ گئے۔

رات اپنی تمام تر تارکیوں سمیت چار سو پچیس
چکی تھی، آسان کے تاریک سینے پہ اکا دکا ستاروں کی
جھللاہٹ تھی چہار اطراف سناٹا کسی فرض شناس
پوکیدار کی مانند جو کس کھڑا تھا۔ خاموش آنکھیں
بھاڑے وحشت ادھر ادھر پکراتی پھرتی تھی.....
قبرستان میں موت کا ازلی سکوت چھایا تھا۔ اکا دکا
بیری اور برگد کے درخت کسی عفریت کی مانند
بازو پھیلائے کھڑے تھے۔ موت قبروں کی صورت
میں جا بجا بکھری پڑی تھی۔ موت، جو ہر ایک کو نگھ لیتی
ہے۔ موت، جو ہمہ وقت کسی عقاب کی مانند مسلط
اپنے غوغو ار پتوں میں جکڑنے کو بے تاب ہے۔ موت
جس سے کسی کو انکار نہیں لیکن موت کی کوئی ایک شکل
نہیں ہوتی..... کبھی ہے پل پل اذیت دے دے
کرماتی رہتی ہے اور کبھی ایک ہی بار سانس چھین
لیتی ہے، ہر بار یہ مختلف روپ میں سامنے آتی ہے
اور اس کا ہر روپ پہلے سے زیادہ کہناک، اذیت
ناک اور وحشت ناک ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح جس
طرح زندگی پل بھر میں روپ بدل لیتی ہے۔ زندگی
جو موت سے بھی سخت ترین شے ہے، زندگی، جو پل
پل بارتی رہتی ہے لہ لہہ جان نکالتی رہتی ہے۔

تاثر..... تاحد نگاہ موت کا تاثر.....“

”راہیل!“ رام گوپال کی پاٹ دار آواز اس وقت دہی تھی۔ میں نے اسے دیکھنے پہ اکتفا کیا۔ ”یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“

”اگر تم چاہو، تو سہا اب بھی ہمیں مل سکتی ہے۔“ اس کی بات پہ میں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔
 ”اب؟“ میرا الجھ سناٹ تھا۔ اس نے سر اٹھات
 میں ہلایا۔ ”مرے ہوئے لوگ واپس نہیں آتے۔“
 میں نے سر جھٹکا۔

میں ساسی کی قبر کے پاس موجود تھا میں نے آنکھوں میں درا آئی نمی پھیلی کی پشت سے صاف کی اور پیلے وغیرہ سنہال لیا۔ میری پچھٹی حس، میرا وجدان منسلک کوئی نکتہ دے رہا تھا میرے اندر کوئی مجھے چیخ چیخ کر منع کر رہا تھا، یہ سب کرنے سے روک رہا تھا۔

میں نے کدال اٹھائی۔ میں نے کدال فضا میں بلند کی تھی کہ چاروں جانب سے آسانی بھلیاں فضاؤں کا سینہ چرتیں میری جانب پکیں مگر۔۔۔۔۔ کسی انجانے خوف کے زیر اثر واپس انہی بلند یوں میں پرواز کر گئیں جدر سے ظاہر ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ پوری زمین لرز اٹھی۔

کدال سیدھا قبر پر پڑا۔ نرم مٹی ادھر ادھر بکھر گئی۔ دوسری ضرب پر ہوا مزید تیز ہو گئی اور وحشتانہ انداز میں چٹکھانے لگی۔ میں بدستور کام میں لگا رہا۔۔۔۔۔ بھلیاں وہ رہ کر کڑک رہی تھیں، مجھے منع کر رہی تھیں مگر میں موسم اور ماحول کی غضب ناک یوں سے بے نیاز کدائی میں مگن تھا۔ بادل اپنی پربہیت اور پر جلال آواز میں غالباً وارننگ دے رہے تھے مگر مجھ پر کسی چیز کا اثر نہ تھا اور مجھ پر اب کسی چیز کا اثر ہونے والا بھی نہیں تھا۔ وارننگ دینے کے بعد بادلوں نے شاید حملے کی سوچ تھی جو بھلی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔۔۔۔۔ ساری مٹی ہٹانے کے بعد میں بچوں کے بل بیٹھ گیا، ہوائیں مسلسل چٹکھا کرتے ہوئے چپ پھیریاں کھائی پھر رہی تھیں میری اور برگد کے درخت ادھر ادھر ڈولتے ہوئے اپنی سلامتی کے خواہاں تھے، بادل گرے گزرا ہٹ کے دیوانے فضا کلر زادی، میں نے تابوت کا ڈھکن ہٹایا تو بجلی گویا کرٹ کھا کر تڑپی۔

سامی کا چاند چہرہ سفید کفن کے ہالے میں دمک رہا تھا۔ میں جھک کر ہاتھ بڑھائے۔ بادلوں کی گزرا ہٹ میں مزید شدت آگئی، ہوائیں بے بسی سے وحشتانہ انداز میں ادھر ادھر سر پٹختے لگیں، بجلی کرب و اذیت سے مل کھا کر تڑپنے لگی، میں نے سامی کو متاع حیات کی طرح ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ اسے احتیاط سے زمین پر لٹا کر میں جیسے تیسے قبر کو بند کر کے بھر بھری مٹی اس پر ڈھیر کی اور ہاتھ جھاڑے۔ ہوا کی سرسراہٹوں سے اس کا کفن پھڑ پھڑا رہا تھا جب تک میں اسے ہاتھوں میں بھرے قبرستان کے گیٹ تک پہنچا، بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا، چٹکھاؤ تھی ہوائیں دم سادھ چکی تھیں اور ماحول

پر سکوت مرگ طاری تھا۔۔۔۔۔ ازلی سکوت مرگ۔۔۔۔۔ دل جنگل، دل صحرا، دل کوکو۔۔۔۔۔ بادل جنگل۔۔۔۔۔ دل صحرا اڑتی پھرتی ریت کا دریا۔۔۔۔۔ سرد ہوا کا شور کہیں کہیں کوئی دیپ سلگتا۔۔۔۔۔ گھور اندھیرا گھور۔۔۔۔۔ کبھی کبھی کوئی بادل سلگا، صوب رتوں کا زور ڈالی ڈالی پھٹی پھٹکیں۔۔۔۔۔ بجلی ہو گئی ڈور

دل پاگل، دل ضدی بچہ۔۔۔۔۔ دل چور دل جنگل دل صحرا کوکو۔۔۔۔۔ دل جنگل دل صحرا۔۔۔۔۔

تا حد نظر ریت کا غبار۔۔۔۔۔ غبار اگر یقین نہیں تو کسی "اسیر موسم بھراں" سے پوچھ لیں بلکہ صرف ایک نظر دیکھ لیں پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی موسم بھری دشت کیا ہے؟ یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے یہ کرب روح پر بھیا ہو۔ "سانوں ایک بل جھن نہ آوے۔۔۔۔۔ میرا سیل گنگنایا، فون رام کو پال کا تھا۔ میں رات ہی میں سامی کا بے جان وجود اس کے حوالے کر آیا تھا۔ "ہاں رانیل۔۔۔۔۔ ایسا کر آج ہی سے کام شروع کر دے۔" اس نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے چنداں مردے اس کو لا کر دینے ہو گئے۔ میں نے اثبات میں جواب دے کر سیل آف کر دیا۔

سنسنی کی ایک زبردست سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ ہوا ساکن تھی۔ فضا پر دم گھوٹی سی کیفیت مسلط تھی قبرستان میں قدم دھرتے ہی ایک عجیب ناقابل فہم احساس نے میرے گرد و حصار گھٹایا، قبر میں دن میں ہی منتخب کر گیا تھا وہاں پہنچ کر ابھی میں نے کدال رکھی ہی تھی کہ فضا میں سمور کن سی خوشبو پھیل گئی، عقب میں ایک زبردست سرسراہٹ نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا اور پلٹتے ہی میں سناٹے میں رہ گیا۔

وہ سامی تھی!! ہاں بلاشبہ وہ سامی ہی تھی۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور اس کے دراز بال پشت پر لہرا رہے تھے "تت۔۔۔۔۔ تم؟" میرے لبوں

میں سرگوشی سرسرائی۔ "رانیل! یہ تم کس راہ پر چل نکلے ہو؟" اس کی آواز گویا میلوں کے فاصلے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا سامی۔" اعتراف کرتے، میں اندر تک ٹوٹا تھا۔ "یہ راستہ شرک کا ہے۔" "سامی نہیں رہ سکتا میں تمہارے بغیر۔۔۔۔۔ یہ شرک نہیں۔" بولتے بولتے میرا لہجہ برف ہو گیا۔ "مگر رانیل۔۔۔۔۔"

"کچھ مت کہنا سامی! خدا کے لئے کچھ مت کہنا۔" اس کے آگے ہاتھ جوڑتا میں بری طرح کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ملال و غمی کے آثار ابھرے اور وہ ایک دم غائب ہو گئی۔ میں ساکت کھڑا رہا۔۔۔۔۔ قبرستان خاموشی کے آنچل میں لپٹا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور قبر کو نہ لگا، قبر کھلتے ہی شدید ترین ناگوار بو کا ایک ہیمکا باہر آیا اور مجھے بے اختیار ابکائیاں لینے پر مجبور کر گیا، اس کے ساتھ مجھے کھانسی کا دورہ پڑ گیا، میں بے ساختہ کئی قدم پیچھے ہٹ گیا، خجالت اعتدال پہ آئی تو میں پھر قبر کے قریب گیا۔

مردہ نکالنا بہت دل گردے کا کام تھا۔ تاہم سامی کے تصور نے یہ کام کر دیا۔ قبرستان سے کچھ فاصلے پر رام گوپال کا ایک آدی گاڑی لئے انتظار کر رہا تھا میں نے مردہ اس کے حوالے کیا اور گھر کی راہ لی۔۔۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ اب میں تقدیر کو ہرا دوں گا۔۔۔۔۔ میں ہڈیاں انداز میں ہنسا۔ اور اسی بلبل شاید تقدیر میری بے خبری اور حد درجہ خوش چینی پر ہلکی سی۔

☆۔۔۔۔☆۔۔۔☆

میں ایک طویل صحرائیں بھاگ رہا تھا، آسمان پہ سورج آگ کی مانند دھک رہا تھا اور قدموں کے نیچے زمین۔۔۔۔۔ اوہ زمین نہیں بلکہ۔۔۔۔۔ ریت۔۔۔۔۔ ایسی ریت جو کسانگروں کی مانند دھک رہی تھی۔ میرے جسم کے دم

روم سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا، گرمی میں بے پناہ شدت اور میں مسلسل بے تحاشہ بھاگ رہا تھا میری سانس دھوکنی کی مانند چل رہی تھی سینہ یوں پھول چک رہا تھا گویا ابھی ایک زورور دھماکے سے پھٹ کر ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ بلا خرمیری ہمت جواب دے گئی میں سلگتی ریت پر منہ کے بل گرا، تقدیر جب گرانے کے ورے ہو تو کرنے کے لئے کسی شوکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں وہیں گر کر بری طرح ہاپٹنے لگا۔

مجھے شدت سے پیاس کا احساس ہوا۔ حلق میں صحرائی کا نئے پھنے معلوم ہوتے تھے، میں نے چار سو نظر دوڑائی۔ پانی کا اک قطرہ بھی نہ تھا۔ میں نے بادلوں کی تلاش میں آسمان کو کھوجا۔۔۔۔۔ بادلوں سے عاری آسمان اور جلتے سورج نے بیک وقت تہقہہ لگایا، ہر چیز بے حدایتی لگ رہی تھی اور شدید ترین تنہائی کا حساس رگ و پے میں جھکے لے لے کر گردش کر رہا تھا، مجھے یک یک تنہائی سے شدید ترین دشت ہوئی، شدید ترین اضطراب تھا جو بلوں میں کھلے لگا۔ میں آنکھیں بند کئے ساکت پڑ رہا۔ نجانے کیا ہونے والا تھا آنے والے لمحات اپنے جلو میں کیا لے کر آنے والے تھے؟ میں یکسر بے خبر تھا کسی شے کی موجودگی کے زیرِ تخت میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سینے میں سانس انگ گئی۔۔۔۔۔ دل ایک دم سکڑ گیا۔۔۔۔۔

وہ گوشت کا ایک طویل تر لٹھڑا تھا جو سانپ کی طرح رینگتے ہوئے میری جانب آرہا تھا میں آنکھیں پھاڑے حیرت و دشت کی زیادتی سے اس عجیب لٹھڑے کو دیکھ رہا تھا، عجیب گلچاسا، خون میں تر۔۔۔۔۔ جیسے کسی غصے و زنی پتھر سے اسے بری طرح چل دیا گیا ہو۔۔۔۔۔ اس کے اندر سے سرخ سرخ خون ابلا پڑ رہا تھا اور خون کے ساتھ گوشت کے باریک باریک ریزے بہتے چلے جا رہے تھے جو ریت پر پھیل رہے تھے وہ عجیب اخلقت چیز میری سانس اٹکائے دے رہی تھی، ایسا کر یہ اور فوج صورت منظر اس سے قبل میری بصارتوں سے گزرنا نہ تھا۔ میرے اعصاب شل ہوئے

جاتے تھے، میرا وجود سناٹوں کی زد میں تھا میرے قریب پہنچنے تک اس کا چند آنچ حصہ ہی بچا تھا اور پھر..... میری بصارتوں نے ایک اور حیرت ناک منظر دیکھا۔

ریت پہ، ریت کے ذروں کی مانند بھرے وہ ریزے تیزی سے سرکتے ایک جگہ تیزی سے جمع ہوئے اور پھر سے اسی لوتھڑے کی شکل اختیار کر لی۔

”اے اللہ! اب تو میری سزا ختم کر دے۔ اب میں تیرے سوا کسی سے مدد نہیں مانگوں گا۔ کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ تیرے سوا کوئی بھی قادر نہیں ہے۔ تو مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دے، میں کبھی تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔“ لوتھڑے سے ابھرتی انسانی آواز سن کر مجھے چار سو چالیس والٹ کا کرنٹ لگا۔

”کیا کوئی انسان ہے؟“ یہ قیامت خیز خیال میرے جسم کا سارا خون خشک کر گیا۔ خوف و ہشت کا سیاہ عفریت دل و دماغ پہ بچنے گاڑے خاموش..... اعصاب پہ مسلط تھا۔

”تاہم کتنی ذہیل دی تھی کہ شاید..... شاید تو سمجھ جائے مگر تجھے تو اللہ کا عذاب جھوٹ لگتا تھا۔ اب وقت گزر گیا۔ اور اللہ اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دے گا۔“ اس آواز میں بادلوں کی سی گڑ گڑاہٹ تھی۔

وہ کئی تھے..... انتہائی طویل قامت اور حد درجہ دہشت ناک..... ان سب کی رنگت سیاہ ترین تھی، چلنے اور چہرے ہیئت ناک..... ان سب کے ہاتھوں میں گرز نما چیزیں تھیں اور وہ اس لوتھڑے کو..... نہیں وہ ایک نہیں تھا ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی اور وہ سب ریت پر کھلا رہے تھے اور وہ لوگ ان پر گرز برسارے تھے۔ لوتھڑوں سے طویل کر بناک دلخراش چیخیں ابھر رہی تھیں، گرز کے شدید ترین ضرب سے لوتھڑے ہزاروں ٹکڑوں میں تبدیل ہو جاتے اور دھڑکی لڑا دھڑکی لوتھڑوں سے ابھرتی دیوانگی آمیز اذیت ناک چیخوں سے فضا دہل دہل جاتی۔ ان کے منہ سے ریزے آنے والے تھے اور اگلے ہی لمحے گرز کی

شدید ترین کرب ناک ضرب پھر سے انہیں ریزہ ریزہ کر دیتی، ایک ناقابل بیان وحشت نے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

میرے جسم کے زندان میں مقید میری اپنی روح پھڑپھڑانے لگی اور اس پھڑپھڑاہٹ نے میرے ذہن سے ہر نقش کو کھرچ ڈالا، وہ خطر اس قدر وحشت ناک تھا کہ الفاظ کی گرفت میں ہی نہیں آ سکتا.....

”اور اللہ اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دیتا ہے۔“ گڑ گڑاہٹ نما گرجتی آواز فضا میں پکڑنے لگی، ہوا کو یکا یک دورہ پڑ گیا اور وہ بیٹیاں بجاتی عالم وحشت میں ادھر ادھر سر پہنچنے لگی۔

ریت اڑاڑ کر مجھ پہ برسنے لگی، بھری ہوا وحشتانہ انداز میں ریت کی جھولیاں بھر بھر کر ادھر ادھر اڑیل رہی تھی۔ اس کی سیٹی نما ”شائیں شائیں“ ساعتوں پہ ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھی۔ طوفان نے آنکھوں کے سامنے ریت کی چادر سی تان دی تھی۔ ریت میرے بالوں میں، آنکھوں میں، منہ میں چھپنے لگی، تاہم ریت کی مہیب دھند کے پار کا منظر صریحاً واضح تھا دہشت ناک، ہیئت انگیز لوگوں کی دیوانہ وار ضربیں..... لوتھڑوں کی چیخیں..... ان کا چل بھر میں ریزہ ریزہ ہونا پھر آنے والے میں یکسا ہونا..... از سر نو وہی کر بناک ضربیں..... وہی دیوانگی بھری اذیت ناک ہڈیانی چیخیں..... ان کا ریت کی مانند بکھڑنا..... یکسا ہونا..... شدید ترین ضرب..... دیوانگی آمیز چیخوں کا شلسل.....

اور اللہ اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دے گا۔“ گرجتی آوازیں..... میں بری طرح کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھا..... میں بری طرح ہانپ رہا تھا، دل حلق میں آن پہنسا تھا اور شررگ پھڑک رہی تھی، ذہن میں جھگڑا چل رہے تھے اور رگوں میں دوڑتا خون جھکے لے لے کر گردش کر رہا تھا۔

”تو یہ..... خواب تھا؟“

ان گرز برداروں کی ہیئت ناک صورتیں میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی وحشت ناک ضربیں..... زمین کی لڑش، لوتھڑوں کی چیخیں اور ”اف اللہ“ میں تھرا اٹھا۔ میرا پورا وجود پسینے میں تر تھا۔ میں نے اپنے غم بالوں میں ہاتھ بھیرا..... میری حیرت سے بچھی آنکھیں اپنے ہاتھ پہ جچی ریت پہ بھی تھیں میں نے کائرانہ نگاہ کرے میں دورائی دروازہ لاک تھا کھڑکی بھی بند تھی پھر یہ ریت..... زبردیا و ریلب کی مدھم روشنی میں ریت کے ذریعے چمک رہے تھے میرا ہاتھ میکانیکی انداز میں چہرے اور گردن پر پھسلنے لگا میرے ذہن میں آنکھیاں چل رہی تھیں میرا پورا وجود ریت سے اٹا تھا..... وحشتانہ ہوا مجھے بیٹیاں بجاتی کرے کے در و دیوار سے سرگرمائی محسوس ہو رہی تھی۔ گرزوں کی دھمک سے در و دیوار لرزتے محسوس ہو رہی تھی، میری ساعتوں پہ بار بار یہ جملہ دستک دے رہا تھا ”اور اللہ اپنے نافرمانوں کو اس سے بھی بھیا تک اور دردناک عذاب دیتا ہے۔“

”میری آنکھیں تو اس ایک منظر کو دیکھ رہی تھیں گوشت کا لچلی سا خون میں تر لوتھڑا دیوانہ وار شدید ترین ضرب..... لوتھڑے کے اڑتے ریزے، ہڈیانی چیخیں..... ریزوں کا یکسا ہونا..... اڑتی ریت..... گرز کی ضرب..... اڑتے ریزے.....“ میرے اللہ!

میرے شعور اور لاشعور میں یہی پکار تھی میں رو رہا تھا۔ میں بچوں کی طرح جھوٹ جھوٹ کر رو رہا تھا، دل سینے میں بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا، روح کسمپرسی تھی..... بری طرح.....

”اللہ اپنے بندوں سے بے حد محبت کرتا ہے، بے حد مہربان ہے وہ..... اور انسان بے حد ظریف..... اللہ نے ہمیں بے بہا نعمتوں سے نوازا رکھا ہے۔ اگر ہم اس کی عطا کردہ ایک ہی نعمت کا شکر دن رات ہمہ وقت کرتے رہیں، تب بھی نہ کر پائیں گے اور جس قدر گناہگار ہم ہیں، اس حساب سے تو ہم ایک نوالہ کا بھی حقدار نہیں۔ ایک گھونٹ پانی

بھی نہیں لاسکتے۔ ایک سانس تک لینے کے قابل نہیں..... مگر اس نے پھر بھی..... پھر بھی ہمیں کس قدر نعمتوں سے نوازا رکھا ہے..... ہمیں زندگی دے رکھی ہے کہ ہم صحیح طریقے سے گزاریں تاکہ وہ ہمیں دائمی حیات میں جنت عطا فرمائے..... مگر ہم لوگ قدر نہیں کرتے اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتا ہمیں یاد نہیں رہتا اور ایک ذرا سی تکلیف پہ ہم اس سے شکوے کرنے لگتے ہیں، کس قدر ناشکرے ہیں ہم.....

جب ہماری کوئی دعا، کوئی خواہش پوری نہ ہو تو ہم اس سے ناراض ہو جاتے ہیں وہ ”خالق“ ہے ہمارا..... وہ بہتر جانتا ہے، اسے ہم سے زیادہ معلوم ہے کہ ہمارے حق میں کیا بہتر ہے اور کیا بدتر..... اللہ ہماری ہر دعا قبول کرتا ہے کبھی فوراً کبھی دیر سے..... کبھی وہ دعا آخرت کیلئے ذخیرہ کر لی جاتی ہے..... آخرت..... یعنی روز محشر..... روز محشر..... ”یعنی یوم حساب“ وہ ”آخرت“ جسے ہم ”دنیا“ کے حصول میں بھولے ہوئے ہیں وہ روز محشر، جسے ہم وقتی لذتوں میں فراموش کئے ہوئے ہیں..... وہی یوم حساب..... جو ہمارے قلب و ذہن سے غائب ہو چکا ہے.....

آخر ہم صرف قبر کی تاریکیوں کو ہی یاد رکھ لیں..... اس تنہائی کی وحشت کو..... ان بھوکے کپڑے کوڑوں کو..... تو ہم کبھی گناہ کے قریب بھی نہ پہنچیں.....

اللہ سب سے بہترین ”منصف“ ہے اور ہمیں لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔ بے شک! سب جہانوں کا وہی مالک ہے..... وہی خالق اور وہی رازق ہے..... وہی اور صرف وہی ہر چیز پر ”قادر“ ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو ہم سانس بھی نہیں لے سکتے.....

میں راحیل خان..... بہت برا انسان ہوں میں..... سارہ اگر مجھے نل کی تو اس میں اللہ کی کوئی مصلحت تھی..... یقیناً تھی..... مگر میں نہیں سمجھا تھا بجائے اس کے، کہ اللہ سے صبر اور مدد مانگنا، میں رام گوپال سے مدد مانگ بیٹھا..... حالانکہ جوئے ”اللہ نے نہیں دی وہ

کوئی اور کیسے دے سکتا ہے؟ یہ تو..... یہ تو ”شرک“ ہے
 ”یعنی مجھے اللہ نے ساری باتیں دی تو میں نے رام کو پال
 سے..... ہاں! کسی سے اپنے لئے دعا کروانا الگ بات
 ہے..... کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کے غلوں کے سبب
 ہماری آزمائش ختم کر دے..... اللہ کا فرمان ہے..... ”تم
 اپنے بھائی کے لئے عاتقانہ دعا کرو تو وہ ضرور قبول
 ہوگی“..... الفاظ اور ہوں گے، مفہوم یہی ہے..... اور خود
 ہماری دعا بھی تو رائیگاں نہیں جاتی..... اور جو میں نے کیا
 ، وہ تو سراسر شرک..... شرک ہی تھا..... میں نے کہا تھا کہ
 میں ”اللہ“ سے کچھ نہیں مانگو گا۔ اس کے برعکس میں نے
 رام کو پال سے مدد مانگی..... تو..... تو کیا اللہ مجھے توبہ
 کے بعد بھی معاف نہیں کرے گا.....؟“

سورج مغرب کی جانب جھک چلا تھا۔ جاتی رہ
 پہر نے منہ پر چپ کی انگلی رکھی تھی جس کی بابت اتنی تھی
 کہ چوں تک نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ چاروں اور
 پر ہول سناٹا طاری تھا۔ تاحد نظر پھیل میدان تھا بجز زمین
 کے سینے پر پڑی دراڑیں اس کی نقشی کی گواہ تھیں اکا دکا
 درخت سوگوار سی سے سر جھکائے کھڑے تھے سورج عین
 سر پہ انگارے برسا رہا تھا..... کل رام کو پال وراما ایک
 چلے میں مارا گیا تھا اس کے ایک ملازم نے بتایا کہ چلہ
 کرتے وقت کنڈل ٹوٹ گیا اور..... اور بھلا موت کو کوئی
 کنڈل روک سکا ہے بھی؟

سارہ کی لاش میں نے رات کی گھٹا ٹوپ
 تاریکی میں اس کی آخری آرام گاہ میں پہنچا دیا تھا
 جو گناہ میں کر چکا ہوں ان کا کفارہ تو شاید کسی صورت
 ممکن نہیں..... میں چلا تھا قسمت سے لڑنے.....
 ہاں!..... بھلا آج تک کوئی لڑ سکا ہے قسمت سے؟
 انسان قسمت کے حصار میں قید ایک بے بس پیچھی ہے
 اس حصار میں پھڑ پھڑ تو سکتا ہے مگر آزاد نہیں
 ہو سکتا..... سرخ شیخ کرلو بہانہ تو ہو سکتا ہے مگر اس
 حصار کو تو نہیں سکتا..... انسان جو خود پہ، فانی چیزوں
 پر غرور کرتا ہے کیا خبر کہ یہ چیزیں کب تک پاس ہیں؟
 کب تقدیر کر وٹ بدلے اور سب کچھ بدل جائے، ہم

جس کی غربت و افلاس کا مذاق اڑا رہے ہیں کیا خبر کہ
 کل وہ بادشاہ ہو اور ہم اس سے بھی بدتر حال
 میں..... مقدر میں بس ایک ہی خرابی ہے کہ یہ ہمارا
 ہو کر ہی ”ہمارا“ نہیں ہوتا، ہم لاکھ کوشش
 کر لیں، اسے مٹھی میں بند نہیں کر سکتے..... اسے
 بیوقوفی سے روک نہیں سکتے۔

اور میں چلا تھا اسے موڑنے.....
 ہاں دعا میں بلاشبہ اتنی طاقت ہوتی ہے کہ یہ
 طوفان کا رخ موڑ سکتی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”ادعونی
 استجب لکم“ یعنی تم دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول
 کر دوں گا۔“

کیا اللہ کا وعدہ جھوٹا ہو سکتا ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں
 اور میں شیطان کے بہکاوے میں آ کر غلط راہ پر چل
 نکلا، اللہ اس قدر مہربان ہے۔ اس نے مجھے ہر نعمت سے
 نوازا..... اور سارہ کے ذریعے غالباً میرا امتحان لیتا چاہا۔
 اللہ بے شک اپنے خاص بندوں کو ہی آزمائش
 میں ڈالتا ہے۔ اور میں اس امتحان میں بری طرح.....
 بری طرح فیل ہو گیا۔ اللہ نے مصیبت کے
 وقت ”صبر“ کی تلقین دی ہے، صبر وہی ہے جو شروع
 مصیبت میں کیا جائے۔ ورنہ روپیٹ کر، چیخ چلا کر
 تو ہر کوئی چپ ہو جاتا ہے۔ صبر ”کرنے“ اور صبر
 ”آجانے“ میں فرق ہوتا ہے ”صبر کرنا“ کوئی کوئی
 ہے۔ ”صبر آ“ سب کو جانتا ہے۔ میں نے بھی صبر نہیں
 کیا بلکہ اللہ کی ناشکری کی..... اللہ سے گلے شکوے
 کئے..... اللہ کی نافرمانی کی..... اور پھر.....

اللہ نے مجھے بچا لیا مجھے زندگی دی۔ میں نے
 ”جہنم“ مانگا..... وہ جہنم جس سے ہر کوئی پناہ مانگا ہے
 مگر اس نے پھر بھی مجھے بچا لیا..... میں پھر بھی اس کی خاص
 اور بے لوث محبت کو نہیں سمجھا۔ گناہوں کی دلدل میں
 دھنسا چلا گیا۔ مرے ہوئے لوگوں کو بے آرام کیا.....
 ان کی بے حسرتی کی..... اس نے پھر بھی مجھے ڈھیل دی۔
 اگر میں صبر کرتا تو ممکن ہے ”وہ“ سارہ کی شکل میں کوئی
 اور دے دیتا۔

حدیث قدسی ہے..... ”اے ابن آدم!“
 ایک میری چاہت ہے، اور ایک تیری چاہتا ہے
 ہوگا تو وہی، جو میری چاہت ہے۔
 پس..... اگر تو نے سپرد کر دیا اپنے آپ کو اس
 کے، جو میری چاہت ہے۔

تو وہ بھی میں تجھے دوں گا، جو تیری چاہت ہے
 اگر تو نے مخالفت کی اس کی، جو میری چاہت
 ہے۔

تو میں تھکا دوں گا تجھ کو اس میں، جو تیری
 چاہت ہے۔
 پھر..... ہوگا وہی، جو میری چاہت ہے۔

اور اللہ کی چاہت کیا ہے؟ خود ہماری ہی بھلائی
 اس کی چاہت ہے، اس کی اطاعت و بندگی میں اس کا
 نہیں، خود ہمارا فائدہ ہے۔ ورنہ کیا اس کی عبادت کرنے
 والوں کی کمی ہے؟ ایک ہمارے سجدہ نہ کرنے سے اسے
 کیا فرق پڑتا ہے۔

اللہ ہمارا بھلا چاہتا ہے اس کی چاہت ہے کہ
 ہم اس کے اور اس کے محبوب حضرت محمد ﷺ کے
 بتائے گئے سیدھے راستے پر چلیں۔ حضرت محمد ﷺ
 جو رحمت اللعالمین ہیں..... صرف دنیا میں ہی نہیں،
 آخرت میں بھی رحمت ہیں۔ اپنی گناہگار امت کے
 لئے شفاعت ہیں۔

”پڑگئی جس پہ محشر میں، بخشا گیا
 دیکھا جس سمت، ابر کرم چھا گیا
 رخ چدر ہو گیا..... زندگی پا گیا
 جس طرف اٹھ گئی، دم میں دم آ گیا
 اس نگاہ عنایت پہ لاکھوں سلام
 مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام“

عقب میں ابھرنے والی غراہٹ نے مجھے
 چونکا یا، اچانک مجھے اپنی رگوں میں لہور کتا ہوا محسوس
 ہوا۔ وہ ایک چپتا تھا اس کی قاتل آنکھیں انگاروں کی
 مانند دھک رہی تھیں اس کی دم تیزی سے دائیں بائیں
 حرکت کر رہی تھی۔ اس کا وزن اس کے پچھلے پاؤں

پر تھا اور اس کی یہ کیفیت اشارہ دے رہی تھی کہ وہ مجھ پر
 چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے قریباً نصف منٹ تک
 میں اور درندہ آنے سانسے رہے۔ اس کی قاتل
 آنکھیں سفائی سے مجھ پر جمی تھیں۔ اس کا چہرہ، زور
 آور تھا اور قاتل دانتوں کی جھلک دکھائی پڑتی تھی۔ اس
 کی سانسوں کے ساتھ ساتھ ہلکی سی، مدھم مدھم غراہٹ
 ابھر رہی تھی، زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی
 درندے کو یوں کھلی جگہ اپنے سامنے دیکھ رہا تھا، ناقابل
 بیان احساس تھا وہ پینٹیس چالیس سینڈ، پینٹیس
 ، چالیس گھنٹوں پر محیط تھے۔ لمحے صدیوں پر محیط تھے
 اور صدیاں لمحوں میں گزر گئیں۔ اس نے بے اعتنائی
 سے رخ موڑا اور مجھے یکسر نظر انداز کرتا جھاڑیوں میں
 غائب ہو گیا۔

میں نکلتی ہی دیر ساکت رہا..... معافی کی
 کر ہناک چیخیں ساکن فضاء میں دراڑیں ڈال گئیں.....
 ساتھ ہی چپے کی چٹکھڑا ابھری اور سنناہٹ بن کر دور
 دور تک پھیل گئی۔ پھر کسی دہشت زدہ شخص کے چلانے
 کی آواز ابھری۔ یہ آواز زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اٹھا اور
 محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ میری نگاہ کھاس کے بیچ
 پڑی لاشی نما ایک لکڑی پر پڑی۔ میں نے وہ اٹھالی۔
 آگے جا کر میں ٹھک گیا۔ کبکے کے درخت کے عقب
 میں چپتا کسی شخص کو بھنبھوڑ رہا تھا۔

سنسنی کی ایک برقی لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے
 ہوتی ہوئی دماغ تک جا پہنچی۔ وہ ایک لرزا دینے والا
 منظر تھا۔ میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر لاشی سے
 چپے کی پشت پہ ضرب لگائی۔ نتیجتاً وہی ہوا، جو ہونا
 چاہئے تھا۔ مشتعل درندے نے اپنے نامعلوم شکار کو
 چھوڑا اور غضب ناک آواز میں میری جانب متوجہ ہوا۔
 میں بے ساختہ کئی قدم پیچھے ہٹا اور لاشی پر میری گرفت
 لاشعوری طور پر مضبوط ہوئی۔ وہ اگلی ٹانگوں سے زمین
 کھرچنے لگا اور پھر بجلی سی کود گئی۔

مجھے اپنے کندھے میں انگارے دھنسنے معلوم
 ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی سڑے ہوئے گوشت کی



آغوش

راشد نذیر طاہر - کراچی

وہ ایک بے نام اور بے وجود سایہ تھا جس کے پیچھے نوجوان اپنی طاققت، ہمت اور سوچ سے بڑھ کر بھاگتا رہا، کوشش، کوشش اور انتھک کوشش کے باوجود بھی نوجوان اسے پا نہ سکا لیکن جب وہ سایہ مجسم اس کے سامنے آیا تو.....

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ایک دلکش و فریب، حیرت انگیز مگر سبق آموز کہانی

جمیل نے ایک طویل سانس لی، کتاب کو سائیلنٹ نیل پر رکھا اور سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کا ذہن کہانی کے تانے بانوں میں کھوپا ہوا تھا، اس کی نظر میں مصنف نے پہلی بار اپنی کسی کہانی کا انتقام ادا ہوا چھوڑا تھا۔ آغوش نامی مصنف اس کا پسندیدہ ترین لکھنے والی تھا۔ یوں تو اس نے کئی لکھنے والوں کو پڑھا تھا، لیکن اس نے جو بات آغوش کی تحریروں میں محسوس کی تھی وہ کسی اور میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جمیل اس کا کوئی افسانہ، کوئی کہانی اور کوئی ناول چھوڑا نہیں تھا۔ چند سال پہلے اس کی آغوش سے خط و کتاب بھی لکھائی کا انتقام ادا ہوا چھوڑا تھا۔ آغوش نامی مصنف اس کا پسندیدہ ترین لکھنے والی تھا۔ یوں تو اس نے کئی لکھنے والوں کو پڑھا تھا، لیکن اس نے جو بات آغوش کی تحریروں میں محسوس کی تھی وہ کسی اور میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جمیل اس کا کوئی افسانہ، کوئی کہانی اور کوئی ناول چھوڑا نہیں تھا۔ چند سال پہلے اس کی آغوش سے خط و کتاب بھی لکھائی کا انتقام ادا ہوا چھوڑا تھا۔

اور دیگر مردوں کی بے حرمتی..... اور دیگر گناہ..... اس آگ کی تپش اتنی دور سے بھی میرے دل و دماغ کو جھلسائے دے رہی تھی۔ رواں رواں ناقابل برداشت حد تک سلگ رہا تھا۔ میں تپ تپ کر رونے لگا..... گڑگڑانے لگا۔ ”اگر آج اللہ مجھ سے خفا ہو جائے، مجھے دھکا دے، تو.....؟“ یہ سوچ کر میرا رواں رواں خوف سے لرز اٹھا۔ اگر ایسا ہو جاتا، تو کون تھا جو مجھے سہارا دیتا؟ کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی تو نہیں.....

”مجھے کر دے معاف اپنے رسول پاک کے صدقے خطائیں بخش دے میری شہ لولاک کے صدقے میرے مالک! دہائی ہے تجھے آل بخیبر کی رہا کر دے غموں سے، کر بلا کی خاک کے صدقے“ میرے چار سوتا رنگی پھٹکی ہے..... پاتال کی اتھاہ تاریکی..... کچھ بھائی نہیں دے رہا..... کچھ بھی نہیں.....

”اندھیر دل میں مجھے تاندنگی دے دے میرے مولا در توبہ کو تو کشادگی دے دے میرے مولا“ میں موت کی سفاک آہٹیں سن رہا ہوں..... وہ اپنے نوکیلے بچوں میں مجھے دبوچنے والی ہے..... جکڑنے والی ہے..... میں نے کلمہ شہادت پڑھنا چاہا، مگر..... افسوس کر.....“ مجھے کلمہ شہادت یاد نہ آ رہا تھا..... شدید ترین خوف کی ایک سہرہ، برقی لہر نے میری ریڑھ کی ہڈی میں جنم لیا اور یکبارگی پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

”یا اللہ! بے شک..... تو بہت مہربان ہے، اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ بچہ جب کوئی غلطی کرتا ہے تو ماں اسے بے شک ڈانٹتی پھٹکارتی ہے، مگر جب بچہ اپنی غلطی کا احساس کر کے روتا ہے تو ماں اسے سینے سے لگاتی ہے۔ اور یہی سارہ..... تو اے میرے اللہ! سارہ جیسی محبوب ترین ہزاروں ہستیاں ہیں، میں تیرے اور اپنے محبوب آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر دوں اور ”اف“ تک نہ



جیل نے کئی خط لکھے اسے کوئی جواب نہ ملا، لیکن وہ مایوس نہ ہوا۔

اسے آغوش سے مشورے اچھے ملتے تھے اور دل کو بھی سکون ملتا تھا۔

اب بھی کبھی اگر وہ کسی مسئلے میں الجھ جاتا تو آغوش کے پوسٹ بکس پر اسے خط ضرور بھیجتا تھا۔

یہ اور بات تھی کہ اسے جواب نہ ملے۔ لیکن نہ جانے کیوں دل تو ملی ہو جاتی تھی۔

جیل کا تعلق نور پور نامی گاؤں سے تھا، بچپن سے ہی اسے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک بہت اچھے گریڈ میں پاس کیا۔

اس کی ایک خالہ شہر میں مقیم تھیں، وہ جیل کو بے حد چاہتی تھیں۔

چنانچہ جیل کے والدین سے بات کر کے وہ اسے اپنے ساتھ لے گئیں، تاکہ جیل اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔

جیل نے کالج میں داخلہ لے لیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں پر بلاوجہ بوجھ بن رہا ہے۔

گاؤں میں والدین کے پاس بھی اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ جیل کی اہانت کر سکتے۔

چنانچہ جیل نے فیصلہ کیا کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی جاب بھی کرے گا۔ تاکہ کم از کم اپنا بوجھ تو خود اٹھا سکے۔

شہر میں نوکری ملنا اتنا آسان تو نہیں تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کام اس قدر دشوار ثابت ہوگا۔

اب تک اس نے اپنے خالو اور خالہ سے اس بات کو چھپایا ہوا تھا لیکن ایک دن تنگ آ کر اس نے اپنے خالو کے سامنے بات رکھ دی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ وہ برہم ہو گئے۔ ”تم نے یہ بات کیسے سوچ لی، مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔“

”آپ..... غلط سمجھ رہے ہیں خالو جان۔“ اس نے صفائی پیش کی! ”میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے میں نے ٹائٹ کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ میں دن بھر ریکارڈ ہتا ہوں میں کوئی جاب کروں گا تو مجھے تھوڑا تجربہ بھی حاصل ہوگا۔“

”تجربوں کے لئے ساری عمر پڑی ہے۔“ ان کا جواب تھا۔ ”نی الحال تم اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ جاب کے چکر میں پڑ گئے تو پڑھائی کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹ جائے گی۔ اس لئے نی الحال اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔“

جیل خاموش ہو گیا، لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس بات سے قطعی اتفاق نہیں ہے۔

اس کی کوشش جاری رہی، لیکن اب تک اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔

اخباروں میں نوکریوں کے اشتہار دیکھ کر وہ درجنوں کے حساب سے اپنی C.V ارسال کر چکا تھا۔

لیکن بس نصیب ہی کی بات تھی، یوں لگتا تھا جیسے حامل الہذا کو سانپ سونگھ جاتا ہو۔

اپنا یہ معاملہ بھی وہ یکطرفہ طور پر اپنے محبوب مصطفیٰ آغوش سے شیئر کر چکا تھا۔

اس تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ لیکن اس نے تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔

چند اسامیوں کے لئے وہ انٹرویو بھی دے کر آیا تھا لیکن اس کا حاصل نادر۔

جب قسمت کو ہی منظور نہ تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔

لیکن پھر اچانک ایک دن..... وہ کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کی خالہ نے ایک براؤن رنگ کا لفافہ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے خالہ.....؟“

”معلوم نہیں بیٹا..... ابھی ڈاکید دے کر گیا ہے۔“ اس پر تمہارا ہی نام لکھا ہے..... دیکھ لو۔ گاؤں سے آیا ہوگا۔“

یہ کہہ کر خالہ بچن میں چلی گئیں۔ جیل نے لفافہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

اس پر جیل کا ہی نام درج تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا تو اندر سے ایک خوب صورت لیٹر پیڈ بچہ برآمد ہوا۔

جیل نے اسے کھولا، لکھا تھا۔

”تمہارے لئے ایک نوکری ہے..... ٹائم صبح 8 بجے سے سہ پہر 3 بجے تک..... تنخواہ 15,000/15 کام کی نوعیت دفتری امور پر مبنی ہے۔ آکر ملو کل 2 بجے نور پارک ٹرسٹ نمبر 336۔“

تنخواہ تو کافی معقول تھی، لیکن انجمن کی بات یہ تھی کہ بھیجے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔

جیل نے کندھے اچکائے اور لفافہ جب میں رکھ لیا، جانے میں کیا حرج ہے۔ اس نے سوچا۔ ”تنخواہ تو کافی اچھی ملے گی۔“

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس موقع کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا، اور نور پارک ٹرسٹ میں اپنی قسمت آزمائے کے بعد ہی کسی اور کو اس بارے میں بتائے گا۔

چنانچہ دوسرے دن وہ گھر والوں کو بتائے بغیر روانہ ہو گیا، نور پارک ٹرسٹ ڈسٹریکٹ میں تھوڑا وقت صرف ہوا۔

لیکن 2 بجے سے قبل ہی وہ اس جگہ پہنچ گیا۔

یہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ یہ ایک کاروباری مرکز تھا۔ یہاں زیادہ تر دفاتر بنے ہوئے تھے۔

ایک پرنٹنگ پریس کے برابر میں 336 موجود تھا جیل نے دستک دینا چاہی تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔

وہ ذرا ہچکچایا اور پھر اندر داخل ہو گیا سامنے ایک شیشے کا کمرہ دکھائی دیا، جیل اس کے قریب پہنچا تو مائیک سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”اندر آ جاؤ مسٹر جیل.....!“

وہ چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن تھا کون.....!!

”ڈور نہیں مسٹر جیل..... اندر آ جاؤ۔“

پھر آواز آئی۔

جیل یہ سن کر آفس کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک خوب صورت سی میز تھی، جس کے عقب میں ایک ریو لوگ چیئر رکھی تھی ان دونوں کے برابر میں دو چھوٹی کرسیاں بھی رکھی تھیں۔

ماحول بے حد صاف ستھرا تھا۔

”ایک کرسی پر بیٹھ جاؤ مسٹر جیل.....“ وہی آواز پھر آئی۔

اب کی باریوں لگا جیسے بہت قریب سے کہا گیا ہو۔

”آپ..... آپ کون ہیں.....؟“ جیل کے منہ سے نکلا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے.....“ آواز آئی۔ ”کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور اگر تم اس جاب پر آمادہ ہو جاتے ہو تو پھر کل سے یہ کرسی تمہاری ہوگی۔ تم اس کرسی پر بیٹھ کر دفتری معاملات سنبھالو گے۔“

”آپ کون ہوں..... اور کہاں ہیں.....؟“

جیل نے پھر پوچھا۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ.....“ کہا گیا۔ ”یہ سب کچھ اتنا دشوار گزار نہیں ہے۔“

جیل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب بتائیں آپ.....!“ جیل نے فوراً اپنی بات دہرائی۔

”میرے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ آواز میں ہلکی سی ترشی درآئی۔

اور نہ تم سے کوئی غیر قانونی کام لیا جائے گا، کہ تم کسی دشواری میں پڑو۔ تمہیں کام کی نوعیت بتائی جا رہی ہے۔ اگر منظور ہو تو کل سے آفس جو آج کر لیتا۔ آفس کی چابی تمہیں اسی ٹیبل کی دراز میں مل جائے گی۔ اوکے.....!“

جیل نے احقانہ انداز میں سر ہلا دیا۔

اور یہ حقیقت تھی کہ کام کی نوعیت کچھ خاص نہ تھی۔

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورہ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاء اللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو نیکے کے نیچے رکھنے سے لاثری کا نمبر، جادو کس نے کیا، پکار و بار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، قلیت یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مردو عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورہ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

ہو گئیں..... یہ برقعہ پوش اور نقاب لگائی ہوئی عورت یقیناً اس کی باس تھی۔
آج وہ آفس میں آئی تھی، اور اسی وجہ سے جمیل اپنا ٹائم ختم کرنے کے بعد گھر واپس نہیں گیا تھا۔
برقعہ پوش عورت نے باہر آ کر ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کیا، جمیل صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ عورت اپنے جسم کو پوری طرح سے چھپائے ہوئے تھی۔ صرف..... آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔
جمیل نے خود کو اس رخ پر رکھا تھا کہ عورت اس سے بے خبر تھی۔ وہ سامنے موجود ایک چائے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا۔
جیسے ہی وہ ٹیکسی میں بیٹھی، جمیل بھی ایک دوسری ٹیکسی کی طرف پکا۔
اس نے جاسوسی ناول بھی پڑھ رکھے تھے۔
اور ان ہی کہانیوں کا تجربہ آج تجربہ بن گیا تھا۔
ٹیکسی ڈرائیور نے متنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گنا کر ایہ ملنے کی لالچ نے اس کی زبان کو تالہ لگا دیا۔
پھر بڑی کامیابی سے تعاقب شروع ہو گیا۔
آخر کار گولڈن کالونی کے ایک مکان کے پاس اگلی ٹیکسی رک گئی۔
جمیل کی ٹیکسی آگے نکلتی چلی گئی اس نے مرکز دیکھ لیا تھا کہ وہ عورت کس مکان میں داخل ہو رہی ہے۔
”بس..... اب تم بھی ٹیکسی موزلو.....“ جمیل نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ ”مجھے اس مکان کے قریب اتار دیتا۔“
ڈرائیور نے سر ہلا دیا۔
جمیل کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا، وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔
اس کا دل دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس راز پہ سے پردہ اٹھا دینا چاہئے، جبکہ دل کا دوسرا حصہ جسے میں ڈرتا تھا، ہچکچاہٹ تھی اور ہلکا سا

وہ اپنی کرسی پر بیٹھا، تو تھوڑی دیر بعد کمرے میں آواز گونجی۔
”مٹرنجیل۔ اگلے ہفتے تمہیں شہر سے باہر جانا پڑے گا۔“
”آپ کا ہی کام ہوگا.....؟“ اس نے پوچھا۔
”ظاہر ہے..... آواز آئی۔“
”ٹھیک ہے.....“ اس نے سر ہلایا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”کیا آپ مجھے دیکھ رہی ہیں میڈم.....؟“
”ہاں..... کیوں نہیں.....؟“
”دراصل.....“ اس نے کان کھجایا۔ ”میں آپ کو نہیں دیکھ رہا۔“
”جمیل صاحب..... آواز اچانک ہی سخت ہو گئی۔ ”آپ آم کھاؤ۔“ گٹھلیاں مت گتو۔ اوکے.....؟“
”میڈم..... آخر پردے میں رہنے کی وجہ کیا ہے.....؟ آپ سامنے کیوں نہیں آتیں.....؟“ جمیل نے پھر کہا۔
”نوکری سے آپ کا دل تو نہیں بھر گیا۔“
”جیسے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو میں کوئی اور انتظام کروں.....؟“
”نہیں..... نہیں.....“ وہ جلدی سے بولا۔ ”آئی ایم سوری..... آپ..... آپ کیا کہہ رہی تھیں.....! اس کے باوجود جمیل کا تجسس برقرار رہا۔ اب وہ اپنے پراسرار باس کا دیدار کرنے کے لئے بری طرح بے چین تھا۔
اور پھر اس نے سوچ لیا کہ کیا کرنا ہے..... اب وہ اپنے منصوبے کو کئی جامہ پہنا چاہتا تھا۔
اب وہ اس دن کے انتظار میں تھا، جب باس آفس میں آتی تھی..... ہاں..... وہ دن.....!
آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد بھی آج جمیل اس اپارٹمنٹ کے گرومنڈ لا رہا تھا۔
اور پھر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز

اسے ہفتے میں 2 یا 3 دفعہ کچھ پارسل ملتے تھے، جن پر پتے درج ہوتے تھے وہ ان پارسلوں کو وہاں پہنچاتا تھا اور وہاں سے جو دستے لفافے ملتے تھے ان کی میٹرس کھولے بغیر انہیں میر کی چلی دراز میں رکھ دیتا تھا۔
بس یہی کام تھا۔ باقی تو یہاں کھیاں بھی نہیں تھیں کہ جنہیں مار کر وہ اپنا ٹائم پاس کر لیتا۔
وہ اپنے خالو اور خالہ کو آگاہ کر چکا تھا کہ اسے ایک آفس میں جاب مل گئی ہے۔
چنانچہ اب وہ بڑے مزے سے اس پراسرار سی جاب کو خوش السلوبی سے نباہ رہا تھا۔
اس دوران وہ اندازہ کر چکا تھا کہ اس کی نادیہ باس کا تعلق کس لئے لکھانے کی دنیا سے تھا۔
جمیل کو اس وقت آغوش کی بھی بے حد یاد ستائی۔ نہ جانے کیوں اب وہ اس سے کوئی رابطہ نہیں کر رہا تھا۔
”شاید وہ اب مغرور ہو گیا ہے۔ ہاں..... یہی بات ہوگی۔“
”بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔“ اس نے ایک سردہ بھر کر سوچا۔ اور پھر اپنے پراسرار باس کے ایک پارسل کی طرف متوجہ ہو گیا۔
لیکن..... تجسس انسان کی فطرت ہے۔ جمیل کو تنخواہ سے مطلب تھا۔ جو اسے اپنے وقت پر مل رہی تھی۔
اس کے باوجود وہ اپنے باس کے طریقہ کار سے شدید الجھن میں مبتلا تھا۔
ہفتے میں صرف ایک دن اسے باس کی آواز سنائی دیتی تھی، اور اس دن اسے صبح دفتر کا دروازہ کھلا ملتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس دن خود آیا کرتی تھی۔
آج بھی وہی دن تھا۔ جمیل نے آج فیصلہ کیا تھا کہ اپنی باس سے اس کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔
اس کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن آج اس نے کمر باندھ لی تھی۔

”جی خالہ..... دل کی بات کہہ دی آپ نے خوف تھا۔“

خالہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، جیل نے ان کے جاتے ہی کاغذ قلم سنبھال لیا۔
اسے اپنی کیفیت سے آغوش کو آگاہ کرنا تھا۔
یہ ہفتہ بہت تیزی سے گزر رہا تھا، آج پھر باس کے آنے کا دن تھا۔
ایسے امید تھی کہ آج آفس کھلا ہوا ملے گا، لیکن

خلاف توقع اسے آس کا دروازہ خود ہی کھولنا پڑا۔
 ”اس کا مطلب یہ ہے کہ آج میڈم نہیں آئیں گی۔“ وہ زرب بزدلیا۔ خرد دیکھا جائے گا۔
 وہ اپنی میز پر پہنچا۔ اس نے روز نامچہ دیکھنے کے لئے دراز کھولی دراز میں آج بھی بارسل موجود تھا۔

لیکن یہ کیا.....؟ وہ چونک اٹھا۔
اسے ملنے والے تمام پارسل سر پہ مہر ہوتے
تھے۔ لیکن یہ پارسل کھلا ہوا تھا۔
”تو کیا.....؟ آج میڈم سے غلطی ہو گئی۔“ اس
نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

پھر جلدی سے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور
لفافے میں ہاتھ ڈال دیا
یہ ہاتھ سے لکھا ہوا افسانہ تھا۔ اور عنوان کے
نیچے مصنف کا نام لکھا تھا..... ”آغوش“
اس کا دل دھک سے رہ گیا..... ذہن
میں آندھیاں سی جانے لگی تھیں۔

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ جس میڈم کے پاس وہ ملازمت کر رہا تھا اس کا کچھ نہ کچھ تعلق آغوش سے ضرور تھا، ورنہ ہارسل میں موجود اس تحریر کے کیا معنی

اس وقت جمیل کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، وہ بار بار مودے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور پھر اس طرح چاروں طرف دیکھتا، جیسے میزیم انہی اسے مخاطب کرے گی اور وہ اسے بہت سارے سوالات کر ڈالے گا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ آج میڈم خود غیر حاضر تھی۔

وہ اکثر اپنے اہم فیصلے آغوش پہ چھوڑ دیا کرتا تھا، اور اس کے جواب کا انتظار کیا کرتا تھا۔
اگر آج وہی آغوش کسی مشکل میں گرفتار تھی تو اب اس کا بھی فرض تھا کہ وہ آغوش کی مدد کرے۔
آج اسے ہر صورت میں آغوش سے ملنا تھا..... ابھی اور اسی وقت.....
یہ فیصلہ کر کے وہ صدر دروازے سے باہر نکل

گیا۔
جیل نے بیل بجائے اور انتظار کرنے لگا۔ جلد
قدموں کی آہٹ ہوئی۔
”کون ہے.....؟“
”میں جیل ہوں.....“
شاناسا چھا گیا۔
”دروازہ کھولے آغوش.....“ جیل نے
پھر کہا۔ ”میں..... میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”واپس چلے جاؤ۔۔۔“ آواز آئی۔ ”میں نے تم کو منع کیا تھا۔۔۔ پھر تم کیوں مجھ سے ملنے آئے ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔“

”میں آپ سے مل کر ہی جاؤں گا۔۔۔“ جمیل کا

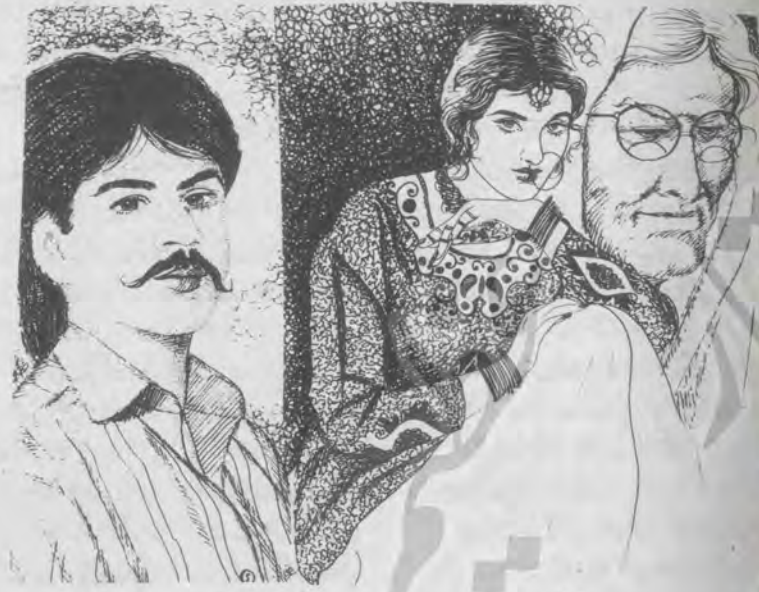
گجہ مضبوط تھا ”ورنہ دوپہر سے شام تک اور شام سے رات تک یہیں کھڑا رہوں گا۔“

”تم ضد کیوں کر رہے ہو.....؟“ غصہ بھری آواز آئی۔ ”میں تم کو اپنے بارے میں بتا چکی ہوں.....“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔“ جیل کا جواب تھا۔ ”آپ ہی کی ایک کہانی میں ایسا ہوا تھا اور ہیر و نے ہیروئن کو اپنا لیا تھا۔“

”یہ بھی کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے.....“ جمیل کا جواب تھا۔ ”اب ہمارے معاشرے میں نہ جزم عام ہے..... آپ مجھے سے ملیں بس.....“

کی گئی۔ ”آس پاس والے سینیں گے تو کیا



عشق حیات ہے

اقصی رباب - فیصل آباد

خوبرو حسینہ تابوت میں مردہ پڑی تھی کہ اس پر سحر پھونکتے ہی وہ کسمساکر اٹھ بیٹھی اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی اتنے میں ایک عجیب الخلق کریمہ آواز نکالتی بدروح حاضر ہوئی اور پھر.....

چاہت و خلوص سے سرشار ایک نوجوان کی روداد جس نے محبت کی خاطر موت پر غلبہ پایا

میرا نام منسل ہے۔ میں اپنے والدین کے ساتھ لاہور جیسے پیارے شہر میں رہتی ہوں۔ ابھی میں نے بی اے کیا ہی تھا کہ میرے بابا جانی کے بچپن کے دوست ہمارے گھر آئے وہ اور ان کی مسز مجھے بہت چاہتے تھے۔ (میری طرح ان کا بھی ایک ہی بیٹا تھا۔ جمال احمد، ہم دونوں ہی اکلوتے تھے میرے والدین کو ایک بیٹے کی چاہ تھی جبکہ میرے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد دینے سے محروم رکھا۔ یوں وہ جب بھی جمال سے ملنے نہیں لگتا وہ ان کا ہی بیٹا ہے ادھر اٹکل، آنٹی بیٹی کی چاہ میں دیوانے تھے۔ آنٹی، اٹکل جب بھی آتے میرے لئے ڈھیروں شاپنگ کرتے اور مجھے ہمیشہ ڈھیروں تحائف دیتے اس مرتبہ بھی وہ دونوں میرے لئے ڈھیروں چیزیں لائے۔ بابا جانی نے کہا۔ ”منسل! اپنے اٹکل آنٹی کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔“ میں کچن میں آگئی۔ میں نے کھانا

رہے۔
”موقع تو آپ دے رہی ہیں..... کھول دیں دروازہ.....“
”اچھا..... بابا..... لو.....“
ان الفاظ کے ساتھ ہی کھٹ سے دروازہ کھلا..... اور..... پھر.....
حقیقت سامنے آگئی..... جمیل کے خواب ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔
وہ پلکیں جھپکائے بغیر آغوش کو دیکھ رہا تھا۔ آج وہی آغوش اس کے سامنے تھی جسے اس نے ہمیشہ اپنی خوشیوں اور غموں میں شریک رکھا تھا۔ اور آج وہ اسے اپنانے کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔
لیکن..... اس نے اپنے بارے میں جھوٹ بولا تھا کہ اس کا چہرہ جلا ہوا ہے۔
اس کا چہرہ صاف شفاف تھا..... البتہ اسے دیکھتے ہی جمیل پر یہ راز کھل گیا کہ نہ وہ عورت تھی اور نہ مرد..... وہ تیری جنس تھی۔
جمیل کے جسم میں تو جیسے کاٹو تو لہو نہیں والی مثل شبت ہو گئی تھی..... دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔
اس کے برعکس آغوش کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔
اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا۔
”اب بولو..... کیا تم اب بھی مجھے اپناؤ گے.....؟“
”میرا تعلق تیری جنس سے.....“ آغوش کے ہونٹ ہلے۔ ”اور اب یہ بات شاید تمہیں معلوم ہے نہ مجھے سے کوئی دوستی کر سکتا ہے، اور نہ شادی..... میں صرف اپنی تحریروں میں زندہ ہوں..... تمہارے خطوط نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا، اسی لئے میں نے تم سے کبھی رشتہ توڑ دیا تھا..... کیوں کہ مجھے اپنے بارے میں معلوم تھا..... اس کے باوجود تم مجھے خط لکھتے رہے..... اور اپنے حال سے آگاہ کرتے



تیار کر لیا تو ڈرائنگ روم کی طرف گئی کہ امی کو اطلاع دے سکوں کھانا تیار ہے۔ مگر اندر سے آتی آوازوں نے میرے قدم روک لئے۔

”بابا جانی کہہ رہے تھے۔“ مناجل تو ابھی چھوٹی ہے یا۔ اتنی جلدی شادی۔“

انکل بولے۔ ”پھر کیا ہوا۔ اسے ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر ہی تو جانا ہے۔ کیوں فکر کرتے ہو۔“ وہ تو جیسے سب تبہ کر کے آئے تھے۔ میرے والدین کو مٹا کر چھوڑا۔

امی نے مجھے آواز دی۔ میں اندر داخل ہوئی آئی نے میری انگلی میں ایک خوبصورت انگلی پہنا کر مجھے گلے سے لگالیا۔ میں اپنے کمرے میں آگئی شادی دو ماہ بعد رکھی گئی۔ دو ماہ تو جیسے پرلگا کر اڑ گئے اور مہندی کا دن بھی آ گیا میرا دل گھبرا رہا تھا مہندی کی رسومات کے اختتام تک میں تھک چکی تھی۔ امی مجھے آرام کرنے کے لئے کمرے میں چھوڑ آئیں۔

میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ میں کبھی شاید کزنز میں سے کوئی ہے۔ میں آنکھیں بند کئے سوئی جاگتی کیفیت میں تھی کہ ایک دم جیسے کوئی میرے بیڈ پر بیٹھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی پوری کوشش کی مگر میری آنکھیں نہ کھلیں سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔ پسینے سے سارا جسم شرابور ہو گیا۔ زور لگانے کے باوجود نہ تو میری آنکھیں کھل رہی تھیں اور نہ ہی سانس بحال ہو رہا تھا۔ کہ اچانک ایک آواز آئی۔ ”تم یہ سب اتنا ہی آسان سمجھتی ہو۔“

ساتھ ہی میں نے پورا زور لگایا اور اٹھ بیٹھی۔ میرا سانس بحال ہو گیا۔ میں بجلت میں کمرے سے باہر بھاگی۔ اور فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر پانی پینا شروع کر دیا، میں نے خد کے تینش اور باب کو اپنے کمرے میں سلا لیا۔ پھر ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

بارات بہت دھوم دھام سے آئی۔ نکاح کے

بعد کھانے سے فارغ ہوئے تو بارات نے واپسی کا قصد کیا۔ اور میں روتی دھوتی اپنے بائیں کے گھر سے آئی، انکل کے گھر آ گئی۔

☆.....☆

میرے بازو پر سر رکھے جو شیشی نیند سوری ہے یہ میری پیاری سی بیوی مناجل ہے۔ یہ خوبصورت وجود آج میری زندگی کا مستقل حصہ بن گیا ہے میرا نام جمال احمد ہے۔ مناجل میرے پاپا کے عزیز دوست کی اکلوتی بیٹی ہے ہمارا بچپن اکٹھے کھیلنے گزارا۔ مناجل جب پانچویں اور میں ساتویں جماعت میں تھا پاپا کا فرانس ہو گیا۔ سو میں لاہور چھوڑنا پڑا۔ لاہور سے زیادہ مناجل کو چھوڑنے کا دکھ تھا۔ مناجل کا نام بھی میں نے رکھا تھا۔ اور تب سے مناجل پر صرف اپنا حق سمجھتا تھا۔

اپنا پرنس شروع کرتے ہی میں نے ماما پاپا سے کہہ کر مناجل کے رشتے کے لئے بھیجا اور خود ہوجا۔ اور پھر زمانے فون پر جب مجھے خوشخبری سنائی کہ مناجل کی انگلی میں میرے نام کی انگلی پہنا دی تو مجھے لگا میری زندگی مکمل ہو گئی۔

وہ دن بھی آ گیا جب مہندی کی رسم ہونا تھی فانوس کے نیچے مہندی کا سارا سامان پڑا تھا کہ اچانک فانوس گر اور سارا سامان بکھر گیا۔ بارات والے دن میں نے آف وائٹ سوٹ پر براؤن شیر وانی پہنی ماموں گھوڑا لے آئے کہ مسجد میں جانے کے لئے دو لہا گھوڑے پر بیٹھے جیسے ہی میں گھوڑے پر بیٹھا، گھوڑے کو تھکانے لگا ہوا کہ فل اپنیڈ میں بھاگ کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے میں گھوڑے پر قابو پاسکا مگر اچانک میں گھوڑے سے گر گیا۔ میرے کپڑے خراب ہو گئے۔ مجبوراً میں نے فہری بیس سوٹ پہنا کچھ بزرگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ بد شگون ہے۔ اب میری مناجل اپنے ہوش و ہوا سن کے ساتھ میرے پہلو میں نیند کے مزے لے رہی ہے۔ اور میں خوش ہوں کہ شادی بخیر و خوشی انجام پائی۔

علیٰ اور دواڑے پر دستک ہوئی جمال نے دروازہ کھولا انکل آئی سانسے کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا

انہوں نے بہت محبت سے جواب دیا اور دھیروں خوشیوں کی دعائیں دیں۔ یوں پیار و محبت میں دن گزرنے لگے۔ تین ماہ ہو گئے میری شادی کو کہ اچانک ایک رات وہی مہندی والا واقعہ پھر ہوا۔ ویسے ہی مجھ کو سانس آنا بند ہو گیا۔ بائیں منٹ تک یہی کیفیت رہی بڑی مشکل سے میں اٹھ کر بیٹھی سانس بحال ہوا آنکھیں کھلیں تو دیکھا جمال کی جگہ ایک بڑا سا سانپ میری طرف دیکھ رہا ہے میری چھین نکل گئیں۔ سب گھر والے بھاگے آئے آئی نے سمجھا میں خواب میں ڈوڑگی ہوں جمال بھی حیران تھا۔ اب تو ہر دوسرے دن میرے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ خوف سے میرا کھانا پینا بھی کم ہو گیا تھا۔ دل گھبرانے لگتا آئی میری طبیعت گور کھیتے ہوئے مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر عدیلہ کافی قابل اور سمجھدار تھیں۔ مجھے انہیں سب بتانا پڑا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے آئی بھی فکر مند تھیں۔ انہوں نے چیک اپ کیا اور آئی نے بولیں۔ ”مبارک ہو۔ آپ دادی بننے والی ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس حالت میں اکثر اس طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ برس برسے خواب آتے ہیں۔ کوشش کریں نہیں اسکیلے نہ رہنے دیں۔“

ایک دن میں اپنے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی کہ مجھے اچانک وہی آواز سنائی دی۔ ”بہت ڈھیٹ ہو۔“ جمال کا چھینا ہی نہیں چھوڑ رہی اب اس کا ایک ہی حل ہے۔ میں تمہارے جسم میں آکر میس کر دوں اور تمہیں اگلے جہان پہنچا دوں۔“

وہ جیسے ہی میرے قریب آئی اسے ایک جھٹکا لگا اور غرا کر پیچھے ہٹی۔ اور بولی ”میری غیر موجودگی میں تم نے یہ چال چلی کہ اپنے منٹل بطن میں آنے والے مہمان کو جکڑ دی میں کیسے غافل ہوئی اب میں تمہارے جسم میں اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک یہ آنے والا مہمان دنیا میں نہیں آجاتا۔ مگر اب میں تمہیں جمال کے پاس برداشت نہیں کر سکتی اب دیکھو میرا تماشا۔“

یہ کہہ کر اس نے جیسے میرا سانس میرے حلق میں روک دیا۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے۔ مگر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ کافی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔

مگر یہ کیا میں نہ ٹول سکتی تھی۔ نہ بول سکتی تھی صرف میری آنکھیں کھلی تھیں جو سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ اچانک مجھے امی کی آواز سنائی دی وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ”میری مناجل کو کیا ہو گیا ایک دم۔“

جمال دھڑائیں مار مار کر رو رہا تھا۔ میں زندہ تھی اور مجھے مردہ سمجھا جا رہا تھا بہت کوشش کی کہ کسی طرح منہ سے آواز نکال کر بتا سکوں مگر بے بسی ہی بے بسی تھی کہ میرے سامنے سب پیارے میرے لئے روپیٹ رہے تھے اور میں جیسے لوگی ہو چکی تھی میری آنکھیں سب نے بند کرنے کی کوشش کی مگر وہ میری آنکھیں نہ بند کر سکے یوں مشورہ ہوا کہ شاید میں آخری دیدار کی طرح اس گھر کو اور اس گھر کے لوگوں کو اپنی کھلی آنکھوں میں بسا کر قبر کے اندھروں میں ساتھ ہی لے جانا چاہتی ہوں اور پھر میرا کفن تیار ہو گیا اور کچھ بزرگ عورتوں نے مجھے تختہ پر لٹا کر تہلانا شروع کر دیا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی کہ عورتیں مجھے تہلنا رہی تھیں اور امی جان اور آئی جی مجھ پر نیم گرم پانی ڈال رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ روتے روتے کلمہ طیبہ کا ورد کر رہی تھیں پھر مجھے کفنا گیا۔ مجھے تابوت میں رکھ دیا گیا بہت بولنے کی کوشش کی مگر بے سود اور اپنی بے بسی پر میری آنکھوں سے دواؤں تھے جو دوسروں کی نظروں سے تو پوشیدہ تھے مگر جمال جو مجھے ایک تک دیکھ رہا تھا اس سے چھپ نہ سکے اور اس نے وہ آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے سیٹھ لئے اور میرا دل دھڑکنے لگا کہ میرا جمال میری آنکھوں میں دیکھ رہا ہے اب وہ جان جائے گا کہ میری آنکھیں بے جان نہیں۔

اور یہی ہوا جمال پاس کھڑے انکل نصر سے کہنے لگا۔ ”دیکھیں پاپا آپ کو مناجل مردہ لگی ہے مجھے تو میری مناجل زندہ سلامت لگتی ہے۔“

میں خوشی سے کھل اٹھی کہ حقیقت کھل جائے مگر سب جمال کو میرے تابوت سے علیحدہ کر دیا یہ کہہ کر۔ ”بیٹا صبر کرو جانے والے لوٹا نہیں کرتے۔“ اس کے ساتھ ہی سب نے میرا آخری دیدار کرنا شروع کر دیا اور اچانک لوگوں نے تابوت اٹھایا۔ اور میرے کانوں میں وہی زہریلی

آواز گونگی۔ آخری بار سب کو دیکھ لو، میں تمہیں کچھ عرصہ کے لئے ہر قسم کے جذبات سے عاری کر رہی ہوں کہ تم قبر کی اندھیری نیند کو یہ میرا احسان ہے تم پر۔“ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اور دوبارہ جب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں اسی تابوت میں لپٹی ہوئی تھی اور ایک پورا دن گزر چکا تھا مگر اب دن کی روشنی میری نظروں کے سامنے تھی تابوت کا دھکن کھلا ہوا تھا اور میرا وجود اس میں پڑا ہوا تھا۔ جب پھر وہی زہریلی ڈوبی نسوانی آواز سنائی دی۔ میری دنیا میں خوش آمدید۔“

میں نے بولنے کی کوشش کی تو حیرت انگیز طور پر میری آواز میرے طلق سے نکل میں نے پوچھا۔“ تم کون ہو اور یہ سب کیوں کر رہی ہو؟ مجھے میرے گھر جانے دو۔“ تو اس کے منہ سے خوف ناک قہقہہ برآمد ہوا اور اس نے کہا۔“ کہاں جانے دوں، مگر وہ گھر میرا ہے غلطی سے تم اس میں آباد ہو گئی تھی اور میں کون ہوں؟ میں شاہ جنات کی بیٹی ہوں آج سے سات سو سال پہلے میں اپنے والدین کے ساتھ بہت خوش و خرم رہتی تھی جب میں نے ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھا وہ بہت خوبصورت بہادر اور جیالا، میں نے جب اسے دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی پھر تو میرا یہ معمول بن گیا کہ میں روزانہ اس کی راہ میں آنے لگی۔

وہ میری محبت میں گرفتار ہو ہی جاتا اگر تم اس کے سامنے نہ آتی یاں کل کی شہزادی مہر و ش اور آج کی مناسبت مجھے سمجھ نہیں آتی اپنے پیار کی قاتل کو کیا نام دوں۔

ہاں تو پھر تم اس کے راستے میں آ گئی اور وہ تمہارے حسن کے جال میں پھنس گیا۔ میرا بہادر اور خوبصورت اطفال، پھر میں نے سر توڑ کوشش کی اپنے پیار کو پانے کی۔ مگر تمہارا چادو اس کے سر پہ چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں نے اسے پانے کے لئے کیا کچھ نہ کیا، اپنا گھر اپنے والدین چھوڑے جو مجھے اپنی جان سے عزیز تھے اور اس بے وفائے ایک دم کہہ دیا کہ ”وہ مہر و ش کو چاہتا ہے اور اس سے شادی کرے گا۔“

میں اس وقت پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی جب میں نے اسے دھوکے سے وہاں بلایا تھا مہر و ش بن کر کیونکہ والدین سے ناراضگی پر میری تمام توہنیں ختم ہو گئی تھیں اور میں ایک عام لڑکی بن گئی تھی اور میں اطفال کے لئے اتنی قربانی دینے کے بعد اسے تمہیں خوبصورت چڑیل کے لئے کیسے چھوڑ دیتی۔ خوش خوش وہاں تم سے ملنے کے لئے آیا میں اس کی طرف پشت کئے کھڑی تھی وہ اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا اور میں خوشیوں سے سرشار تھی اس نے مجھے کندھوں سے تھا میری ساری قربانیاں شرمناک مگر جیسے ہی اس نے میری طرف دیکھا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا ابھی جس کے لہجے میں پھول برس رہے تھے وہی زبان اب انگارے برساتے لگی۔

میں نے اپنے پیار کا واسطہ دیا اس پر اثر نہ ہوا اور جب میں نے تمہیں گالیاں کوسنے دے کر جھمکی دی کہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی تو وہ غصے میں پاگل ہو گیا اس نے مجھے پہاڑی سے نیچے دھکادے دیا اور میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے اڑتی ہوئی زمین پر آ گری، گرتے ہی میری گردن کی ہڈی ٹوٹی اور میں مر گئی۔ میرے والدین کو جب پتہ چلا تو وہ روتے پینتے مجھے اٹھا کر لے گئے پھر میری روح اپنے شہزادے سے ملنے کے لئے جسم سے نکل کر اورد گرد بھٹکتی لگی۔

اس دن تمہاری شادی اطفال سے ہونے والی تھی اور میری روح سب ڈرامہ دیکھ رہی تھی میں روتی بیٹھتی اپنے گھر آئی تو میری آہ و زاری میری والدہ سے برداشت نہ ہو سکی تو انہوں نے مجھے میری کھوئی ہوئی طاقت واپس کر دی اب میں سب کچھ کر سکتی تھی۔

میری والدہ نے طاقت واپس کرتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہر ماہ چودھویں کی رات سے ایک دن پہلے کوہ جالوت میں ان کے پاس چودھویں رات کے جشن میں شامل ہوا کروں گی اور چاروں دن وہیں بتاؤں گی۔ وہ جشن وہ میرے نام پر میرے مرنے کے بعد شروع کیا گیا تھا اور میں نے وعدہ کر لیا کہ ہر چودھویں کی رات سے ایک دن پہلے آ جایا کروں گی۔

اور یوں طاقت واپس لے کر میں تمہارے کمرے میں آ گئی۔ تم خوبصورت دلہن کے روپ میں مجھے ڈانٹ لگی، اپنی خوشیوں کی، اور پھر میں تمہاری نوکرانی کی شکل میں تمہارے سامنے دودھ کا گلاس لے کر حاضر ہوئی جو میں پہلے ہی تیار کر چکی تھی اس میں بہت تیز اثر نہ رہتا کہ دودھ کا ایک قطرہ ہی تمہارے لئے بہت تھا میں نے جیسے ہی دودھ تمہیں دیا تم نے گلاس پکڑ کر دودھ پینا شروع کر دیا، دودھ کے دو گھونٹ ہی تمہارے طلق سے اترے تھے کہ تم بے جان ہو کر ایک طرف لڑھک گئی اور میں گلاس لے کر وہاں سے غائب ہو گئی۔

پھر تمہارے مرنے کی دھوم سارے محلے میں مچیل گئی اور یہ صرف نہ سہتے ہوئے اسی وقت اطفال کا دل بھی بند ہو گیا اور وہ بھی موقع پر ہلاک ہو گیا مجھے کافی دیر بعد پتہ چلا مگر کیا کر سکتی تھی۔

پھر میں نے اپنے دور کی ایک بہت بڑی کاہنہ جو ماضی حال اور مستقبل کا حال بتاتی تھی اس کاہنہ کا نام یولانی تھا میں اس کے پاس حاضر ہوئی شاہ جنات کی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ میری روح کو بھی پہنچاتی تھی سو اس نے مجھ سے آنے کی وجہ دریافت کی، جب میں نے اپنی تقدیر کا حال پوچھا تو اس نے ایک سفید کپڑا دیوار پر لگا کر کچھ پڑھنا شروع کیا اور پھر اس کپڑے پر اطفال اور تمہاری صورت نظر آئی کاہنہ نے بتایا کہ۔ ”یہ بہت عرصہ بعد دنیا میں آئیں گے۔“

یوں میں اس وقت کا انتظار کرتی رہی اور پھر سات سو سال بعد ایک دن میرا اطفال مجھے نظر آیا جب میں اس کے کمرے تک پہنچی تو پتہ چلا کہ وہاں ایک بار پھر اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہیں۔ یہاں قسمت مجھے مات دے گئی کہ وہی رات میری کوہ جالوت جانے کی تھی اور وہی تمہاری مہندی کی، سو میں اپنی وفادار کنیز مار بے کوبادیت دے کر چلی گئی، اگر میں نہ جاتی تو میری طاقتیں سلب ہونے کا خطرہ تھا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی مار بے کوبہا کہ ”یہ شادی نہ ہونے دینا۔“ میں سیدھی وہیں سے کوہ جالوت پہنچ گئی وہاں جشن کی تیاریاں عروج پر تھیں، ہمیشہ میں بہت خوش اور خوش

وخرش سے شامل ہوتی تھی مگر اس بار میرا دل اس محل نما گھر میں اٹکا جہاں تمہاری شادی تھی پھر جب چاروں کے بعد میں یہ سوچتی ہوئی واپس آئی کہ مار بے سب کچھ ٹھیک کر دیا ہوگا تو پتہ چلا کہ مار بے نے اپنی طاقت کے مطابق جو ہوسکا کیا مگر اس بار قسمت تمہارے ساتھ تھی تم نہ صرف شادی بلکہ اپنی شادی شدہ زندگی کی ابتداء کر چکی تھی اور اطفال جواب جہاں اٹکا تھا تھا بہت خوش و خرم تھا۔

پھر میری رکاوٹ دم توڑنا شروع ہو گئی مگر میں نے حوصلہ نہیں چھوڑا، اور پھر تمہاری شادی کے پانچ ماہ بعد جب میں کوہ جالوت گئی تو میری ملاقات عظیم کاہنہ سے ہوئی میری حالت کو دیکھتے ہوئے کاہنہ نے مشورہ دیا کہ میں تمہارے جسم میں داخل ہو کر ایک دفعہ اگر جہاں کو پاؤں تو پھر مجھے اس سے کوئی الگ نہیں کر سکا اور تم مر جاؤ گی۔

بے شک جسم تمہارا ہوگا مگر اس پر قبضہ میرا ہوگا۔ عظیم کاہنہ نے یہ بھی بتایا کہ تم حاملہ نہ ہو اور جب میں واپس آئی تو اس بار تمہاری قسمت کہ مجھ پتہ چلا کہ تم دو ہفتوں سے حاملہ ہو مگر اب مجھے اطفال کے پاس تمہارا وجود ناقابل برداشت لگا، یوں میں نے تمہارا سانس روک کر تمہیں عارضی موت دے دی کیونکہ اگر تمہیں ویسے مارتی تو پھر میں بچے کی وجہ سے تمہارے جسم میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جب تک یہ بچہ دنیا میں نہیں آتا تمہیں اس تابوت میں رہنا ہوگا، دن میں دوبار تمہیں تابوت سے نکال کر کھانا دیا جائے گا تا کہ تم بھی کمزور نہ ہو اور بچہ بھی صحیح رہے اگر میں تمہارا خیال نہ رکھوں گی تو تمہارے جسم میں مجھے داخل ہونے میں دشواری ہوگی اس لئے یہ کھانا اٹھ کر کھاؤ۔ ایک گھنٹے بعد تمہیں اپنی پہلے والی حالت میں آ جانا ہے۔“

☆.....☆.....☆

آج تین ماہ ہو چکے ہیں میری مناسبت کو مجھ سے بچھڑے ہوئے گھر میں سنانا جھاجکا ہے وہ گھر جو مناسبت کے ہوتے ہوئے خوشیوں اور ہفتوں کا مرکز تھا اب کسی ویران قبرستان کا منظر پیش کر رہا ہے، ماما اپنے کمرے سے کم نکلتی ہیں سارا دن کمرے میں رہتی ہیں جب میں اور پایا گھر آتے ہیں تو صرف ہمارے ساتھ کھانا کھاتی

ہیں اور انتہائی ضرورت کے لئے بوقت ہیں، یونہی دن گزر جاتا ہے مگر رات کو جیسے ہی میں کمرے میں جاتا ہوں تو ہر چیز مناسبات میں لپکتی ہے میں بے بس ہو کر سونے کی کوشش میں کئی نیند کی گولیاں لیتا ہوں۔ آج صبح سے ہی میرا دل گھبرا رہا ہے رات کو بھی میں بے چین سا سویا، ابھی سوئے مجھے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ میرے کانوں نے مناسبات کی آواز سنی۔ ”جمال مجھے بچاؤ جمال مجھ پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔“ پھر میں نے آواز کی طرف دیکھا تو کیا دیکھا ہوں کہ مناسبات ایک تابوت میں لیٹی ہے اور تابوت کا ڈھکن کھلا ہے اور مناسبات کے سینے پر ایک سانپ بیٹھا ہوا ہے میری خوف سے چیخ نکلتی گئی۔

چیخ کی آواز سن کر ماما پاپا دوڑے آئے اور جب انہوں نے دیکھا کہ میں پسینے سے شرابور ہوں اور خوف سے میرا رنگ زرد ہو رہا ہے تو ماما نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے پیار سے میرا ماتھا چومنا اور پولیس۔ ”لگتا ہے خواب میں ڈر گیا ہے۔“

میں نے جلدی سے اپنا خواب انہیں سنایا جسے سن کر ماما نے رونا شروع کر دیا اور پولیس۔ ”بیٹا مناسبات کہاں تم تو اس کی موت پر ہی کہہ رہے تھے مناسبات کی آنکھیں زندہ ہیں مگر بیٹا موت تو اٹل حقیقت ہے۔“

مگر میرے دل میں یہ خیال پکا ہو گیا کہ میری مناسبات زندہ ہے اور کسی مشکل میں گرفتار ہے صبح جاگنے کے بعد نہ چاہتے ہوئے میں نے تھوڑا سا ناستہ زہر مارا کیا۔ اپنے دفتر میں منیجر کو ضروری ہدایات دیں اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ویرانے کا رخ کیا کیونکہ خواب میں ایسی کسی جگہ مناسبات کو دیکھا تھا وہ جگہ پہاڑوں کے درمیان غار ٹاپ تھی یوں سارا دن پہاڑوں میں گھومتا پھرا مگر مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

یونہی آٹھ دن ہو گئے مجھے پہاڑوں کی خاک چھانتے کیونکہ تین دن تک میری مناسبات مجھے مدد کے لئے پکارتی رہی اور آج نوں دن تھا مجھے پہاڑوں میں گھومتے ہوئے۔

میں گاڑی روڈ کے کنارے لاک کر دیا کرتا

اور پیدل نکل جا، میں آج کافی آگے تک گیا تھا کہ چلتے چلتے پہاڑوں کو دیکھتے دیکھتے شام سر پر آگئی اور پھر میں نے واپسی کا قصد کیا کہ اندر جا پھیلنے سے پہلے، میں واپس چلا جاؤں کہ ایک پہاڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری مناسبات سسک رہی ہے۔

میں آگے بڑھا وہ ایک بہت کشادہ غار تھا ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو کر دیک کر بیٹھ گیا کیونکہ مجھے کچھ ناگوار سا احساس ہو رہا تھا جو مجھے چوکنا کر رہا تھا۔

اچانک غار میں مدھم مدھم روشنی ہونے لگی اور پھر اتنی روشنی ہو گئی کہ میں اندر با آسانی دیکھ سکتا تھا، میں نے پتھر کی اوٹ سے دیکھا تو مجھے ایک کھلا تابوت نظر آیا جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔

اچانک میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر اپنی چیخوں کو روکا۔ ”اوہ! میرے خدایا! یہ تو وہی تابوت تھا جس میں مناسبات کو دفنایا گیا تھا، میں اسے پہچان گیا کیونکہ تابوت میں نے خود خریدا تھا اس کے سائیز پر کچھ علیحدہ سے بلکا نیا لکڑی لگا گیا تھا باقی تابوت گہرا ہڈوں لکڑی کا تھا مگر غلطی سے کاریگر سے سائیز پر دوسرا لکڑی لگا گیا اور میں ویسے ہی وہ لے آیا چند منٹ ہی گزرے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی تابوت پر چمکی، اس نے زریب کچھ پڑھا اور تابوت کے اندر لیٹا ہوا مناسبات کا وجود اور کواٹھا۔

مناسبات کو دیکھ کر میری حالت غیر ہو گئی چاہتا تھا کہ بھاگ کر جاؤں اور مناسبات کو اس لڑکی سے بچھین لوں مگر مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے ہوں، میں صرف دیکھ سکتا تھا حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لڑکی نے مناسبات کے آگے کھانا رکھا اور جب مناسبات نے کھانے سے انکار کیا تو اس نے زردار تھپڑ مناسبات کے گال پر پر مارا۔

مجھے شدید غصہ آیا مگر پورا زور لگانے کے باوجود میں حرکت کی طاقت کھو چکا تھا پتہ نہیں یہ کیا حرکت تھی اس نے زبردستی مناسبات کو کھانا کھلایا اور وہ دھ پلا کر کہنے لگی۔ ”اب تم مرو اس تابوت میں آج مجھے کوہ جالوت جانا ہے کیونکہ کل چودھویں رات کے جشن میں شرکت کرنی

ہے مگر تمہیں کھانا کھانا دیا کرے گی۔“

ساتھ ہی اس نے تالی بجائی تو ایک سیاہ قام لڑکی جس کے بال سانپ کی شکل کے تھے۔ میں نے اتنی بد صورت اور ڈراؤنی شکل آج تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ نمودار ہوئی اور جھک کر اس لڑکی سے بولی۔ ”مالکن کیا حکم ہے؟“ اس نے کہا۔ ”میں کوہ جالوت جا رہی ہوں اس چڑیل کا خیال رکھنا، دیکھنا تم جو بھی تشدد کر مگر اس کا خوبصورت جسم خراب نہ ہو کیونکہ یہ میرے ہی کام آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ لڑکی غائب ہو گئی۔

وہ بد صورت عورت مناسبات پر جیسے ہی چمکی تو مناسبات بے ہوش ہو گئی، اس کے ساتھ ہی سارا منظر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں بھاگا اور غار کو چاروں طرف سے دیکھا مگر اب وہاں کچھ بھی نہ تھا میں اگلے قدموں مناسبات کو پکارتے ہوئے واپس آیا اور جلد سے جلد گھر پہنچا، پایا میری حالت دیکھ کر حیران رہ گئے، مجھے پانی پلایا اور جب میں کچھ سنبھلا تو میں نے ساری حقیقت انہیں بتائی۔

پہلے تو وہ یقین نہ کر سکے میرے بار بار کہنے پر ان کو یقین آ گیا۔ ”مگر اب کیا کریں؟“ انہوں نے کہا۔ پھر وہ کہنے لگے۔ ”مجھ تمہیں میں شاہ صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔“

صبح ہم شاہ صاحب کے پاس پہنچے تو تمام واقعات سننے کے بعد انہوں نے جواب دیا۔ ”میرے اختیار سے بہت آگے ہے۔ اس لئے آپ فوراً چنڈی میرے مرشد عبداللہ شاہ کے پاس حاضر ہوں۔ آج ہی چلے جائیں کیونکہ آج اتوار ہے چاند کی چودھویں تاریخ ہے وہ آج آپ کو مل جائیں گے۔ اس کے بعد وہ پورا ہفتہ باہر نہیں نکلیں گے اپنے حجرے میں عبادت کرتے ہیں۔“

سو ہم پتہ لے کر فوراً پیر عبداللہ شاہ صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ہم نے سلام کیا انہوں نے جواب دیا اس وقت ان کے مرید کافی تعداد میں ان کے پاس جمع تھے انہوں نے سب کو اشارہ کیا تو وہ سب اٹھ کر باہر چلے گئے ان کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے

اشارہ کیا میں ان کے قریب جا کر ادب کے ساتھ بیٹھ گیا انہوں نے مجھے دیکھا اور فرمانے لگے۔ ”کتنے دستوں کی سیاحتی کر چکے ہو، آخر گو ہر منزل ڈھونڈ نکالا۔“ میں نے حیرن ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے کہنے لگے۔ ”مناسبات کو پایا۔“

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی۔ ”حضور صرف دیکھا ہے۔“

انہوں نے فرمایا۔ ”آج ہمارے پاس بھی وقت ہے اور تمہارے مقدر کے ستارے بھی عروج پر ہیں کہ وہ بدروح آج کوہ جالوت میں جشن منا رہی ہے اپنی کامیابی کا، اگر اب حملہ کیا جائے تو مناسبات کو آسانی سے چھڑا سکتے ہیں۔“

اس وقت دن کے دو بجے تھے پیر صاحب نے اپنے چار خاص مرید اپنے ساتھ لئے اور ہمارے ساتھ ہوئے وہ اور مرید اپنی گاڑی میں، میں اور پاپا اپنی گاڑی میں، ہم ایک گھنٹہ کے اندر پہاڑوں کے قریب پہنچ گئے اس وقت تین بجے تھے پھر گاڑیوں سے اتر کر ہم نے پہاڑوں میں سفر شروع کیا دو تین گھنٹے کی کچھ مسافت کے بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں اس پہاڑ کا غار تھا، غار اب بھی خالی تھا، مگر شاہ صاحب نے اسی پتھر کے پیچھے ہمارے ساتھ بیٹھنے کا ٹھکانہ بنایا اور پڑھائی شروع کر دی۔

تقریباً ایک گھنٹہ تک پڑھنے کے بعد کل والا سین دوبارہ ابھرا، پہلے غار میں روشنی ہوئی پھر تابوت نظر آیا۔ اس کے بعد وہ ملازمہ تابوت کا ڈھکن اٹھانے کے بعد مناسبات کو پکڑ کر اٹھا یا جب مناسبات تابوت میں بیٹھ گئی تو ملازمہ نے کھانا دیا۔

شاہ صاحب بدستور پڑھتے رہے ان کی پڑھائی کا اثر تھا کہ ملازمہ نے کھانے کے بعد مناسبات سے کہا ”اٹھ آج تجھے تابوت سے ذرا باہر نکال دوں تیری ٹانگیں نہ بڑ جائیں آخر یہ جسم میری مالکن نے استعمال کرنا ہے۔“

اس نے جیسے ہی مناسبات کو باہر نکالا مناسبات تابوت کے پاس بیٹھ گئی اس ملازمہ نے کہا۔ ”آج چودھویں کی رات ہے مالک تو جشن میں ہوگی میں نے تمہیں اس لئے

نکالا کہ میں بھی جشن مناسکوں، جیسے یہ چاند پورا روشن ہوگا میں تمہیں واپس تابلوت میں ڈال دوں گی مگر اس سے پہلے تمہارا قصور سا خون چوسوں کی کیونکہ میرے ناگ بھوکے ہیں اور میں نے اس خوشبودار جسم سے نکلنے والا خون پینا ہے اس کے بعد تو تم رہو گی نہیں۔“

اتنا سننے ہی شاہ صاحب پتھر کے پیچھے سے نکلے اور غار میں داخل ہو گئے۔ شاہ صاحب ہمیں منہ کر گئے تھے کہ اندر کوئی نہ آئے اور اپنے مریدوں کو کہہ گئے تھے کہ سورۃ ناس اور سورۃ جن بلند آواز سے تلاوت کرتے رہیں۔ مریدوں نے زور زور سے تلاوت شروع کر دی۔

جیسے ہی پیر صاحب غار میں داخل ہوئے تو غار ایک دم تاریک ہو گیا مگر دیر ہو چکی تھی پیر صاحب اپنا وار ملازمہ پر کر چکے تھے اور ملازمہ شعلوں کی لپیٹ میں ہی ساتھ ہی فضا میں سر اٹھ چھل گئی۔

منافل کی کھانسی کی آواز باہر تک آئی پھر ایک دم غار روشن ہو گیا ملازمہ کا جلاہوا جسم ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔

پھر پیر صاحب دیوار پر لگے بڑے سے آئینے پر کچھ بڑھ کر پھونک ماری تو آئینے کے اوپر ایک کبوتر کی تصویر ابھری پیر صاحب مسلسل ورد کرتے ہوئے جیسے ہی کبوتر کی تصویر پر پھونکا۔

ایک دم جیسے زلزلہ آگیا آئینے میں کبوتر کی جگہ ایک خوبصورت لڑکی تڑپتی نظر آئی جو پیر صاحب کے آگے ہاتھ چھوڑ رہی تھی کہ اسے چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ ہی پیر صاحب نے لڑکی پر پھونک ماری تو وہ بدصورت ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی وہ زور زور سے چلانے لگی۔ ”مجھے چھوڑ دو، تم نے میرا جسم جلا دیا۔ اب میں تمہیں جلا دوں گی میں شاہ جنات کی بیٹی ہوں۔“ اس نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں مگر شاہ صاحب نے اس کی طرف دوسری پھونک ماری تو ہڈیوں میں آگ لگ گئی اس کے جسم کا جبر پھڑکنے لگا ارد گرد دوسرے جنات بھی اسے بچانے کے لئے دور سے مگر اس وقت تیسری پھونک سے وہ ڈھانچہ زور زور دھماکے سے گر اور ساتھ ہی آئینہ کچی کچی ہو کر پھڑ گیا۔

شاہ صاحب نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا

اور منافل کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ ”بیٹی چلو اپنے گھر۔“ اور یوں منافل باہر آتے ہی ایک دفعہ پھر بے ہوش ہو گئی اب کے بارشاہ صاحب نے کہا۔ ”اسے جگانائیں یہ خود ہی اپنی نیند سو کر اٹھے گی۔“

یوں میں منافل کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ اور شاہ صاحب کا شکریہ ادا کیا شاہ صاحب نے محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہم سے الگ ہو کر واپسی کی راہ لی۔

ہم باپ بیٹا خوش خوش گھر آ گئے گھر میں سب سے پہلے ماما نے منافل کے ساتھ مجھے دیکھا تو ان کی جیسے جیج نکل گئی پھر وہ خوشی سے بھاگتی ہوئی آئیں منافل سے ملنا چاہتی تھیں کہ پاپا نے انہیں روکا کہ ”منافل جب تک خود نہ جاگے اسے جگانائیں۔“ میں منافل کو اپنے بیڈ روم میں لا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ کچھ دیر منافل کو دیکھنے کے بعد جیسے ہی میں باہر آیا ماما مجھ سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں کیونکہ پاپا انہیں سب کچھ بتا چکے تھے۔

اس کے بعد میں نے لاہور آئی انکل کو فون کیا اور انہیں فوراً کوئٹہ پہنچنے کا کہا۔ انہیں اس لئے نہ بتایا کہ کہیں انہیں خوشی سے کچھ ہونہ جائے کیونکہ منافل کے بعد انکل ہارٹ کے مریض بن چکے تھے آئی اور انکل کو آنے کا کہہ کر ہم لوگوں نے پہلے دن سکون کے ساتھ اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور میں اپنے کمرے میں آ کر منافل کو دیکھنے لگا اس کی زندگی سے بھرپور آتی جاتی سانس مجھے سکون دے رہی تھیں میں پھر باہر آ گیا کیونکہ اگر میں کمرے میں رہتا تو ہوسکتا تھا منافل جاگ جاتی۔

اور وہ رات ہم تینوں ماں بیٹے نے جاگ کر گزاری آئی انکل صبح چار بجے کی فلائٹ سے کوئٹہ پہنچے۔ آئی میرے گلے لگی روئے جاری تھیں اور کہہ رہی تھیں ”بیٹا کیا حلیہ بتالیا ہے اپنا؟ جانے والی تو پٹلی تھی، اب تو خود کو سنجال لو۔“

پھر انکل مجھ سے ملے اور پوچھنے لگے ”بیٹا اتنی ابیر جیسی میں ہمیں کیوں بلایا؟“

میں نے آہستہ آہستہ انہیں باتوں میں لگاتے

ہوئے کہا کہ ”انکل فرض کریں اگر منافل زندہ ہوتو۔“ تو انکل بولے۔ ”بیٹا ناممکن کبھی ممکن ہوئی ہے ہم نے اپنے ہاتھوں سے اس کے تابلوت کو قبر میں اتارا، بیٹا یہ کیسی باتیں کر رہے ہو اگر ایسا ہو جائے تو ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی کی خبر کیا ہو سکتی ہے۔“

ابھی ہم باتیں کر رہی رہے تھے کہ پتہ نہیں کیسے منافل کی آنکھ کھلی گئی اور وہ اٹھ کر باہر آ گئی اور جیسے ہی اس کی ہم پر نظر پڑی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی وہ برآمدے میں ستون کے پاس کھڑی تھی۔

اچانک میں نے دیکھا اس کا چہرہ خوشی سے ختم ہوا تھا میں نے آواز دی۔ ”منافل ابھر آ جاؤ۔“

میری آواز کے ساتھ ہی انکل آئی نے مڑ کر دیکھا تو جیسے پتھر کے بت بن گئے، ماما جلدی سے آگے بڑھیں اور منافل کو گلے لگا لیا منافل بھی بہت خوشی سے ان کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیاں اتر آئی، ابھی منافل ماما کے ساتھ کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ سب سے پہلے انکل کو ہوش آیا وہ منافل بیٹی کہتے ہوئے بھاگے اور منافل سے لپٹ گئے ساتھ ہی آئی بھانگیں اور منافل سے لپٹ کر بے تحاشہ رونے لگیں۔

جب سب مل ملا کر خوش خوش بیٹھے تو انکل بولے۔ ”کوئی مجھے بتائے گا کہ یہ سب کیا ہے؟“

پھر ماما نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور پیار سے بولیں۔ ”یہ میرے بیٹے کی حد سے زیادہ محبت اور دیوانگی کی وجہ سے آج ہم منافل کو ایک دفعہ پھر پائے گئے ہیں۔“

پھر نائنے وغیرہ سے فارغ ہو کر ماما نے اپنی فیملی ڈاکٹر کو فون کیا تاکہ وہ منافل کا اچھی طرح چیک اپ کر کے بتا سکے کہ منافل بالکل فٹ ہے یا کسی طاقت کی دوائی کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر کو بھی سن کر شاک لگا کیونکہ وہ بھی منافل کی آخری رسومات اللہ نے کرے عارضی رسومات میں شامل تھی جب ڈاکٹر آئی تو اسے بھی یقین کرنا مشکل تھا پھر چیک اپ کے بعد اس نے مختصر آپ بیٹی سنائی جس نے میرے ساتھ ساتھ وہاں دوسروں کو بھی حیرت میں مبتلا کر دیا

اور جب سب حیرت سے نکلے تو سب نے اللہ تبارک و تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کیا۔

اور پھر منافل کو سب سے ملانے کے لئے ماما نے ایک پارٹی بمعہ نعت خوانی اراچ کی۔ اس میں میں نے شاہ صاحب اور ان کے پیر و مرشد بڑے شاہ صاحب کو بلایا ان کی آنے پر ہم سب بہت خوش ہوئے محفل نعت بڑے شاہ صاحب کو بہت پسند آئی میلاد کے بعد پاپا اور ماما نے پیر صاحب سے پوچھا۔ ”اب تو کوئی خطرہ نہیں جمال یا منافل کو تو پیر صاحب نے فرمایا کہ ”اس بدروح کو اسی وقت جلا دیا تھا۔ اور اب جنات میں سے کوئی دشمن نہیں ہے کیونکہ انہیں جمال کی دیوانگی مٹا چکی ہے اور لفظ دیوانگی پر شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ سب ہی مسکرا دیے اور میں نے خوشی سے سر جھکا لیا۔

آج اس واقعہ کو بیسے سات سال ہو گئے ہیں، میرے تین بیٹے ہیں حسان نعمان نور امین، نور امین میری بہت پیاری بیٹی ہے اور بھائیوں سے بڑی بھی اور مجھے اس کے ساتھ اتنا پیار کہ کیا بتاؤں بلکہ بیٹوں سے بھی زیادہ۔ منافل کئی دفعہ گلہ کرتی ہے کہ میں تو اسے زیادہ پیار کرتا ہوں اور حسان نعمان سے کم، تو میں اسے بتاتا ہوں کہ۔ ”یہ نور امین ہی کا وجود ہے جس نے اس بدروح سے اسے محفوظ رکھا اگر میری نور امین منافل کے وجود میں نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔“

یہ سوچ کر ہی میری جان نکل جاتی ہے اور مجھے اپنی نور اور زیادہ دل کے قریب لگتی ہے۔ ثنائاتی اور گھر میں دادا دادی سب کی جان اس میں انکی ہوتی ہے۔ اور سب سے زیادہ حسان نعمان کی بھی اس میں ہی جان انکی ہوتی ہے۔ نعمان نے اگر ہماری فیملی مکمل کر دی ہے یہ ہمارا خوشحال گھر انہ ہے جس کی رویتیں منافل کے دم سے ہیں، اللہ ہمارے گھر کو ہر مشکل و مصیبت سے بچائے۔ (آمین)



وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیوں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

میں نے دیکھا کہ میں ایک عالی شان کمرے میں موجود ہوں، کمرے میں ہر چیز سے ظاہر تھا کہ وہ کمرہ کسی بہت ہی امیر کبیر یا پھر کسی راجہ کا کمرہ تھا۔ کمرے کی دیواروں پر جنگلی ہتھیار لٹکے پڑے تھے، اسے میں ایک طرف کا دروازہ کھلا اور ایک بہت ہی سن موٹی لکڑی، ڈنشین، اپر، انڈر پلٹاں چلتی ہوئی میرے قریب آئی اور میرے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ میرا نام لال جی ہے اور میں جنم جنم سے تمہاری تلاش میں ہوں، میں نے دیکھا ہے کہ میرے من کی کامنائیں پوری ہوں، ہر جنم میں تم میرے دروازے میں تمہاری سیوا کرتی رہوں، جب میں نے انکار کیا کہ میں تمہیں نہیں جانتا تو اس نے کہا میں تمہیں دکھاتی ہوں تو تمہیں یقین آ جائے گا اس نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا تو دیوار پر جیسے فلم چلنے لگی، اس فلم میں وہ موجود تھی اور ساتھ میں، میں بھی موجود تھا، یہی نہیں بلکہ اس نے اور کئی سین دکھائے ہر سین میں ہم دونوں موجود تھے کہ چاک ایک رات میں چپک چپکے ہی ایک جنگل میں پہنچ گیا۔ اس جنگل میں ایک جھونپڑی تھی اور اس جھونپڑی میں ایک ساخو اور اس کی ایک بہت ہی سنہری پتھر کی جی جس کا نام لگا تھا۔ خیر روز روز ملتے، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور پھر ایک دن وہ کچھ ہو گیا جس کا میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دونوں ایک جان اور دو قالب پڑے تھے کہ ساخو آ گیا اور غصے و غضب میں اس نے اپنی پتھر کی کوجلا کر جسم کر دیا اور مجھ سے بولا۔ میں تیرا جیون برباد کر دوں گا تو کبھی کبھی اندر سے بگا اور جب میں جا ہوں تو ایک بچہ کا سمجھ دے گا اور پھر میری آنکھ ملے گی تو میں ایک کندر میں موجود تھا، خیر میں غرض حال قدموں سے اٹھا اور ایک طرف کوچل دیا، میں کرتے پڑے چلا رہا، پیاس سے برا حال تھا، اب صبح ہو رہی تھی، صبح کا اجالا ہر طرف پھیل چکا تھا، مجھے ایک گڑھے میں موجود پانی نظر آیا اور میں نے اس گڑھے سے من بھر پانی پی لیا، پانی پینے کے بعد میں اسی راستے پر آ گئے ہی آگے چلا گیا تو دیکھا کہ راستے کے دونوں طرف ترشول گڑھے پڑے ہیں۔ خیر میں کافی دور تک چلتے ہوئے ایک گاؤں میں پہنچ گیا اور مندر کے سامنے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ خیر مندر کے پندت صاحب نے مجھے اٹھا کر مندر کے ایک کمرے میں لے گئے، اور میں مندر میں رہنے لگا۔ مندر کی ایک خدمت گار تھی، جس کا نام کاشی تھی، وہ میری خدمت میں پیش پیش رہتی تھی۔ ایک رات میں کمرے میں سویا پڑا تھا کہ کوئی میرے کمرے میں آیا تو سوتے سے اٹھ بیٹھا، بہت ہی زیادہ اندھیرا تھا کیونکہ اماؤں کی راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ آنے والا میرے بہت ہی قریب بیٹھ گیا اور پھر اس نے مجھے زور سے ہنسنے لیا۔ پھر گوشی سنائی دی۔ ”بابو جی! میں کاشی ہوں، کبیراؤ نہیں۔ آج وہ پھر آ گیا۔“

(اب آگے پڑھیں)

”آج وہ پھر آ گیا۔“ اچانک ایک آہٹ کی

آواز سننے ہی کاشی نے جھٹ میرے من پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، یعنی اس نے میرا منہ بند کر دیا تاکہ میرے من سے کوئی آواز نہ نکل سکے۔

پورے کمرے میں گھپ اندھیرا مسلط تھا۔ دروازے پر ایک سایہ سالہرایا۔ پھر آواز سنائی دی۔

”پر تاپ..... پر تاپ! یہ تو سویا پڑا ہے۔“ رام لال کی آواز سماعت سے مگرانی اور پھر ترنت یہ بول کر وہ

پلٹے اور دروازے سے باہر نکل گئے۔ کاشی بدستور مجھے ہنسنے چلتی رہی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ سے میرا منہ بھی بند کر رکھا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ رام لال جی کمرے سے دور چلے گئے ہیں تو اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب کر کے سرگوشی کی۔ ”بابو جی! اچھا ہوا کہ میں نے ترنت آپ کا منہ بند کر دیا ورنہ آپ رام لال جی کے مخاطب کرنے پر اگر جواب دے دیتے تو بہت برا ہو جاتا۔ رام لال جی کو آپ



کے پاس میری موجودگی کا پتہ چل جاتا۔ اور پھر یقیناً وہ باتوں باتوں میں یہاں بیٹھ جاتے اور پھر میری عزت خاک میں مل جاتی۔

بابو جی! آپ اب آرام کریں اور میں ترنت جاری ہوں، لیکن ایسا نہ ہو کہ رام لال جی میرے کمرے میں جائیں اور مجھے نہ دیکھ کر بیاہل ہو جائیں، کیونکہ آج کی رات بہت گھمبیر ہے، آج وہ پھر آ گیا ہے۔

یہ سن کر میں سرکشی میں بولا۔ ”کاشی وہ کون ہے جو کہ آج آ گیا ہے؟ اور پھر اس کے آنے سے اس قدر پریشانی کیوں ہو رہی ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی۔“

”بابو جی! اب اسے نہیں رہا کہ میں آپ کو اس کے متعلق بتاؤں، میں کل دن سے آپ کو اس کے متعلق بتا دوں گی۔ اب آپ آرام سے لیٹ جائیں، میں جاری ہوں۔“ اور یہ بولتے ہی کاشی میرے جسم سے علیحدہ ہوئی اور خاموشی کے ساتھ دروازہ سے باہر نکلتی چلی گئی۔

کاشی کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک شش و پنج میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ”وہ کون ہے؟ جو آج رات آ گیا ہے؟“

کافی سوچ بچار کے باوجود بھی میں اس گتھی کو نہ سلجھا سکا آخر تک بارگرا اپنی جگہ پر لیٹ گیا اور وقت کے تانے بانے کے متعلق سوچتے سوچتے میں نیند کی وادی میں چلا گیا۔

اور پھر اس دن صبح 8 بجے میری آنکھ کھلی، وہ بھی کاشی کے جگانے پر، کاشی نے میرا ہاتھ تھپک تھپک کر جگایا، میں فوراً اپنی جگہ اٹھ بیٹھا، جب میری نظر کاشی کی نظر سے ٹکرائی تو وہ مسکرائی ہوئی مجھ پر اپنی نظریں مرکوز کر رکھی تھیں۔

”بابو جی! آج تو آپ بہت دیر تک سوتے رہے، ورنہ ہر روز تو آپ جلدی اٹھ جایا کرتے ہیں، میں کئی مرتبہ کمرے میں آئی مگر آپ بے سدھ سوئے پڑے تھے، ایک مرتبہ رام لال جی بھی آپ کے کمرے میں آئے تھے مگر آپ کو سوتا دیکھ کر بولے۔ ”کاشی آج بربتاب کو سونے دینا، جلدی جگانا نہیں۔“ اور یہ بول کر مندر چلے گئے۔

میں بھی مندر چلی گئی تھی، پھر آپ کا خیال آیا کہ آپ اٹھ گئے ہوں گے، یہ سوچ کر چلی آئی، کیونکہ آپ کو ناشتہ بھی دینا تھا۔ ”یہ بول کر کاشی نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچا کہ میں اٹھ کھڑا ہوں۔ مگر پھر اچانک پتہ نہیں میرے من میں کیا آیا کہ میں نے کاشی کو اپنی طرف کھینچا تو وہ جھٹ سے مجھ پر آن گری۔ اور پھر غصے سے بولی۔ ”بابو جی! اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو وہ کیا سوچے گا۔ جلدی سے اب آپ انھیں اور اشراف کر لیں، میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“

”ارے ہاں! یاد آیا! تم یہ بتاؤ کہ رات سے وہ کون تھا جو کہ آ گیا تھا۔ میں رات کافی دیر تک اس کے متعلق سوچتا رہا۔“

”بابو جی! ابھی سے نہیں کہ میں بتا دوں، آپ فوراً تیار ہو جائیں، میں بعد میں بتا دوں گی اور آپ غلطی سے بھی کسی کے سامنے یہ نہ کہہ دینا کہ رات کاشی میرے پاس آئی تھی۔“ اور یہ بول کر وہ مسکرائی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

میں فوراً اٹھا اور اشراف کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں کمرے میں آیا تو میرے پیچھے ہی کاشی تھالی میں پوریاں، حلوا اور ایک کنوری میں آلو کی بجھیا لے کر آ گئی۔ اس نے تھالی میرے سامنے رکھی اور وہ خود میرے سامنے بیٹھ گئی پھر بولی۔ ”اب آپ جلدی سے ناشتہ کر لیں۔ مجھے مندر جانا ہے اور آپ بھی مندر میں چلے جائیں، رام لال جی آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

وہ جو رات سے آ گیا تھا، اس کے بارے میں، میں بعد میں بتا دوں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کا ذکر رام لال جی بھی آپ سے کر دیں۔“

میں نے پوری کا ایک نوالہ بنایا اور کاشی کی طرف بڑھا دیا تو اس نے مجھے بہت غور سے دیکھا اور پھر سگراتے ہوئے اپنا منہ کھول دیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے نوالہ اس کے منہ میں رکھ دیا اور بولا۔ ”کاشی اب تم بھی میرے ساتھ ناشتہ کرو۔“

”بابو جی! میں نے مجبور سے ناشتہ کر لیا تھا۔ یہ تو

آپ کو معلوم ہے کہ ہم تمام ناریاں کس سے اٹھتی ہیں۔ آپ جلدی سے ناشتہ کریں، زیادہ دیر ہوگئی تو ہو سکتا ہے کہ رام لال جی اس طرف آ جائیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں آپ ابھی تک سوئے نہیں رہے ہیں۔“

میں ایک نیک اس کی طرف دیکھنے جا رہا تھا، مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا بول رہی ہے اور پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک نوالہ بنا کر میرے منہ میں رکھنے کے لئے میرے ہونٹوں تک نوالہ لے آئی تو مجھے مجھے ہوش آ گیا اور میں چونک کر اسے بھر پور نگاہوں سے دیکھا۔

”بابو جی! آپ ترنت ناشتہ کریں، چلیں جلدی کریں۔“ اور پھر اس کی بات سنتے ہی میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا، اس نے تھالی اٹھائی اور مسکرائی ہوئی بولی۔

”اب میں جاری ہوں مندر میں، آپ بھی ترنت مندر میں پہنچیں۔“ اور یہ بول کر وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اٹھا اور اپنے کمرے سے نکل کر مندر میں پہنچ گیا۔

مندر میں کافی رش تھا۔ آج ہر دن سے زیادہ لوگ مندر میں موجود تھے اور بڑے پنڈت جی اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ”سجنا! آپ لوگ گہرائیں نہیں، آپ لوگوں سے میں کہیں زیادہ کثرت میں ہوں۔ رات بھر میں سو نہیں سکا اور پوری رات یہی سوچتا رہا۔

میرا من بہت دکھی ہو رہا ہے کہ خونی نے دھن راج کا خون کر دیا، اور پھر دھن راج کا سارا خون پی گیا۔ میرا من ماننے کے لئے بالکل بھی تیار نہیں ہے کہ یہ ہوا تو کیوں ہوا، آپ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے چاب کر کے پورے گاؤں کے گرد کنڈل باندھ دیا تھا اور پھر پورا مہینہ سارا گاؤں دیکھی رہا۔

جس راستے وہ خونی گاؤں میں داخل ہوا، اس راستے پر بھی میں نے زبردست کنڈل کر دیا تھا۔ پھر وہ کیسے گاؤں کے اندر آیا۔ یہ میں سمجھنے سے بیاہل ہوں۔ دیوی ماتا کے چڑھاوے سے فارغ ہو کر میں اس جگہ جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کہیں کسی نے کنڈل کو توڑ تو نہیں دیا ہے۔“

ایک ضعیف شخص ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”پنڈت جی! دھن راج کے گھر والے بہت کثرت میں ہیں، وہ بہت زیادہ رو رہے ہیں۔ دھن راج بہت ہی بائکا تو جوان تھا، اگلے مہینہ اس کا گن بھی ہونے والا تھا۔ بے چارہ کتنے ارمان سے گن کی تیاریاں کر رہا تھا۔“

ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور بولا۔ ”پنڈت جی اب ہم چلتے ہیں، دھن راج کی کریا کرم کے لئے تیار ہی کرتی ہے، آپ یہاں سے فارغ ہو کر آ جانا۔“

پنڈت جی بولے۔ ”ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں، میں یہاں سے فارغ ہو کر ترنت آتا ہوں اور ہاں یاد آیا پہلے میں اس جگہ جاؤں گا جہاں کہ میں نے کنڈل باندھا تھا۔ کئی لوگوں کو میں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں تاکہ یہ پتہ تو چلے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

دیوی ماں اور بھگوان کے پرانتھنا ہے کہ ہم سارے گاؤں والے سکھی رہیں، بھگوان اور دیوی ماں کی کرپا ہمارے سروں پر رہے۔ آپ لوگ دھن راج کے گھر جائیں میں بھی آج جلدی سے مندر سے اٹھتا ہوں۔“ اور یہ بول کر پنڈت جی ترنت اٹھ گئے اور رام لال جی سے بولے۔ ”رام لال تم یہیں رہو، اور دیکھ بھال کرنا، میں چند لوگوں کے ساتھ کنڈل والی جگہ پر جا رہا ہوں۔“

یہ بول کر پنڈت جی اٹھے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”پر تاب تم بھی ہمارے سنگھ چلو۔“ اور پھر انہوں نے چار آدمیوں کو اور بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔

”جی پنڈت جی! چلیں میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا اور پھر ہم لوگ پنڈت جی کے پیچھے چل پڑے، ہم سب چلتے چلتے اس سڑک پر پہنچ گئے، جہاں کہ میں نے آتے سے دیکھا تھا کہ کئی ترشول تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گڑے پڑے تھے۔

پنڈت جی اور دیگر لوگ اس جگہ کو حیران کن لگا ہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پنڈت جی کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ بہت زیادہ بیاہل ہیں۔ انہوں نے دو دو جوانوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم لوگ ذرا کھیتوں میں جا کر دیکھو!

کہیں کسی نے ترشول اکھاڑ کر کہیں پھینک تو نہیں دیا اور اگر ایسا ہوا ہے تو یہ کس نے کیا، ایسا ہونا تو نہیں چاہئے تھا، اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ یہ ترشول یہاں پر کیوں گاڑے گئے ہیں۔ میرا من بہت گھبرا رہا ہے۔ تم لوگ جلدی سے کھیتوں میں دیکھو۔“

پنڈت جی کی بات سن کر کئی لوگ دوڑتے ہوئے سڑک کے اطراف کھیتوں میں چلے گئے۔ ترشول دیکھنے کے لئے۔

پنڈت جی! بہت زیادہ بیاگل تھے، بار بار اپنا ہاتھ ماتھے پر مارتے اور مٹھیاں میچھ لیتے تھے تھوڑی دیر میں ہی وہ سارے لوگ جو کہ کھیت میں ترشول ڈھونڈنے گئے تھے بھاگتے ہوئے آئے اور بولے۔ ”پنڈت جی! اس طرف تو کوئی بھی ترشول موجود نہیں۔“

یہ سن کر پنڈت جی اور بھی زیادہ گھبرا گئے اور بولے۔ ”لگتا ہے کہ کسی موالی نے یہ ترشول اکھاڑ کر بیچ دیا ہوگا اور یہ یقیناً کسی نشہ کرنے والے نے ایسا کیا ہوگا۔“

پر شاد تو رنت چلا جامندر میں، رام لال سے کہنا کہ پنڈت جی نے موٹا دھاگے کا جو بنڈل پڑا ہے اسے منگایا ہے۔“ یہ سن کر وہ نوجوان جس کا نام پر شاد تھا۔ اس جگہ سے گاؤں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد پنڈت جی ایک آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور اشوک پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ جو وہاں موجود تھے پنڈت جی کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ آم کے درخت کے نیچے اچھا خاصا سایہ تھا۔

پر شاد جو کہ موٹا دھاگہ لینے مندر میں گیا تھا۔ فوراً بھاگا ہوا آیا اور دھاگے کا بنڈل پنڈت جی کو دیا۔ پنڈت جی اٹھے اور ایک سے بولے۔ ”آم کے تھوڑے پتے توڑو۔“ ایک نوجوان فوراً آم کے درخت پر چڑھ گیا اور پتوں کی ایک بٹی توڑ لایا۔

پنڈت جی اشوک پڑھتے ہوئے دھاگے میں گرہ لگاتے اور پھر اس گرہ میں آم کا ایک پتہ کس کر باندھ دیتے۔ اس طرح پنڈت جی نے دھاگے کا پورا بنڈل کام میں لے لیا۔ پھر وہ بولے۔ ”اب اس دھاگے کو درخت

جائے کیا سوچتے ہوئے چاروں اس کے سینے تک میچھ دی۔ اوہ بھگوان۔ دھن راج کا چہرہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو۔ سفید پڑا چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں جو کہ دہشت زدہ تھیں۔ آنکھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے دھن راج نے مرنے سے پہلے کوئی بہت ہی بھیا تک اور خوفناک چیز دیکھ لی ہو۔

پنڈت جی نے ذرا سر کو اونچا کیا تو واضح نظر آیا کہ اس کے زخروں کے اوپر دو سوراخ موجود تھے اور خون کا قطرہ تک اس کے کپڑوں پر موجود نہیں تھا۔

پنڈت جی بولے۔ ”خونی نے بہت ظلم کیا ہے۔ بے چارے کا سارا خون نچوڑ لیا ہے۔ اس کے جسم میں ایک قطرہ بھی خون موجود نہیں۔“

پنڈت جی اور پھر رات میں کاشی کی بات کہ ”آج وہ پھر آ گیا۔ خونی نے سارا خون نچوڑ لیا۔“ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جو کہ مجھے بچوں کے لگا رہی تھیں۔ میرے دماغ میں سوچ کی آندھی چل رہی تھی۔ بار بار یہی سوال میرے دماغ میں گھوم رہا تھا کہ ”وہ کون ہے جو رات کے اندھیرے میں آ گیا۔“

گھوڑے کے ٹاپوں کی اور گھوڑے کے ہنہانے کی فلک شگاف آوازیں، پانی خونی جس نے دھن راج کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا اور پھر سب سے دہشت ناک منظر دھن راج کے زخروں کے اوپر وہ سوراخ جو کہ واضح تھے۔“

مجھ میں بہت نہیں تھی کہ میں کسی سے یا پھر پنڈت جی سے سوال کر سکوں، کاشی سے بھی میں اس وقت دور تھا، ورنہ میں کاشی ہی سے اس خونی کے متعلق پوچھ لیتا۔ خیر ای سوچ میں، میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

اس جگہ جتنے بھی لوگ موجود تھے سب کے سب خوفزدہ اور سسپے ہوئے تھے۔ خوف اور ڈر ان لوگوں کے چہروں سے واضح نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خونی اب آیا کہ جب آیا اور آتے ہی سارے لوگوں کا خون پی جائے گا۔ کچھ لوگ بھاگ بھاگ دوڑ میں لگے پڑے تھے، کیونکہ

دھن راج کی کریا کرم کرنا تھا۔ تقریباً کوئی دو گھنٹے میں دھن راج کو چتا پر لٹانے کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے، چار پانی پر ڈال کر دھن راج کا آخری دیدار کر لیا گیا اور پھر سب نے دھن راج کا آخری دیدار کر لیا تو چار پانی اٹھا کر مرگٹ کی طرف لوگ چلے اور آوازیں گونجنے لگیں۔ ”رام نامست ہے۔“

دھن راج کے گھر والوں کا رونا چیخنا ناقابل برداشت تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر من کو کلیجہ آ رہا تھا۔ دھن راج کا باپ پنڈت جی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر دھاڑیں مار رہا تھا۔ پنڈت جی اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولے۔ ”راما نند گھبراؤ نہیں، دھن راج کا لہو رائیگاں نہیں جائے گا، اب میں نے سوچ لیا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، اب اس پانی خونی کو چھوڑنا نہیں ہے، ہر حال میں اب اس کا انتہ ہو کر رہے گا، میں نے بہت ڈھیل دے دی، میں کل ہی اپنے گرو جی کے پاس جاؤں گا اور میں گاؤں کی رکھشا کے لئے ان کے پاؤں پڑ جاؤں گا اور یوں گا کہ گرو جی اب کوئی نہ کوئی اپنے گرو جی سے اس خونی سے گاؤں والوں کی جان چھوٹ جائے، اور مجھے امید ہے کہ گرو جی پورے گاؤں والوں کی رکھشا کے لئے ضرور قدم اٹھائیں گے۔“

گاؤں سے نکلے ہی مرگٹ تھا۔ مرگٹ میں چتا تیار تھی۔ دھن راج کو چتا پر لٹا کر اور لکڑیاں رکھ دی گئیں اور پھر کچی چھڑک کر چتا کو آگ لگا دی گئی۔ سارے لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں اور ساتھ ہی سارے لوگ خوف کی وجہ سے سسپے ہوئے بھی تھے۔

مرگٹ سے واپسی پر سارے لوگ اور پنڈت جی دھن راج کے گھر گئے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر سب کے سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں بھی پنڈت جی کے ساتھ واپس آ گیا۔ پنڈت جی بولے۔ ”میتا اب تم اپنے کمرے میں آرام کرو۔ اگر بھوجن کی ضرورت ہو تو کاشی سے کہہ کر منگالینا، کیوں تم گھبرانا نہیں، اب اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے تمہارے سامنے گاؤں میں آنے والے راستے پر کنڈل باندھ دیا

ہے، تم بالکل بھی بیاکل نہیں ہونا، دیوی ماں رکھنا کرے گی، میں بھی چلتا ہوں۔ گری زیادہ ہے۔ ایشان کے بعد میں بھی تھوڑا آرام کر لوں، ویسے تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت پڑے گا مٹی سے منگالیتا۔“ اور یہ بول کر پنڈت جی اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

پنڈت جی کے جانے کے بعد میں بھی ٹڈ حال قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں موندھ لیں۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کاشی کی آواز سنائی دی۔ ”بابو جی! کیا آپ سو رہے ہیں؟“

کاشی کی آواز پر جھٹ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو کاشی میرے قریب بیٹھی یک ٹک مجھے دیکھے جارتی تھی، اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکان تھی۔ پھر وہ بولی۔ ”آپ تھکے ہوئے لگ رہے ہیں، جا کر ایشان کر لیں، میں جوں جوں لگاتی ہوں۔“

میں بولا۔ ”کاشی تم کبہ تو صبح رہی ہو، میں واقعی بہت تھک گیا ہوں، میں ایشان کر کے آتا ہوں، بھوک تو نہیں، بس تم ایک کپ اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ۔“ اور پھر میں اپنے کپڑے لے کر ایشان کے لئے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ایشان سے فارغ ہو کر آ گیا تو جھٹ کاشی ایک کپ گرم گرامر چائے بنا کر لے آئی اور بولی۔ ”بابو جی! چائے حاضر ہے۔ میں نے بہت چاؤ سے چائے بنائی ہے۔ پیتے ہی آپ کی ساری تھکن اڑن چھو ہو جائے گی۔“ اور یہ بول کر وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

میں چائے کی چسکی لینے لگا۔ کاشی بہت ہی دلکش، حسین اور خوب صورت تھی، اس کا کامل سراپا واقعی دیکھنے کے قابل تھا، اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھگوان کے ہاتھوں بنی بنائی لپیر لگی تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔

میں چائے پیتا رہا اور میری آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ کبھی اپنی نظریں جھکا لیتی تھی اور پھر ترنت اپنی جھیل سے بھی گہری آنکھیں جس میں کہ عجیب سی مدھن تھی بڑی اپنائیت اور لگاؤ کے ساتھ مجھے دیکھ لیتی، میری نظروں سے نظریں ٹکراتی ہی پھر سے وہ

اپنی نظریں جھکا لیتی، خیر میں نے چائے پی لی۔ چائے واقعی بہت مزیدار تھی، چائے کیا تھی بلکہ پورا دودھ ہی دودھ تھا، اس نے دودھ جتنی چائے بنائی تھی۔

”کاشی چائے تو واقعی بہت مزیدار ہے، سواو آ گیا، لگتا ہے تم نے بہت من سے چائے بنائی ہے، بولو کیا انعام دوں۔ چائے پی کر ساری تھکن دور ہوگئی۔ اچھا خیر! یہ بتاؤ تم اتنا زیادہ میرا خیال کیوں رکھنے لگی ہو۔ اب تو میرے من میں بھی ہر وقت تمہارا ہی خیال رہنے لگا ہے، میرے من میں تو یہ بھی خیال سرا بھار رہا ہے کہ اگر مجھے یہاں سے جانا پڑا تو میں شاید تمہاری جدائی برداشت نہ کر سکوں۔“

”ایک بات سنو! میرے قریب آؤ۔“ میں نے کہا۔ ”جی کیا بات ہے؟ اور میں تو آپ کے قریب ہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”نہیں اور قریب آؤ، پھر میں وہ بات بتاؤں گا۔ چلو جلدی سے میرے قریب۔۔۔۔۔ اور میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میری بات سن کر وہ فوراً میرے قریب کھسک آئی اور بولی۔ ”چلیں اب بتائیں بات کیا ہے؟“ جب وہ میرے بالکل قریب آ گئی تو میں بولا۔

”اپنی آنکھیں بند کرو۔“ تو جھٹ وہ بولی۔ ”بابو جی! کیا کھلی آنکھوں سے بات نہیں سنی جاسکتی اور بات تو کان سے سنتے ہیں، آنکھوں سے تو صرف دیکھتے ہیں۔“

”ارے بات ہی ایسی ہے، چلو اپنی آنکھیں بند کرلو۔ پھر میں بات بتاتا ہوں۔“ میری بات سن کر اس نے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر لیا، وہ بدستور بے سدھ رہی اور پھر میں جھٹ سے اس کے چہرے پر بھج گیا۔

اور پھر ہڑ بڑا کر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور میرے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا کر بولی۔ ”بابو جی! یہ کون سی بات ہے، اگر کوئی دیکھ لیتا تو۔۔۔۔۔ اور اس نے بات مکمل نہیں کی۔

”اگر کوئی دیکھ لے تو کیا ہوگا۔ وہ یہی سمجھے گا کہ وہ

پر ہی اپنا من بھلا رہے ہیں، اور ویسے بھی تم کسی کا خیال نہ کرنا کرو۔ کیا ہوگا یہی ناں کہ پنڈت جی! مندر سے نکال باہر کریں گے، ارے بہادر بخو، یہ سنار ڈرنے والوں کو اور بھی ڈراتا ہے۔ بہت کم لوگ اس سنار میں ہیں جو دوسروں کو ان کا حق دیتے ہیں، بلکہ وہ لوگ زیادہ خوش ہیں سنار میں جو اپنا حق کسی سے مانگتے نہیں بلکہ وہ حق چھین لیتے ہیں۔“

”بابو جی! میں بہت ابھانگ ہوں، بھلا میں آپ کا پریم کیسے پاسکتی ہوں، کہاں میں دھرتی کی مٹی اور کہاں آپ آکاش پر چلنا چاند، بھلا کبھی آکاش اور دھرتی کا ملاپ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔“

کاشی کی بات سن کر میں چکر ا گیا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ ذہین بھی تھی۔ اس نے جو مثال دی تھی اپنی جگہ اٹل تھی لیکن پھر فوراً میں نے کہا۔ ”آکاش اور دھرتی کا ملاپ تو نہیں ہو سکتا مگر اکثر آکاش سے دیوتا دھرتی پر اترتے رہتے ہیں اور پھر دیوتا کی خوشی سے منٹش کی منو کا منائیں پوری ہوتی ہیں۔ آکاش سے دھوپ کی گری دھرتی میں جتنی آتما ڈال دیتا ہے۔ آکاش سے برستا پانی دھرتی کی پیاں بجھاتا ہے اور پھر یہی پانی منٹش کی نسل کے لئے امرت بن جاتا ہے۔ دھرتی کے سینے میں سے اناج اگتا ہے، جسے کھا کر منٹش زندہ رہتا ہے۔

کاشی میری پرارتھا ہے کہ ایٹور تمہاری منو کا منائیں پوری کریں اور تم پر ہر پل خوشیاں بھجوا کر دیں، کاشی تم ہر سے خوش رہا کرو، میں تمہیں ہنسا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ دیوی ماں کے چہروں میں میرے لئے بھی پرارتھا کیا کرو کہ میرے دکھ جلدی سے ختم ہو جائیں، میں درد کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جاؤں۔ میرے جیون میں بھی سکون آ جائے، میں بھی کبھی ہو جاؤں، اور پھر میرے من میں جوا چھاپہ پوری ہو۔“

”بابو جی! آپ کے من میں کیا ہے؟“ وہ پوچھتی۔ ”کاشی چلو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ میری اچھا ہے کہ تمہارے جیون میں، میں خوشیاں بھر دوں، تمہارے سارے دکھ دور کروں۔“ اور یہ بول کر میں نے

اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے، اور اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں مرکوز کر دیں۔ اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں، اور پھر آنسوؤں کے چند قطرے آنکھوں سے نکل کر اس کے سرخ ہوتے گال پر ڈھلنے لگے۔ اس کے آنسو دیکھ کر میں ترپ اٹھا اور پھر اس کے آنسو اپنی انگلی کے پور پر لے کر اپنی زبان پر رکھ لئے اور جب اس نے مجھے ایسا کرتے دیکھا تو فوراً مسکرانے لگی اور بولی۔

”بابو جی! یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کی خوشی کے لئے اب آنسو نہیں بہاؤں گی۔“ اور پھر جھٹ میں نے اس کی دونوں آنکھیں چوم لیں تو حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور آنکھوں میں مدھن سی جھانک لگی۔ پھر وہ ترنت اٹھی اور بولی۔ ”بابو جی! اب میں چلتی ہوں، کئی کام اور بھی نشتانے ہیں اور پھر رام لال جی آتے والے ہیں، وہ بول رہے تھے کہ میں نے پر تاب سے کچھ باتیں کرنی ہیں، پھر بعد میں آؤں گی۔“

اور یہ بول کر اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور مجھے یک ٹک دیکھتی ہوئی مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ کاشی کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے اس کے خیالوں میں من ہو گیا، چند منٹ بعد میں نے کروٹ بدلی تو اس سے رام لال جی کی آواز سنائی دی۔ ”پر تاب۔“ یہ سننا تھا کہ میں فوراً اپنی جگہ اٹھ بیٹھا۔

رام لال جی بولے۔ ”کیا تم سو رہے تھے؟“ ”سو نہیں رہا تھا، بس بیٹے اور آنے والے سے متعلق سوچ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”پر تاب زیادہ نہ سو جا کرو، بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔ کبھی کبھی منٹش جنموں کے چکر میں بھنس جاتا ہے۔ منٹش بہت کچھ چاہ رہی ہے کچھ نہیں کر سکتا، اگر منٹش کے بس میں ہو تو اپنے لئے سنار کی ساری دولت اور سارے کچھ جمع کر لے اور پھر اس سے کسی ایک کو بھی کچھ نہ دے، مگر یہ سب ایٹور نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، بہت کم لوگ سنار میں لیں گے جو دوسروں کی خوشی

میں خوش ہوتے ہیں، منٹ کا لوبھی من کبھی شانت نہیں رہتا، بس ہر سے اپنے فائدے کے لئے سوچتا رہتا ہے، اگر منٹ کے بس میں ہوتا تو یہ کسی اور کو ایک نوالہ اور ایک گھونٹ جل بھی نہ دیتا۔

”جی پنڈت جی! آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ بس میری آپ سے یہ اچھا ہے کہ میرے لئے دیوی ماں سے پرارتھا کریں کہ میرے کشت جلدی سے ختم ہو جائیں۔“ میں نے کہا۔

”پر تباہ تم گھبراؤ نہیں۔ بہت جلد تمہارے کشت ختم ہو جائیں گے اور تمہاری منو کا منائیں پوری ہوں گی، بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ بڑے پنڈت جی بھی بول رہے تھے کہ بہت جلد پر تباہ خوشی خوشی اپنے گھر چلا جائے گا، اس سے بولنا کہ زیادہ چپتا نہ کیا کرے، یہ بھگوان کی اچھا سے ہوا کہ وہ اس طرف مندر کے سامنے آ گیا، نہیں تو پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا ہوتا، بس جسے بھگوان چاہے اس کے لئے راہ نکال دیتا ہے اور پھر اس کی بھلائی کے لئے کوئی بہانہ بن جاتا ہے۔ پنڈت جی تمہارے لئے بہت زیادہ سوچ فکر میں ہیں۔

گھبرانا اور سوچنا ختم کرو، زیادہ سوچنے سے ایسا نہیں ہوتا کہ سے سمٹ جائیں اور منٹ کے دکھ فوراً ختم ہو جائیں۔“

”پنڈت جی! ایک بات ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو پوچھوں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں! پوچھو، اور میں جانتا ہوں کہ تم کیا پوچھو گے، ویسے بھی پنڈت جی بول رہے تھے کہ تم جا کر پر تباہ کو سجدہ دینا، وہ زیادہ بیکال ہوگا، جو حالات رات میں اور آج دن میں نظر آئے اور پھر سب سے زیادہ خوفزدہ حالات جو دھن راج کے ساتھ پیش آئے۔“

”جی پنڈت جی! یہی بات ہے، اور یہی بات مجھے بہت زیادہ بیکال کر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”پر تباہ! تمہاری بات بالکل صحیح ہے اور بیکال ہونے والی ہے۔ تم اس گاؤں میں نئے ہو اور تمہیں ان حالات کے متعلق بالکل بھی معلوم نہیں کہ ایسے حالات

کیوں پیش آتے ہیں۔“ رام لال نے کہا۔

”جی پنڈت جی! ایسا وہ کون خونی ہے؟ جو رات کے اندھیرے میں آتا ہے، اور اس طرح ظلم و حاکر غائب ہو جاتا ہے۔ اور پورا گاؤں خوفزدہ ہو کر ہم جاتا ہے اور پھر دھن راج کی لاش دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کا سارا خون اس کے گلے میں سوراخ کر کے کسی پائپ کے ذریعہ نکال لیا گیا ہو۔

اور کب سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا کبھی کسی نے کوشش نہیں کی کہ اس خونی کا خاتمہ ہو سکے، یا پھر یہ سب کچھ گاؤں والوں کے بس سے باہر ہے۔

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ سنسار میں ہر کشت، ہر دکھ، ہر ظلم کا کوئی نہ کوئی اپنا ہے ضرور ہوتا ہے، اور اس کے لئے لوگ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کسی بھی جان لیوا دکھ سے جان چھوٹ جائے۔“ میں نے کہا۔

”پر تباہ! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اور تم نے ٹھیک سوچا ہے، سنسار میں ہر کشت کے خاتمہ کے لئے اپنا ضرور ہوتا ہے اور اس کا بھی اپنا ضرور ہے۔ اب میرا خیال ہے کہ بہت جلد اس خونی سے گاؤں والوں کی جان چھوٹ جائے گی، پنڈت جی نے اب سوچ لیا ہے کہ وہ اپنے گرد جی سے کہہ کر اس خونی سے چھکارا حاصل کریں گے۔

پر تباہ یہ بہت بڑی بات ہے۔ آج کل جو یہ خونی بنا ہے۔ یہ ایک زمانہ میں بہت ہی ملنسار، ہنس کھ، دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والا، جب بھی کسی کو کشت میں دیکھتا تو اس کا دل تڑپ اٹھتا، اور جب تک دکھی کا دکھ ختم نہ ہو جاتا، وہ کھ سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اگر روپے پیسے کی ضرورت نہ ہوتو اپنے لیے سے خرچ بھی کرتا تھا۔

وہ اپنی دنیا میں خوش اور گن رہتا تھا، کسی کے لہجہ دے میں بھی ناگنگ نہیں اڑا تھا۔ دوستوں کا دوست اور ظالم سے نفرت کرتا تھا۔ جوان ہوا اس کے پتا نے بڑی چاؤ سے اس کا دیواہ کیا۔

سارا گاؤں ایک ہفتہ تک جشن مناتا رہا، پورے ہفتہ گاؤں کے سارے لوگ اس کے دوار کھاتے پیتے

رہے، خیر خوشی خوشی اس کے گھر رہن آ گئی۔

وقت سے دن رات گزرنے لگے، نو مہینے بعد ایٹور نے اسے چندر ما کو شرماتی ایک بچی سے خوش کر دیا، بچی کو دکھ دیکھ کر اس کے پر یوار خوش رہنے لگے۔ وہ بچی بھی اتنی سندھ کہ اگر اس پر آنکھ پڑ جاتی تو اس پر سے آنکھیں پڑتی تھیں۔

انہی دنوں اس کا من سنسار کے کاموں سے اچاٹ ہونے لگا۔ اس کا من چاہا کہ سنساری بن جائے مگر لوگوں اور اس کی اپنی چچی اور گھر والوں کے سمجھانے پر اس نے خود کو سنسار کے کاموں سے الگ کر لیا اور دھیان گیان میں لگ گیا۔

بڑے بڑے دھیانی گیانی اور گرو قسم کے لوگوں کے چرنوں میں بیٹھنے لگا۔ تمام گیانی لوگوں نے اس کی بہت مدد کی، اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مقرر بنز اور بھی چیزوں میں وہ آگے ہی آگے جانے لگا اور پھر وقت آیا کہ وہ ایک بہت بڑا گیانی بن گیا۔

سے پر لگا کر اڑتا رہا۔ اس کا نام گوپی تھا۔ اس کی پتری جس کا نام انہوں نے چندر بھی رکھا تھا۔ جیسے جیسے چندر بھی بڑی ہوتی رہی ویسے ویسے سنسار کی ساری خوبصورتی اس میں کھتی رہی۔ ابھی کم عمر ہی تھی کہ لوگوں کی آنکھوں میں بس گئی تھی۔

گوپی کو گھربار سے کوئی واسطہ تو تھا نہیں، وہ ہر وقت گیان دھیان میں لگا رہتا تھا، اس کے پاس ایک بہت ہی خوب صورت اور لاکھوں میں ایک کا لے رنگ کا گھوڑا تھا۔ قرب و جوار بلکہ اس پورے علاقے میں اس کے مقابلے کا کوئی اور گھوڑا نہیں تھا۔ گوپی جہاں بھی آتا جاتا، اس گھوڑے پر سفر کرتا تھا۔

گھربار سے اس کی دوری یوں تھی کہ گھربار کی فصدوری اس پر نہیں تھی۔ اس کے پتا کی اتنی زمینیں تھیں کہ گزرا رہ بہت ہی ٹھٹھاٹ باٹ سے ہوتا تھا۔ گوپی کی چچی بھی بس یوں سمجھو کہ ایک بکری کی مانند تھی۔ یعنی سیدھی سادی۔ وہ بھی اپنے پتی کے اچھا میں خوش تھی۔ گوپی کا جب بھی دل چاہتا اپنے گھر والوں سے ملنے

کے لئے آ جاتا تھا۔

مگر ایک بات ضرور تھی کہ وہ اپنی پتری چندر بھی سے بہت پیار کرتا تھا۔ اسے چندر بھی سارے سنسار سے بڑھ کر پیاری تھی بلکہ کبھی کبھی وہ بولتا کہ ”میرا پران چندر بھی میں الگا ہوا ہے۔ اگر کسی نے چندر بھی کو کسی آنکھ سے بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھیں نکال کر جیل کوؤں کو دے دوں گا۔“ چندر بھی بھی اپنے پتا کو اپنی جان سے بڑھ کر چاہتی تھی۔

سے کی کا انتظار نہیں کرتا، سے کا چکر ہر پل چلتا رہتا ہے، اور پھر وہ سے بھی آ گیا جب چندر بھی جوان ہو گئی۔ چندر بھی جوان کیا ہوئی کہ نو جوانوں کی آنکھوں سے نیند روٹھ کر نہ جانے کہاں جا بسی۔ چاہے وہ گاؤں کا جوان ہو یا پھر قرب و جوار کے کسی اور گاؤں کا، سب ہی آئیں بھرتے نظر آتے تھے۔

جسے دیکھو ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں چندر بھی کے راستے میں کسی نہ کسی بہانے کھڑا ملتا، چندر بھی زیادہ تر اپنی سہیلیوں کے ساتھ بچھٹ بھرتی یا پھر آم کی گھیا میں جھولا جھولنے کے لئے جایا کرتی تھی اور پھر گھنٹوں ساری سہیلیاں مل کر آم کے باغ میں اوڑھم چوڑی بچایا کرتی تھی۔ انہی دنوں گاؤں کے ٹھا کر صاحب کا دیہانت ہو گیا۔ وہ سورگ باشی ہو گئے۔ ٹھا کر صاحب کے بعد ان کا سب سے بڑا بیٹا چندر اپنے پتا کی گدی پر بیٹھا۔ وہ بہت ہی لچر، بد معاش، دشت، اوباش اور گندے من کا منٹ تھا۔

گاؤں کی جوان تاریوں سے اکثر چپڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا، مگر رات کے اندھیرے میں شراب کباب اور شباب سے دل بہلایا کرتا تھا، اس کے کئی دوست تھے جو کہ اس کے لئے کام کیا کرتے تھے، گاؤں کے لوگ اس کی بچ حرکتوں سے پریشان رہنے لگے تھے۔ اگر کوئی اس کے خلاف ہوتا تو راتوں رات کسی نہ کسی بہانے اس کا صفایا کر دیتا، یا پھر تھانیدار سے مل کر اسے کسی کیس میں پھنسا دیتا تھا۔

اکثر تھانیدار اس کے ڈیرے پر آتے جاتے نظر

آتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ اچھا ہوگا کہ گاؤں کا ہر آدمی اس سے پریشان تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگوں نے گوپی سے شکایت کی کہ نیا ٹھاکر چندر اوجھے مزاج کا آدمی ہے، تم اپنے گیان دھیان سے اسے لگام ڈالو۔

مگر وہ جواب دیتا کہ ”جو جیسا کرے گا وہ ویسا ہی بھوک بھوگے گا، میں کیوں خواہ خواہ کسی کا خون اپنے سر لوں، البتہ شوریہ کیا ہے، البتہ شوریہ جانے۔“

اور پھر ایک وقت آیا کہ چندر ایک بہت ہی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو گیا، بیماری ایسی تھی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

رات کا اندھیرا پھیلنے ہی اس کی بیماری زور پکڑ جاتی، پورے شہر میں درد پھیل جاتا، اور پھر سب سے زیادہ درد اس کے سر کو جکڑ لیتا۔ درد کی وجہ سے وہ جانوروں کی طرح ڈکرانے لگتا، بلکہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پھلی کو پانی سے نکال کر باہر رکھ دیا گیا ہو۔

بڑے بڑے حکیم، وید، سادھو، جوگی اور سنیا سی آئے مگر کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کی بیماری کا علاج کرتا، رات بھر وہ تپتا رہتا تھا، اور صبح ہوتے ہی اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں، اس پر نیند سوار ہو جاتی، وہ بے سدھ ہو کر پکی زمین پر پڑ جاتا، نہ اسے بھوک لگتی اور نہ ہی پیاس لگتی تھی۔ اور پھر رات کا اندھیرا پھیلنے ہی اس کی ساری نیند غائب ہو جاتی تھی اور درد میں ناقابل برداشت اضافہ ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ تم گوپی سے رابطہ کرو، تم نے اتنے وید، حکیم اور گیانی لوگوں سے اپنی بیماری کا علاج کرایا، ایک بار گوپی سے بھی مل لو، ویسے تو گوپی ہر سے اپنے گیان دھیان میں لگا رہتا ہے، اگر اس کے آگے گزرا یا جائے تو شاید وہ تم پر ایک نظر ڈالے۔

لوگوں کی باتوں کا چندر پر شاید اثر ہو گیا اور ویسے بھی مرنا کیا نہ کرتا کے مطابق، اس نے کئی لوگوں سے کہا کہ ”ٹھیک ہے، تم لوگ گوپی سے رابطہ کر کے دیکھ لو“ اور اس کے لئے اس نے ان لوگوں کی فہمی بھی گرم کی، وہ لوگ گوپی کی کھوج میں لگ گئے اور گوپی تھا کہ کسی کو لے کے نہیں

دے رہا تھا۔ جتنے لوگ اسے کھوجتے اتنے ہی وہ لوگوں کی نظروں سے اجڑ رہے لگا۔

لیکن لوگوں کو یہ ضرور پتہ تھا کہ کسی نہ کسی سے کئی دن بعد گوپی اپنے گھر والوں سے ملنے آتا ضرور ہے، اور پھر زیادہ تر وہ اپنی پتری چندر کھی سے تو زیادہ دن دور نہیں رہ سکتا، ویسے بھی گوپی زیادہ سے زیادہ تین دن اپنی پتری کو دیکھے بنا سے بتا دیتا تھا اور چونکہ وہ دن رات کے اندھیرے میں ضرور آتا تھا، اور اپنے گھر والوں، چتی اور پتری چندر کھی سے مل کر رات سے ہی نہ جانے کہاں کہاں غائب ہو جاتا تھا۔ وہ آتا بھی اپنے گھوڑے پر اور جاتا بھی تو اپنے چیتے گھوڑے پر، گھوڑے کا نام اس نے شکتی رکھا تھا۔

لوگ اس کے ٹوہ میں لگ گئے۔ لیکن پھر بھی وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ آخر تھک بار ٹھاکر کے گھر کی چند عورتیں گوپی کے گھر پہنچیں اور اس کی چتی اور پتری چندر کھی کے آگے گزرا گئے۔

چندر کھی نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ”آپ لوگ شانتی سے جائیں۔ پتا جی جب بھی آئے تو میں ان سے بولوں گی اور مجھے امید ہے کہ وہ میری بات ضرور مانیں گے۔“ چندر کھی اور اس کے گھر والے بہت خوش تھے اس لئے کہ ٹھاکر گھر ان کی عورتیں ان کے گھر آئی تھیں۔

خیر تین دن بعد گوپی رات سے آ گیا۔ اس کے گھر والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پیار و محبت کی باتوں سے جب دل بھر گیا تو چندر کھی نے اپنے پتا کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ”پتا جی! بس میں پچھنچیں جانتی۔ آپ کو میری ایک بات ماننی پڑے گی، اور آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ میری بات ضرور مانیں گے، اور اگر آپ نے میری بات اور میرے وعدے کا پاس نہ رکھا تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ ہر حال میں آپ نے میری بات رکھنی ہے، ورنہ میں جھوٹی پڑ جاؤں گی۔“

”اچھا میں وعدہ کرتا ہوں، تیری بات رکھ لوں گا، اور اس سے انکار نہیں کروں گا، یہ میرا پکا وعدہ ہے، اپنی لاڈلی کا کام کر کے مجھے بہت خوش ہوگی۔ اتنی عمر ہونے تک صرف ایک بار زبان کھولی ہے، تیرا پتا اپنی جان پر

کھیل کر بھی تیری بات رکھے گا۔“ گوپی بولا۔

”تو پتا جی! آپ نے ٹھاکر چندر کھی کا علاج کرنا ہے، اور ہر حال میں یہ کام کرنا ہے، میں نے ان کی چتی سے وعدہ کر لیا ہے، وہ ہمارے گھر آئی تھیں۔ بس میں نہیں جانتی۔ یہ کام آپ نے کرنا ہے۔ میری خوشی کی خاطر، ورنہ میں ان کے سامنے جھوٹی پڑ جاؤں گی۔“ چندر کھی نے ہاتھ کے گلے میں اپنی پانی نہیں ڈال کر بڑے لاڈ سے کہا۔ چندر کھی کی بات سن کر گوپی سوچ میں پڑ گیا، اس نے اپنی گردن نیچے کر لی، سر جھکا لیا، نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا، کہ اتنے میں پھر چندر کھی بولی۔ ”پتا جی! کیا سوچ رہے ہیں؟“

”اچھا پتری! تیری بات میں روئیں ہونے دوں گا، تو جھوٹی نہیں پڑے گی، پتری تو نہیں جانتی وہ ٹھاکر چندر کھی خصلت کا منش ہے، وہ لوگوں کی عزت کا دشمن ہے۔ خیر فلاں سے میں آؤں گا۔ اور جو کچھ بھی دوں، اسے اس کی چتی کے حوالے کر دینا، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اور پھر بولا۔ ”میں اپنی لاڈلی کی بات نہ مان کر کیا جیوت رہ سکتا ہوں۔“ اور یہ بول کر اپنے گھوڑے شکتی پر بیٹھا اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دن ٹھاکر کی چتی آئی تو چندر کھی نے خوشخبری دی کہ ”پتا جی نے میری بات رکھ لی ہے، آپ فلاں دن آ کر دوا لے جانا۔ ٹھاکر صاحب ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اور پھر اس رات جس کے لئے اس نے وعدہ کیا تھا گوپی آ گیا، اس نے چندر کھی کے حوالے ایک بڑی سی پڑیا کی، پڑیا میں کوئی سفوف تھا۔ اس نے کہا۔ ”چندر کھی جب اس کی چتی آئے تو یہ دوا دے دینا، اس میں سے آدھا وہ تین دن تک کھائے اور تین دن ہی یہی سفوف اپنے بدن پر مل لیا کرے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

چندر کھی بولی۔ ”پتا جی میری بات رکھ کر آپ نے میرا مان بڑھا دیا، ایک ہفتہ سے کئی لوگ آپ کو ڈھونڈنے پر لگے تھے، پتا جی! آپ بہت مہمان ہیں۔ کل وہ آئیں گی تو یہ پڑیا میں انہیں دے دوں گی۔“ اور پھر اس کے بعد دیگر

باتیں ہونے لگیں۔

دوسرے دن ٹھاکر کی چتی آئی تو چندر کھی نے وہ دوا کی پڑیا، اس کے حوالے کر دی اور سمجھا دیا کہ دوا کس طرح استعمال کرنی ہے، خیر ٹھاکر نے تین دن دوا استعمال کی اور بھلا چنگا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے گھر والے تو گوپی کو مان گئے، اور پھر چندر کھی کو گلے لگا کر بہت بہت پیار کیا۔ پھر اس کے بعد تو ایسا ہوا کہ بڑی ٹھاکر ان اور چندر کی چتی چندر کھی کے نام کی بالا چنے لگیں۔ وہ ہر روز اپنی نوکرانی کو بھیج دیتیں اور چندر کھی کو اپنے گھر بلا لیتیں۔

شروع شروع میں تو چندر کھی نے ان کے گھر جانے سے انکار کیا مگر جب بڑی ٹھاکر ان بہت ضد کرنے لگی تو ایک دن گوپی بولا۔ ”ٹھیک ہے پتری! کھار چلی جایا کر، مگر یہ خیال رکھنا، زیادہ جانا ان کے گھر ٹھیک نہیں، یہ ٹھاکر لوگ کھی کسی کے من نہیں ہوتے، اگر یہ کسی کو اچھا جانتے بھی ہیں تو صرف اور صرف اپنے مطلب کے لئے۔ ٹھاکر لوگ اپنے علاوہ سب کو بہت بچ بچتے ہیں۔ بس یہ اپنے مطلب کے لئے۔“ اور گوپی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

ٹھاکر چندر، چندر کھی کو چوبلی میں آتے جاتے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ چندر کھی کی جوانی ایسی تھی کہ اس کے لئے شاید منش کے پاس تعریف کے الفاظ نہ ہوں۔ کسا کسا گد ریا ہوا شر، مست جوانی کی چال، چولی اور چندری میں تو اپسرا لگتی تھی۔

چندر کھی کو دیکھ کر چندر کا اور بھی من مچلنے لگا۔ چندر کھی کی وجہ سے وہ اپنا کچھ چھین کھو بیٹھا۔ اس ظالم نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ یہی چندر کھی ہے جس کی وجہ سے مجھے نیا جیون ملا ہے، اس کا باپ کیا سوچے گا اور پھر یہ میرے لئے اپنے دل میں کس قدر نفرت رکھ لے گی۔

اب وہ تاک میں رہنے لگا کہ جب بھی چندر کھی چوبلی میں جاتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے چندر کھی کے سامنے آ جاتا اور بڑے پیار بھرے لفظوں میں چندر کھی کی تعریف کرتے تھکنا نہیں تھا۔ وہ اکثر بولتا۔ ”چندر کھی تو میرے لئے دیوی سمان ہے، تو نے مجھے نیا جیون دلایا۔“

میں مرتے دم تک تیرا مان بڑھتا رہوں گا۔ جس چیز کی بھی ضرورت ہو اس کو جی سے لے جاسکتی ہے۔ تو جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گی وہ چیز تیری ہو جائے گی۔ اگر تو یہ جی بھی مانگ لے تو یہ بھی میں تیری جھولی میں ڈال دوں گا۔ میں تیرے پتا کا بھی احسان مند ہوں، گوئی میرے لئے بھگوان سے کم نہیں، میں علاج کرا کر اے تھک گیا تھا، میں جس کشت میں تھا اس تکلیف کو اب بھی سوچتا ہوں تو سہم کر رہ جاتا ہوں۔ جس دن بھی گوئی مجھے نظر آ گیا تو میں اس کے چروں میں بیٹھ کر اس کا جوتا اپنے سر پر رکھ لوں گا۔ چندر کھی تو شریک ہی اچھی نہیں بلکہ من کی بھی بہت مہمان ہے، تو نے میرا درد محسوس کرتے ہوئے اپنے پتا کو علاج کے لئے راضی کیا، میں تجھے پرنام کرتا ہوں۔“

لیکن چندر کے سن میں ایک کھٹکا تھا اور وہ کھٹکا تھا گوئی کی موجودگی، وہ سمجھ چکا تھا کہ کسی بھی حال میں گوئی اسے نہیں چھوڑے گا اگر اس نے چندر کھی کے ساتھ کوئی گری ہوئی حرکت کی تو اس کے بعد وہ اس اپنے میں لگ گیا کہ ہوا ہے کو کاٹنا ہے۔“

”کیوں نہ میں گوئی کو راستے سے ہٹانے کے لئے کوئی ایسی چال چلوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔“ اور پھر یہ سوچ کر اس نے گوئی کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔

اپنے علاقے اور دو پار کے علاقوں کے پنڈت، سادھو اور گیمانی لوگوں سے ملنے لگا، اس کام کے لئے اس نے تجوری کا منہ کھول دیا۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ دھن دولت کے لئے منٹ اپنا دھرم تک بیچ ڈالتا ہے اور گوئی تو ایک ادنیٰ سا کر پیچھا ہوا گیا ہی تھا۔

سب الگ الگ گوئی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگے۔ چندر اتنا چالاک تھا کہ ایک سے ایک سب کو نہیں بلاتا تھا اور نہ ہی ایک سے ایک سب سے بات کرتا تھا۔

گوئی کے گرد گھیرا تنگ کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے اس کے پیچھے بھٹکی ہوئی آتماؤں کو لگایا گیا، وہ آتماؤں صرف اور صرف اپنا بھینٹ لے کر کام کرنے کی

عادی تھیں۔ آتے جاتے طرح طرح سے اسے کشت پہنچانے کے طریقے آزماتے گئے۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ گوئی بیمار ہو کر چار پائی پر گر گیا۔

لیکن ظالم، چالاک اور لکھی چندر اوپر اوپر سے گوئی کا ہمدرد بنا رہا، گوئی کے نہ مانگنے پر بھی ہزاروں روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیتا، ضرورتوں کا خیال رکھنے لگا۔ لیکن اندر ہی اندر گوئی کی جڑیں کاٹ رہا۔

چندر کا کرپا ہوا آئے دن کا جادو، سر چڑھ کر بولنے لگا۔ گوئی کی طاقتیں کم ہونے لگیں اور پھر ایک رات ایسا ہوا کہ دن سے ہی بوند باندی شروع تھی، وقفے وقفے سے ایسی بجلی کڑکی کہ لوگوں کا دل دھل جاتا، پورے گاؤں پر اندھیرے کا راج تھا، ہر کوئی اپنے گھر میں دبکا پڑا تھا، گاؤں میں تو ایسے بھی بجلی نہیں ہوتی۔

رات سے چار بجے کئے جوان گھر میں داخل ہوئے اور چندر کھی کے منہ پر زبردستی کپڑا لپیٹا اور پھر اسے اٹھا کر لے گئے۔ چندر کھی کی آواز سن کر گوئی دوڑا مگر ایک نے اس کے سر پر ایسا لٹھ مارا کہ وہ تورا کر گر پڑا۔

گوئی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ چندر کھی کا کہیں بھی پتہ نہ تھا۔ گاؤں کا ہر منٹ اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر چندر کھی کو ڈھونڈتا رہا مگر چندر کھی کسی طرح نہ مل کے دی۔

اور پھر ایک رات ایسا ہوا کہ گوئی کے گھر کو آگ لگ گئی، آگ اس قدر زور کی تھی کہ اس گھر میں کوئی بھی نہ بچ سکا۔ گھر کے چاروں اور آگ ہی آگ تھی، ایسا لگتا تھا کہ کچھ لوگوں نے مل کر منصوبے کے تحت پورے گھر کو آگ لگا دی تھی، گوئی، گوئی کے ماتا پتا، بیٹی اور اس کا گھوڑا شعلہ بھی آگ میں جل کر تھم ہو گئے۔

پورا گاؤں دھبی تھا، ہر کوئی کہنے کے عالم میں تھا، گوئی اس کے گھر والے اور پھر چندر کھی کا دکھ لوگوں کے برداشت سے باہر تھا۔

ایک دن گاؤں کے سارے لوگ مندر میں جمع ہوئے اور پنڈت جی سے بولے۔ ”پنڈت جی! ہم گاؤں والوں کا وچار ہے کہ ہم دیوی ماں کے چروں میں بیٹھ کر

اس ظالم اور پائی کے لئے بددعا کریں کہ دیوی ماں جلد از جلد اس پائی کو کشت کر دے، جس نے گوئی اور اس کے گھر والوں اور چندر کھی کے ساتھ ظلم کیا ہے۔“

چونکہ سارے گاؤں والے جمع تھے، لہذا پنڈت جی ان کی بات نہیں ٹال سکتے تھے، لہذا لوگوں کی اچھا کے مطابق دیوی ماں کے چروں میں بیٹھ کر لوگوں نے اور خود پنڈت جی بھی اس ظالم کے حق میں بددعا کر بیٹھے۔

ان دنوں اماؤں کی راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ تیسرے دن اچانک چندر کی وہی بیماری جو کہ پہلے لگی تھی اسی رات ہوئی تھی وہ چیخ و پکار شروع کر دیتا تھا۔ رات سے اس کی چیخیں درد کی وجہ سے پورے گاؤں میں سنائی دینے لگیں۔

تیسرے دن رات میں چندر اپنی حویلی سے باہر نکل گیا۔ وہ اسی طرح درد سے ملہلاتا ہوا چیخ رہا تھا۔ ”بھائو..... بھائو..... ہائے..... ہائے..... ارے کوئی تو مجھے بچائے۔ میں مر رہا ہوں۔ ارے یہ درد میری جان لے کر رہے گا۔“ وہ گاؤں کی گلیوں میں پھرانے لگا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر گاؤں کے لوگ باہر نکل آئے۔ وہ اسی طرح چیختا ہوا مندر کے سامنے پہنچ گیا۔

اچانک مندر کا بند دروازہ کھل گیا۔ مندر میں موجود ساری گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ گاؤں والے مندر میں جتنی گھنٹیوں کی آواز سن کر مندر کے سامنے جمع ہو گئے۔ مندر سے بہت تیز روشنی نکل رہی تھی۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ مندر سے دو روشن سیولے نکلے۔ دونوں سیولے ناریوں کے تھے، ان کے لمبے بال ہوا میں ابرار رہے تھے۔ وہ سیولے آکر چندر کے سامنے رک گئے، پھر کیا تھا چندر کی چیخیں اور بھی بہت زوردار طریقے سے نکلنے لگیں۔ وہ زمین پر لوٹنے لگا، کسی ملہ اسے جکٹن نہیں تھا۔ وہ اٹھتا بیٹھتا اور پھر دھم سے زمین پر گر جاتا۔

اچانک ایک زوردار آواز سنائی۔ ”گاؤں کے لوگو! تم لوگوں کی بددعا نہیں رنگ لے آئیں، تم لوگوں نے میرے چروں میں بیٹھ کر بددعا نہیں کی تھیں۔ اس ظالم

کے لئے جس نے کہ گوئی، اس کا پر پوار اور اس کے گھوڑے کو جلا ہوا تھا، اور پھر یہی نہیں بلکہ اس ظالم نے چندر کھی کو رات کے اندھیرے میں اٹھا کر اس کی عزت لوٹی اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار دیا۔ اسے نیلے کے نزدیک گڑھا کھود کر دبا دیا۔ اس کا ظلم برداشت سے باہر ہے۔ اس کے ظلم پر اٹھ کر کھی دل مسوس کر رہ گیا ہے۔ وہ ظالم کوئی اور نہیں بلکہ یہ چندر ہے۔ اس نے چندر کھی کی عزت لوٹنے کے پھر میں اتنا بڑا ظلم کا جال بچھایا۔ میرے برابر میں چندر کھی کی آتما کھڑی ہے۔

اس مورکھ کا پاپ معافی کے قابل نہیں، یہ لوگوں کے لئے عبرت بن جائے گا، جیون اس سے روٹھ جائے گا، یہ خود اپنے منہ سے موت مانگے گا مگر موت اس کے قریب کھڑی ہوتی رہے گی۔

آپ لوگ نیلے کے پاس سے چندر کھی کا پیچہ نکال کر چٹاکے حوالے کر دینا تاکہ اسے قتل کی جائے۔ اور پھر وہ دونوں سیولے غائب ہو گئے۔

چندر اپنی جگہ کھڑا بیٹھا رہا، جلاتا رہا، اب کوئی بھی اس کی سننے والا نہیں تھا۔ اس کی ماتا جیوت تھی، اس نے لوگوں کے ہاتھ پیر جوڑ کر اتنا کیا کہ کئی لوگ چندر کو پکڑ کر لائے اور ایک چار پائی پر بیٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تاکہ وہ حویلی سے باہر نہ نکل سکے، اور پھر اس طرح وہ ہر رات میں درد کی وجہ سے چیختے لگتا۔ اس کا کوئی اپنے نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کوئی علاج تھا۔

دوسری اماؤں کی راتیں شروع ہو گئیں۔ ایک رات گاؤں والوں نے سنا کہ کوئی گھڑ سوار پوری رفتار سے اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے لارہا ہے۔ وقفے وقفے سے وہ گھوڑا زبردست طریقے سے ہنہناتا بھی تھا۔ اس گھڑ سوار کو کوئی بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

وہ رات بہت اندھیری تھی۔ سارا گاؤں سہما ہوا تھا۔ گھڑ سوار اپنے گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا، اور جب صبح حویلی والوں نے دیکھا تو چندر اپنی چار پائی پر مردہ پڑا تھا۔ اس کے گلے میں دو سوراخ تھے اور اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے پورے جسم سے

خون کا آخری قطرہ تک نہ چھوڑ لیا گیا ہو۔

اس کی لاش کے قریب ہی ایک کاغذ پڑا ہوا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ ”اس پانی کا انت ہو گیا، اب اس کے کارندوں کا بھیا تک انت ہوگا، اس کے بعد بستی کے ہر ایک نو جوان کا انت ہوگا، میں کسی بھی جوان کو جینے نہیں دوں گا، اس پانی نے ہم پر بہت ظلم کیا تھا، اس نے ہمیں زندہ جلا کر مار دیا اور چند لمحے کی عزت لوٹنے کے بعد اسے گلا گھونٹ کر مار دیا اور ٹیلے کے پاس گڑھا کھود کر اس میں دبا دیا۔ میں اس پانی کا پورا پورا ختم کر دوں گا۔“ گوئی۔

کاغذ پڑھ کر گاؤں کے سارے نو جوان ہم کر رہ گئے اور پھر آہستہ آہستہ گاؤں کے نو جوان اپنی جان سے جانے لگے۔ جب بھی اماؤں کی رات آتی تو کوئی نہ کوئی نو جوان اس حالت میں مردہ ملنے لگا۔

گوئی کی آتما جب بھی آتی ہے اسی طرح گھوڑے کے دوڑنے اور ہنپانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ بہت زیادہ ہشتی شالی ہے۔ بڑے بڑے اور مہمان گمانی اس سے مات کھا چکے ہیں، وہ کسی سے بھی نہیں رکنا، اور اس بات کا سارے گاؤں والوں کو معلوم ہے۔ اس کے آنے کی سب سے بڑی پہچان گھوڑے کے دوڑنے اور ہنپانے کی آواز ہے۔

کئی ماہ پہلے بڑے پنڈت جی نے اپنے گرو جی سے کہہ کر اس کا ایک اپنے کر دیا تھا۔ گرو جی نے ترشولوں کے ذریعہ گاؤں میں آنے والے راستے پر کنڈل کر دیا تھا۔ مگر نہ جانے کون ظالم اور پانی ان ترشولوں کو اکھاڑ کر لے گیا۔ ترشولوں کے اکھڑتے ہی اس کا راستہ صاف ہو گیا اور پھر اس طرح وہ گاؤں میں داخل ہو کر دھن راج کا خون پی گیا۔

ویسے پنڈت جی نے عارضی طور پر دھاگے سے کنڈل لگا تو دیا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ اب اس کا مضبوط اور ہمیشہ ہمیش کے خاتمے کا پائے کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے پنڈت جی گرو جی کے پاس جائیں گے اور مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ دورات گرو جی کے استھان پر

رکنا پڑے گا۔

پر تاب تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ گاؤں میں آبادی بہت کم ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے پہلے تو غا کر کے ظلم کی وجہ سے لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے اور غا کر کے بعد گوئی کی آتما نے لوگوں پر ظلم شروع کر دیا۔ جن کی گاؤں میں جبکہ زمین نہیں وہ تو چلے گئے اور جو لوگ گاؤں میں موجود ہیں وہ جدی پڑتی ہیں۔ یہاں ان کے گھر ہیں ان کی زمینیں ہیں، وہ بھلا کہاں جاسکتے ہیں۔

خیر مجھے امید ہے کہ گرو جی اب کی بار ضرور گوئی کی آتما کے لئے کوئی نہ کوئی مضبوط پائے کر دیں گے۔

پر تاب تم ان باتوں پر دھیان نہیں دینا، چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ مندر میں اپنا قدم نہیں رکھ سکتا اور اگر اس نے مندر میں آنے کی کوشش کی تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔

پر تاب اب تم آرام کرو، میں چلتا ہوں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو کاٹنی کو آواز دے کر منگا لیتا۔“ اور یہ تمام باتیں کر کے رام لال جی اٹھے اور کمرے سے نکلے چلے گئے۔

میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور تمام حالات کے متعلق سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی اور جب میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے دیکھا کمرے میں لائین جل رہی تھی۔ یعنی میرے سوتے میں کاٹنی نے لائین جلادی تھی۔ اور مجھے سوتے سے اٹھایا نہیں تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آج کا سارا دن بھاگ دوڑ اور پھر دھن راج کی کرپا کرم میں گزر گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر جا کر ہاتھ منہ دھویا اور واپس اپنے کمرے میں آنے لگا تو اچانک من میں خیال آیا کہ دیکھو تو کاٹنی اپنے کمرے میں کیا کر رہی ہے، میں دروازے پر پہنچا، دروازہ دھکا کھلا ہوا تھا، میں نے جھانکا تو دیکھا کہ کاٹنی دیوار پر لگے آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ میں جھٹ دروازے سے ہٹ گیا اور ترنت اپنے کمرے میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد کاٹنی رات کا بھوجن لے کر

مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھوجن کی تھالی میرے سامنے رکھتے ہوئے خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئی اور مسکراتی ہوئی مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی اسے ایک تک دیکھا کہ اچانک وہ جھینپ گئی اور بولی۔ ”اس طرح کیا مگھور ہے ہیں۔ جب آپ دروازے پر آتی گئے تھے کمرے میں بھی آ جاتے، میں کون سا آپ کو کھا جاتی۔ میں نے آجیے میں آپ کی جھلک دیکھ لی تھی۔ آپ کی نظر مجھ پر پڑے ہی آپ ترنت دروازے کے سامنے سے ہٹ گئے، یہی سچ ہے ناں۔“

”ہاں یہ سچ ہے، میں نے جب دیکھا کہ تم بال سنوار رہی ہو تو میں ترنت پیچھے ہٹ گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں رام لال یا پنڈت جی کی نظر نہ پڑ جائے اور پھر یہ نہیں وہ کیا سوچیں گے۔“

”لیکن میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ آج دونوں پنڈت جی اپنے اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔ رام لال جی اپنے کمرے چلے گئے ہیں، ان کی پھلی مینی کوخت بخار چڑھا ہوا ہے اور بڑے پنڈت جی ساتھ والے گاؤں چلے گئے ہیں، وہاں پر ان کی بہن رہتی ہیں، آج ان کے بڑے بیٹے کا گن ہے۔“

آپ جلدی سے بھوجن کریں اور آرام سے لیٹ جائیں، لیٹنے سے لائین بھادینا، تھوڑا سے ہٹا کر میں، آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ ویسے بھی آج کوئی ڈر نہیں، دونوں پنڈت جی تو ہیں نہیں۔“

”کاٹنی جو تمہارے ساتھ اور تمہیں لڑکیاں ہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی نظر ہم پر پڑ جائے؟“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بابو جی! ہم چاروں اپنے اپنے کمرے کی رانی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کے کمرے میں نہیں جاتا۔ بڑے پنڈت جی کا یہ سخت حکم ہے۔ اور پھر وہ بھی کون سی چھوٹی سوئی ہیں۔ انہیں بھی جب موقع ملتا ہے تو تاک جھانک کرنے سے نہیں چوکتی ہیں۔“

بس ہمارے پاؤں میں بھجوری کی بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ کون سا ہمارا من اندر سے ان حالات میں

خوش رہتا ہے۔ ہمارے سانج میں زبردستی کا یہ روک ٹوک اور بندھن ہم جیسی ناریوں کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ ہم سب مجبور ہیں، ہم کرجی کیا سکتی ہیں۔ اگر زبان کھلتی ہے تو وہ سانج سے بغاوت ہوگی اور زبان بند رہتی ہے تو ہم اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں۔

اور ہاں ایک بات ہے جب کوئی ہم میں سے کسی کو مانگ لیتا ہے تو اسے خوش خوشی جانے دیا جاتا ہے، لیکن اس کا دیواہ کر کے چاہے وہ ہمارے گاؤں کا ہو یا پھر کسی اور ہی گاؤں کا کیوں نہ ہو، اس گاؤں میں اس کی آزادی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے اس صورت میں کہ جب بڑے پنڈت جی اس ناری سے خوش ہوں اور دیواہ کرنے والا بڑے پنڈت جی کی کھٹی زیادہ گرم کر دے۔

اچھا بابا اب باتیں بہت ہو گئیں، اب جلدی سے بھوجن کریں، زیادہ دیر تک گانے پر نہیں نیند نہ آ جائے، اور جاتے سے رام لال جی بول گئے تھے کہ اپنے اپنے کمروں کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیتا۔“

کاٹنی کی باتیں سننے کے بعد میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر انہیں چوم لیا اور پھر بھوجن کے لئے نوالہ بنانے لگا۔ میں نے نوالہ بنایا اور مسکراتے ہوئے پہلا نوالہ کاٹنی کے منہ میں رکھ دیا۔ وہ بھی مسکراتی ہوئی نوالہ چبانے لگی۔

آج وہ بہت سندر لگ رہی تھی۔ میں نے اسی طرح اسے آدھی روٹی کھلا دی۔

جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو اس نے برتن اٹھائے اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ہاتھ منہ دھو کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اور لیٹنے سے پہلے لائین کو بھٹانا بھولائیں تھا۔ بستر پر لیٹ کر میں اپنے کرم کے متعلق سوچنے لگا۔ میں کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ آج میں اپنے آبائی گاؤں سے ہزاروں میل دور پڑا تھا۔ میرے پر یوار کے کسی بھی فرد کو میرے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ میری اچانک غیر موجودگی پر ان کے دل پر کیا گزری ہوگی، یہ تو وہی جانتے ہوں گے، میں اس طرح کے خیالوں میں الجھا

رہا، ایک گھنٹہ گزرنے سے پہلے ہی۔

دبے قدموں کا سنی کمرے میں آگئی اور میرے قریب بیٹھ کر بولی۔ ”بابو جی!“

اس کی آواز کا سننا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں لٹا لیا۔ وہ خاموشی سے بغیر کسی چوں چرا کے میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ اس کے جسم کی سوندھی سوندھی خوشبو میرے دماغ کو معطر کرنے لگی۔ پھر اس نے میرے بازو پر اپنا سر رکھ دیا۔

”کاشی!“

میں سرگوشی میں بولا۔ ”جی!!“ وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

”کاشی تمہیں اندازہ ہے کہ میں تمہیں کتنا چاہنے لگا ہوں۔“ میں بولا۔

”جی! مجھے اس کا اندازہ ہے کہ آپ مجھے خود سے بھی زیادہ چاہنے لگے ہیں اور ہر عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ مرد کی نظر کو پہچان لیتی ہے اور صحیح اندازہ لگاتی ہے کہ سامنے والے کے دل دماغ میں اس کے لئے کتنی جگہ ہے۔“ وہ دوبارے الفاظ میں بولی۔

”کاشی تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو، میں تمہیں اپنی ذات سے بھی بڑھ کر چاہنے لگا ہوں اور اب تمہاری جدائی مجھے مار دے گی اور اگر تم مجھ سے دور ہو گئی تو شاید میں اپنا جیون تیاگ دوں۔“

یہ سنتے ہی جھٹ اس نے اپنی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ دی اور بولی۔ ”بھگوان نہ کرے آپ کے ساتھ ایسا ہو، اور اگر ایسا ہوا تو آپ سے پہلے میں اپنا جیون ختم کر لوں گی، بابو جی! آپ میری پہلی چاہت ہیں اور یہ بھی عورت کی فطرت ہے کہ عورت جسے سب سے پہلے چاہے۔ زندگی بھر اس کی چاہت اس کے من سے نہیں نکلتی۔ چاہے کسی بھی مجبوری کے تحت ان میں دوری ہو جائے، چاہے وہ گھر بار اور بچوں والی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ بھی عورت کی فطرت میں شامل ہے کہ اپنی پہلی چاہت کا پھانسل دل میں لئے ساری عمر بتا دیتی ہے اور کبھی اس کا اظہار کسی سے نہیں کرتی۔

بابو جی! کبھی مجھے آکسیل نہیں چھوڑ جانا، نہیں تو یہ کاشی چتر پریلٹا خوشی قبول کر لے گی۔“

اس کی یہ بات سن کر میں تڑپ اٹھا اور اس کے ہونٹ پر اپنی انگلی رکھ دی اور بولا۔ ”آئندہ ایسی بات زبان پر نہیں لانا، میں تمہیں کسی بھی صورت میں چھوڑوں گا، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ جب بھی میں گیا تو صرف چند دن کے لئے ہی جاؤں گا اور پھر ترنت واپس آ کر تمہیں سب کے سامنے دلین کے روپ میں منڈپ میں سات پھیرے لگا کر دھوم دھڑلے سے لے جاؤں گا۔“

میری بات سن کر کاشی نے اپنا سر ذرا اوپر کواٹھایا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے پھر سرگوشی میں بولی۔ ”بھگوان کرے جلدی سے ایسا ہو جائے۔“

”کاشی ایسا ہی ہوگا، اب میرے جیون کا مقصد تمہاری چاہت و خوشی میں ہے، اگر تم نہیں تو میرا جیون بے کار ہے، میں تمہاری خاطر سارے سنسار سے نکرا جاؤں گا۔“

کاشی کی قربت نے میرے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں بولتا رہا، وہ سنتی رہی، اور وہ ہوتی رہی میں سنتا رہا۔ مگر کسی ایک کی بھی بات دماغ میں جگہ نہیں بناری تھی۔ قربت قربت اور بھی زیادہ قربت ہو رہی رہی، سمندر کے سکوت میں ٹھہراؤ ختم ہونے لگا، سرکش ہوا میں، سمندر کی خاموش لہروں کو چھیڑنا شروع کر دیا، لہروں نے سر اٹھارنا شروع کر دیا اور پھر آہستہ آہستہ طوفانی جھکڑوں نے سمندری لہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تو لہر بس بے قابو ہو کر ناقابل برداشت ہو گئیں، سرکش اور پھیری ہوئی لہروں کو دیکھ کر ہمارے جذبات انگڑائی لینے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہم اتھاہ گہرائی کے گرداب میں غوطہ زن ہو کر ہوش سے بیگانہ ہو گئے۔ اور پھر ایک وقت آیا کہ ہم بے بسدی چھا گئی۔

ہم دونوں پر اپنی نظریں ڈالے گے گزرتا رہا، ابھی تک ہماری سانسوں میں ٹھہراؤ نہیں آیا تھا۔ آنکھیں بوجھل اور دل کی رفتار قہقہہ تھیل تھی۔ اس طرح نہ جانے اور کتنا سے بیت گیا کہ اچانک کاشی کی آواز میرے کانوں

میں بڑی۔ ”بابو جی! میں جارہی ہوں تھوڑی دیر میں صبح کا اجالا پھیل جائے گا، اب آپ آرام کریں۔“ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے گالوں پر لگائے اور پھر خاموشی سے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں تو بس اس کے خیالوں میں مدھوس تھا۔ کب اجالا پھیلا، کب صبح ہوئی، میں نہ جان سکا۔

صبح سات بجے کاشی نے مجھے جگایا۔ میری آنکھ کھلی تو اس کا مسکراتا ہوا دلکش چہرہ نظر آیا۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔ ”دونوں پنڈت مہاراج آگئے ہیں۔ آپ جلدی سے اٹھ کر اشنان کر لیں، پھر میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں۔“

کاشی کا کھٹکا ہوا ترنوازہ دلکش اور حسین چہرہ دیکھ کر میں بھی کھل اٹھا۔ اور پھر اچانک ایک مشہور شاعر کی غزل میرے دماغ میں آگئی۔

محسوس ہو رہی ہے تنہائی گزرا نہیں تیرے بغیر
کوئی ساتھی بھی نہیں میرا سہارا نہیں تیرے بغیر
روشن گشتاں زینت جہاں تو بہت دیکھی
کوئی اور من کو بھاتا نظارہ نہیں تیرے بغیر
کیونکہ زمانے والے ہم کو اپنا سمجھ بیٹھے
کوئی اور اس جہاں میں ہمارا نہیں تیرے بغیر
شمانہ زندگی میں نے تیرے نام لکھ دیا
اب کوئی عنوان کوئی شمار نہیں تیرے بغیر

میں انہی اشعار میں کھویا پڑا تھا کہ وہ بولی۔ ”بابو جی کہاں کھو گئے، پنڈت جی آگئے ہیں، جلدی سے جا کر اشنان کر لیں، کیا اٹھنے کو کئی نہیں چاہ رہا ہے، کیا آج صبح بھدلی ہو گئی، میں جارہی ہوں رام لال جی آواز نہ دے بیٹھیں۔“

اور پھر جھٹ وہ کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں تو بس اس کے خیالوں میں اپنا سہارا بدھ کھو بیٹھا تھا۔ لیکن پھر میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا، کپڑے سے اشنان کے لئے چل پڑا۔

جلدی جلدی اشنان سے فارغ ہو کر کمرے میں آ گیا۔ ابھی میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ کاشی فوراً ناشتہ لے

کر آئی، گرم گرم پوریاں، آلو کی بھجیا اور پھر گرم دودھ پتی کی چائے نے مزہ دولا کر دیا۔ آج تو ناشتہ کرنے تک وہ میرے پاس بیٹھی بھی نہیں۔ اور جاتے جاتے بول گئی۔ ”میں مندر میں جارہی ہوں، آپ ناشتہ کر کے جلدی سے مندر میں آ جائیں۔ مندر سے واپسی پر میں برتن اٹھا لوں گی۔“

میں نے ناشتہ کیا اور جلدی سے مندر میں پہنچا۔ مندر میں دونوں پنڈت مہاراج بیٹھے لوگوں سے چڑھاوے وصول کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر رام لال جی نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ اس جگہ بیٹھ جاؤ، میں خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد بڑے پنڈت جی نے اشلوک پڑھنا شروع کیا، ساتھ ہی ساتھ مندر میں لگی گھنٹیاں بھی بجائی جانے لگیں، اشلوک سے فارغ ہو کر پنڈت جی بولے۔

”سجنو! میں اور رام لال آج دوپہر کے بعد ایک جگہ جائیں گے، یعنی میں اپنے گرو جی کے پاس جاؤں گا، کیونکہ صحن راج کی مرتبہ، میرے برداشت سے باہر ہے، گو پی کی آتما اب ظالم اور خونی بن چکی ہے، چلو میں ہی کیا سارے گاؤں والے مانتے ہیں کہ تھاکر چندر نے اس کی اور اس کی پتری چندر کھی کے ساتھ بنائے کیا، بہت زیادہ ظلم کیا، ناقابل برداشت اور ناقابل یقین پاپ کیا، اور اس کو اس کی سزا مل گئی، گو پی کی آتما نے اسے ترک میں پہنچا دیا، اس کے بعد اس نے چندر کے پر یوار کا بھی خاتمہ کر دیا، اس کے بعد وہ گاؤں کے جوانوں کے پیچھے پر گیا، اور یہ ٹھیک نہیں، میں نے ترشول گاؤں کو کنڈل کر دیا تھا۔ مگر نہ جانے کس مورکھ نے سارے کنڈل اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

میں نے گرو جی سے وقتی رابطہ کیا تو گرو جی نے فرمایا ہے کہ تم میرے استحقاق پر آ جاؤ، میں گو پی کی آتما کے لئے مضبوط اپائے کرتا ہوں۔ یعنی گو پی کی آتما کا خاتمہ۔“

پنڈت جی کی بات سن کر ایک ضعیف شخص اٹھا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”پنڈت جی ہم گاؤں والوں کی اچھا ہے کہ یہ کام جلد از جلد ہو جائے، اور ویسے یہ

کام تو بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔ گاؤں کے کتے جوان خونی آتما کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آپ گرد جی سے ہم تمام گاؤں والوں کی طرف سے غنی کرنا کہ وہ اس کام کو معنی جلدی ہو سکے کر دیں، تاکہ ہم گاؤں والے سب سے ہوتے جو خوفزدہ زندگی گزار رہے ہیں، ہر بات میں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں وہ خونی آتما کب آجائے، پنڈت جی مجھے یہی کہتا تھا۔ آگیا جاتا ہوں۔“

”کیش کا کا، آپ کی بات درست ہے، آپ صحیح کہہ رہے ہیں، کبھی کبھی کسی کام کے لئے بہانہ بن جاتا ہے، اور بھگوان سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے۔

آپ سب شانت رہیں، اس کٹھ کو تو دور کرنے کے لئے میں گرد جی کے استحقاق پر جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کام پورا ہو جائے گا، اور میری تو کوشش ہوگی کہ گرد جی میرے ساتھ یہاں پر آئیں اور اپنے ہاتھ سے یہ شہ کام کریں، جس سے گوپی کی خونی آتما کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے، سنسار سے اس کا کٹھ ہونا اب یقینیت ہے۔

ٹھیک ہے اب آپ لوگ اپنے اپنے کام سے جاؤ، دوپہر کے بعد ہم دونوں، گرد جی کے پاس جانے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔“ پنڈت جی کی بات سن کر مندر میں موجود سارے لوگ مندر سے نکلے چلے گئے۔

مندر کے کام سے فارغ ہو کر دونوں پنڈت جی اپنے کمرے میں آئے، دونوں نے اشان کیا کیونکہ گرمی زیادہ تھی۔ بھوجن کھایا اور تھوڑی دیر آرام کے لئے لیٹ گئے۔

کاشی میرے لئے بھی کھانا لے آئی اور میرے آگے کھانا رکھ کر بولی۔ ”باہو جی۔ آپ کھانا کھائیں، میں چلتی ہوں، پھر بعد میں ملوں گی، اس وقت یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں، دونوں پنڈت مہاراج گرد جی کے پاس جانے والے ہیں۔ ابھی تو آرام کر رہے ہیں، پتہ نہیں کب ان کی آنکھ کھل جائے اور وہ آواز دے لیں، یا پھر آپ کے کمرے میں آجائیں۔ تو میرا اس سے ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔“

اور یہ بول کر اس نے ایک بھر پور نظر مجھ پر ڈالی اور مسکرائی ہوئی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور بھر پور لیٹ کر وقت کے تانے بانے میں کھو گیا۔ لیکن آنکھ جھپکتے ہی فوراً کاشی کا خیال دماغ میں گردش کرنے لگا، اور جھٹ میری آنکھ کھل جاتی، خیر میں اٹھا اور کھڑے سے ٹھنڈا پانی نکال کر پی لیا۔ منہ بھی پانی کے چھینٹے مارے پانی کے چھینٹے مارنے پر ذرا سکون ملا تو پھر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں، مجھے آنکھیں بند کئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ رام لال جی کمرے میں آئے، میں نے آہٹ پا کر جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ”پر تاب! میں اور پنڈت جی تو جا رہے ہیں، تم بالکل کسی بات کی پختہ نہ کرنا، اور اندر کا ذرا خیال رکھنا، ویسے تو کوئی ذرا خوف نہیں لیکن پرش کے مقابلے میں ناریوں کا دل نازک ہوتا ہے، ہماری واپسی پر سوں ہوگی، بہر حال تم جو کس رہنا اور خیال رکھنا۔

اور ہاں، میں نے کاشی سے کہہ دیا ہے کہ تمہارا کھانا پینے کا ہر طرح سے خیال رکھے، اور پھر دروازہ اپنا مضبوطی سے بند کر دینا، دروازہ کھول کر نہیں سونا۔“ اور یہ بول کر کمرے سے نکل گئے۔

آج اندھیرا پھیلنے ہی کاشی رات کا کھانا لے کر آگئی۔ اس نے کھانا میرے سامنے رکھ دیا۔ کھانا دیکھ کر میں مسکراتے لگا اور بولا۔ ”کاشی آج کیا کوئی خاص بات ہے یا پھر تم کہیں جارہی ہو کہ آج اتنی جلدی کھانا لے کر آگئی۔ آج سے پہلے تو تم اتنی جلدی کھانا نہیں لائی، یا ایسا تو نہیں کہ کھانا ناپاکنے والی جلدی سے کھانا پکا کر نہیں جانے والی ہو؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا آج آپ کو جلدی کھانا کھلا دوں، کیونکہ آج میں تھوڑی دیر تک اپنے ساتھی ناریوں کے پاس بیٹھوں گی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ کاشی آج تو دونوں پنڈت مہاراج ہیں نہیں تو کیوں نہ ہم ایک جگہ تھوڑی دیر تک بیٹھ کر باتیں کر کے من بہلا لیں۔ اور جب نیند آنے لگے تو اپنے اپنے کمرے کو مضبوطی سے

بند کر کے سو جائیں، کیونکہ جاتے سے چھوٹے پنڈت جی نے تاکید سے کہا ہے کہ اپنے کمرے کی کنڈی مضبوطی سے بند کر لینا۔

اسی وجہ سے میں نے آج جلدی کھانا لے آئی اور یہ بھی سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کمرے پیچھے میرے کمرے میں آجائیں اور اگر میں کمرے میں نہ ملوں تو.....“ اور کاشی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور ایک تک میری جانب دیکھ کر مسکراتے لگی۔

اس وقت ایسا لگتا تھا کہ سنسار کی ساری مصیبت سہٹ کر اس کے چہرے میں سا گئی ہو، اور یہی نہیں بلکہ پورے سنسار کا حسن بھی سہٹ کر اس پر بھجوا دیا گیا ہو۔

”کاشی تمہارا اس طرح دیکھنا مجھے مار ڈالتا ہے، خیر! من میرے قابو میں نہیں رہتا، تم کس قدر سنسار ہو، اس کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں، بس من چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھ جاؤں اور تمہارے حسن کی دلکشی میں کھو جاؤں اور اس طرح جیون بیت جائے، البتہ روتے تمہیں بڑی فرصت میں بنایا ہوگا، اگر کوئی میری نظر سے تمہیں دیکھے تو اسے لگے گا کہ تم سے بڑھ کر پورے سنسار میں کوئی اور خوب صورت اور حسین نہیں ہوگا جتنا تم ہو۔“ میں نے کہا۔

”چلیں میں آپ کی بات مان لیتی ہوں اور آپ بھی میری نظر میں جو ہیں اس کے لئے میرے پاس بھی الفاظ نہیں اور شاید کبھی بھی ان الفاظ کو نہ پاسکوں گی کہ آپ کا من.....“ اور اس نے بات مکمل نہیں کی۔ پھر جھٹ سے لے لی۔ ”اچھا اب چپ چاپ کھانا کھائیں، اسکی باتوں کے لئے بہت سے پڑا ہے، میں جلدی جارہی ہوں، وہ تینوں میرا انتظار کر رہی ہوں گی، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے زحمت سے ڈھونڈتے اس طرف نکل آئیں اور مجھے آپ کے اتنا قریب دیکھ کر دانتوں میں اپنی انگلیاں دبائیں اور نظریں جھکا کر اسلے پاؤں بھاگ جائیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، پھر آؤں گی اور برتن لے جاؤں گی۔“

”ارے تو کیا میں اکیلے ہی کھانا کھاؤں گا، کم از کم دو چار لوگ لے لئے تو میرا ساتھ دو۔“ میں نے کہا۔

”ابھی سارے نوالے آپ خود ہی کھا لیں، میں بعد میں آؤں گی، تو آپ کے لئے گڑ کے چاول لیتی آؤں گی، آج رات جی نے گڑ کے چاول بنائے ہیں، بول رہی تھی کہ آج میرا من گڑ کے چاول کھانے کو کر رہا ہے، ویسے بھی آج تو دونوں پنڈت مہاراج ہیں نہیں۔ جب گڑ کے چاول لاؤں گی تو آپ کے ساتھ دو چار نوالے کھا لیں گی، اب آپ اچھے بچے کی طرح میری بات مان لیں، اور کھانا کھائیں، مجھے واپس آنے میں کوئی گھنٹہ بھر تو لگے گا۔“ اور وہ چلی گئی۔

میں من پر جبر کر کے کھانا کھانے لگا، کیونکہ اگر اس سے کھانا نہیں کھاتا تو کھانا ٹھنڈا ہو جاتا اور پھر کھانے کا سارا سواد ختم ہو جاتا۔ خیر پورا کھانا تو میں نے نہیں کھایا، آدھا سے زیادہ چھادیا۔ ویسے بھی اتنی جلدی اور پھر آج دن میں دیر سے کھانا کھایا تھا اور کھانا ابھی ہضم نہیں ہو پایا تھا۔ ویسے روزانہ کھانے کا سے آٹھ سے ساڑھے آٹھ بجے کا ہوتا تھا۔

خیر میں نے جو بھی کھایا جتنا بھی کھایا، کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھویا اور لاٹین بجا کر بستر پر لیٹ گیا۔

انتظار..... اور پھر انتظار کرتے ہوئے میں کروٹیں بدلنے لگا، اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ جب کسی کو ٹوٹ کر چاہا جاتا ہے تو اس کا انتظار کتنا کٹھن ہوتا ہے، اب آئے کہ..... تب آئے..... اور اس طرح میں ایک ایک پل کو گنتے لگا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے جب میں تھک جاتا تو اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتا۔

رات کا شاید دس بجے کا سے ہوگا، جب کمرے میں کسی کے آنے کا احساس ہوا، وہ دے قدموں آئی اور اندھیرے میں میرے وجود کو ٹٹول کر میرے جسم سے لگ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”پر تاب باہو! سو گئے کیا؟“

میرے من میں جھٹ آیا کہ میں اس سے سوتا بن جاؤں، اس نے پھر سرگوشی کی۔ ”تپ باہو..... سو گئے کیا؟“ اور پھر میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومنے لگی۔ اس کا انداز اتنا غضب کا تھا کہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں ترنت اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تم تو آج



غیر انسانی مخلوق

محمد رضوان قیوم - راولپنڈی

پورا گھرانہ اپنی خوبصورتی اور فیاضی میں اپنی مثال آپ تھا، انہیں دیکھ کر لوگ عیش عیش کر اٹھتے تھے کہ اچانک ان کے کانوں میں بانسری کی مدد بھری آواز ٹکرائی تو ان کی ہیبت بدلنے لگی اور پھر.....

یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ تادیہ اور مارا لیا مخلوق دنیا میں عام انسانوں کی طرح رہتی ہیں

وہاں اس کے نام کی مناسبت سے عورتوں کے حوالے سے اشیاء ملا کرتی تھیں۔ اس دور میں بھی عورتیں زیادہ چٹ پٹی اشیاء کھانے کی شوقین ہوا کرتی تھیں۔

لہٰذا بازار میں کافی رات تک خریداروں کا رش رہا کرتا تھا میری جس مقام پر ریڑھی لگتی تھی، وہ اتفاق سے ایک قسم کا ایسا چوک تھا جہاں سے مزید بازاروں کا بھی لنگ تھا۔ میرا جب گول گپے کی ریڑھی کا کام

ذیورنظر کہانی کے راوی عبداللہ چاچا ہیں جو خود اس کہانی کے ایک کردار تھے اب اس کہانی کو ان کی زبانی سنیں۔

یہ 1942ء کی بات ہے میں انبالہ شہر کے دہن بازار میں اپنی سرکاری نوکری کی ڈیوٹی دینے کے بعد شام کو گول گپے کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ میں جس بازار میں اپنی ریڑھی لگاتا تھا

جائیں۔“ میں اپنی جگہ لیٹ گیا تو وہ بھی میرے پہلو میں لیٹ گئی۔

اس کے لب کھلے اور اس کی سرگوشی سنائی دی۔

”پر تاب! ایک بات پوچھوں؟“

”شکر ہے کہ تمہیں میرا نام تو یاد آیا، ورنہ تو تم نے

باپو جی..... باپو جی..... کارنا لگا رکھا تھا۔ اب تمہارے منہ

سے اپنا نام سن کر لگا ہے کہ تمہارے من میں بھی میری

چاہت زیادہ ہے اور ہاں! پوچھو! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“

میں نے کہا۔

”پر تاب! میں تمہیں بتا دوں کہ تم میری اب تک

کی زندگی میں وہ واحد وجود ہو جسے کہ میں اپنی جان سے

بھی زیادہ چاہنے لگی ہوں۔ کہیں تم مجھے بچ منجھدا میں

چھو تو نہیں دوں گے..... کہیں تمہارا من فور جگہ لگ

جائے اور تم مجھے دھوکہ دے دو۔ کہیں ایسا تو نہیں کرو

گے؟“ وہ ایک ایک لفظ کو چبا کر بولی۔

”کامنی!“

”جی بولیں! میں سن رہی ہوں۔“

”کامنی اگر تم کہو کہ مجھے اپنا دل دے دو تو میں بلا

جھجک اپنا سینہ چیر کر، اپنا دل اپنے ہاتھوں نکال کر تمہارے

ہاتھ پر رکھ دوں گا، میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں، اپنی

زندگی تو ہار سکتا ہوں مگر کسی بھی صورت تمہیں خود سے الگ

نہیں کر سکتا، یہ میرا وجہ ہے۔“

اور پھر وہ مجھ سے چٹ کر مجھے زور سے دہرایا۔

لیا۔ اس کی گرم گرم بے قابو سانس میری سانسوں سے

گھرانے لگیں۔ اور پھر جذبات سے مغلوب ہو کر طوفانی

تھپڑوں میں ہمارے قدم اکٹھے گئے اور پھر ہم ہوش سے

بیگانہ دھارے میں بہتے چلے گئے۔

کہ اچانک کسی کھوڑے کے ہنہانے اور اس کے

ٹاپوں کی آواز سن کر کامنی لرز کر رہ گئی، اس کی آواز حلق میں

پھنس گئی اور جیسے اس پر سکتہ طاری ہو گیا، وہ اپنے ہونٹ

میرے کان کے قریب لائی اور میرے کان میں گھبراہٹ

ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ ”پر تاب! بھگوان خیر کرے۔“

(جاری ہے)

مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر جیسے بھول گئی تھیں۔ اوہ.....! بھگوان! میں تو انتظار کرتے کرتے اکڑ کر رہ گیا۔ مجھے آج

پتہ چلا کہ اپنے من میت کا انتظار کتنا میٹھا ہوتا ہے۔“

”ارے میں بھی تو اپنی جگہ تڑپ رہی تھی، ان

تینوں نے تو مجھے جیسے جکڑ لیا تھا، لاکھ بولتی رہی کہ بھی اب

مجھے سخت نیند آرہی ہے، مگر مجال ہے جو میری بات ان کے

کان میں جاری تھی۔

”اچھا تھوڑی دیر اور بیٹھ..... تھوڑی دیر اور

کئی..... کون سا آج سویرے اٹھنا ہے اور پھر مندر جانا

ہے، ایسا موقع تو سالوں میں بھی بکھارتا ملتا ہے۔“

خیر میں بڑی مشکل سے جان چھڑا کر پہلے اپنے

کمرے میں آئی۔ اور پھر کوئی آدھا گھنٹہ تک اپنے کمرے

میں لیٹی رہی، اور دروازہ بھی ذرا زور سے بند کیا کہ انہیں

پتہ لگ جائے کہ میں اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ

بند کر لیا ہے۔

”ویسے بھی ان تینوں کی عادت ہے کہ بستر پر

گرتے ہی خبر ہو جاتی ہیں، اور صبح سے پہلے ان کی

آنکھ ہرگز نہیں کھلتی۔

ارے ہاں! میں گڑ کے چاول لائی ہوں، اور موسم

بہار بھی لائی ہوں، لائین، اس سے جلانا ٹھیک نہیں۔ پہلے

میں دروازہ بند کر کے کواڑ کے نیچے جھری میں کپڑا ٹھوس

دیتی ہوں تاکہ روشنی باہر نہ جاسکے۔“

اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ دروازہ بند کر کے

دروازہ کے کواڑ کے نیچے جو بگلی سی جھری تھی اس میں کپڑا

ٹھوسا اور پھر بعد میں موسم بہار چلائی۔ لیکن موسم بہار کی روشنی

زیادہ تھی۔ اس لئے لائین جلا کر اسے مدھم کر دیا اور موسم بہار

بجھادی۔ کمرے میں بہت ہی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ پھر اس

نے ٹیٹھے گڑ کے چاول میرے سامنے رکھ دیا اور بولی۔

”چلیں اب آپ یہ چاول کھائیں۔“

کٹورے میں تھوڑے سے چاول تھے، خیر ہم

دونوں نے ٹل کر وہ چاول کھائے۔

”چاول کھاتے ہی پانی پی لینے کے بعد اس نے

لائین بجھادی اور بولی۔ ”اب آپ آرام سے لیٹ

بہت اچھا چلنے لگا تو میری دیکھا دیکھی میرے قریب ہی ایک چھوٹے کی ریزمی "نورن" نامی ایک شخص نے لگائی تھی شروع شروع میں تو مجھے اس کی آمد ہی لگی۔ اس کے متعلق میں یہ سوچا اور سمجھ رہا تھا کہ یہ میرے کاروبار میں آ زین رہا ہے لیکن میری یہ سوچ غلط تھی۔ اس کی ریزمی میرے ساتھ جڑنے سے ہم دونوں کا کام واہ واہ دوگنا ہو گیا تھا۔ سارا دن عورتیں لڑکیاں ہماری ریزمی پر گول گپے چھو لے کھاتی رہتی تھیں وہ آہستہ آہستہ میرا دوست بن گیا تھا وہ میری توقعات سے زیادہ اچھا اور مخلص انسان تھا اس نے مجھے مشورہ دیا کہ "تم اپنے گول گپے میں مزید ذائقہ لانے کے لئے اس میں میری بنائی چاٹ استعمال کیا کرو۔ اس سے ہم دونوں کو بہت فائدہ ہوگا۔"

میں اس سے تیار چٹ پٹی چاٹ لے کر اپنے گول گپے میں ڈالنے لگا تو واقعی اس کا مشورہ کامیاب رہا۔ چٹ پٹے کھانے کے شوقینوں کو ایسے کھنے بیٹھے چھو لے چاٹ بھرے گول گپے کھانے سے اب دوگنا مزا آتا تھا۔

رفتہ رفتہ میرا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ میں نے اپنی لگی لگائی سرکاری نوکری چھوڑ دی۔ اور میں فل ٹائم ریزمی لگانے لگا تھا۔

نورن کا کام بھی اچھا چل پڑا تھا بعض دفعہ ہم دونوں ایک دوسرے کی ریزمیوں سے وہ چیزیں لے لیا کرتے تھے جس کی ہمارے پاس کی ہوتی تھی ہم دونوں اپنی ریزمی رات کو تقریباً ایک دو بجے تک بند کرتے تھے۔

ہم دونوں نے مشترکہ طور پر اپنی ریزمیوں کی دھلائی، صفائی کے لئے ایک غریب شخص کو رکھ لیا تھا جو اس زمانہ میں ایک روپیہ روز لیتا تھا اس کا نام "میدو" تھا اس شخص کا معمول تھا کہ وہ صبح 10 بجے آتا اور رات گئے تک رہتا تھا، وہ بہت زیادہ مٹتی تھا۔

ایک دن ہم رات گئے جب اپنی ریزمیاں بند کرنے لگے تو میدو تیز پلٹیں دھور ہاتھ کا اچانک

ایک انگریز جوڑا ہماری جانب آیا ان کے ساتھ ایک خوبصورت بچی بھی تھی قریب آنے پر پتا چلا کہ جسے ہم گورا سمجھ رہے تھے وہ تو دیسی شخص ہے جبکہ اس کے ساتھ آئی ہوئی بچی اور اس کی بیوی خالصتاً انگریز تھی۔ اس دیسی شخص کا لباس تو گوروں والا تھا لیکن اس کی زبان بالکل مقامی لوگوں کی طرح تھی۔

"ہاں بھئی تین چار گول گپے ذرا ہماری بیگم کو کھلاؤ گے۔" اس شخص نے کہا۔

"اچھا حضور!" میں جواب دیا۔

میں نے پلیٹ کو بھی طرح پرکڑے سے صاف کر کے اس میں چار گول گپے پٹاؤ پیرے اور ساتھ ہی کھٹائی پانی ایک پیالے میں ڈال کر انہیں دیا۔ میم نے گول گپوں کو کھٹے پانی میں ڈبو کر کھایا وہ بڑے خوبصورت انگریزی زبان میں بولی Very, Very Sour (بہت کھٹا ہے)

اس نے اپنے لبوں سے سی، سی کی آواز نکالی شروع کر دی تھی۔

وہ میم شکل و صورت سے انتہائی خوبصورت سرخ

وسفید چہرے کی حامل تھی "But Very Tasty" (لیکن بہت مزیدار ہیں)

اس دیسی شخص نے مجھے اردو میں کہا کہ "اے

مزید گول گپے نہ دینا ورنہ اس کا گلا خراب ہو جائے گا۔"

"اچھا سر۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"More" (اور چاہئے) اس میم کے

اور مانگنے سے لگتا تھا کہ اس کو گول گپوں کا ذائقہ کچھ

زیادہ ہی پسند آ گیا تھا۔

"مجھے اور کھٹے بال چاہئیں" اس نے اپنی انگریزی میں یہ جملہ کہا تو وہاں کھڑے ہم لوگ ہنسنے لگے۔

گوری نے بغیر ہو کر میرے چھاپڑے میں پڑے گول گپوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "چلو میم صاحب کو دووانے اور ڈال دو۔"

صاحب نے کہا۔ جبکہ ان کے ساتھ آئی کوئلن بالوں پر مشتمل

بچی بڑے آرام سے اس جگہ پڑے ہوئے بیٹھ رہی تھی وہ اپنی ماں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اس کی عمر دیکھنے میں 4 سال کے لگ بھگ تھی وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اس کے بھی بال گھنگریالے، سنہری تھے۔ جبکہ اس کی آنکھوں کے ڈیلے بالکل سبز رنگ کے تھے۔ اس کے چہرے میں ڈارک نیلے جو تے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ دیکھنے میں بالکل ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی قیمتی ہلی گریا ہو۔

میں نے ایک سوکھا گول گپا اسے دیا تو وہ وہ اپنے ہاتھ سے اشارہ کرنے لگی کہ مجھے پانی میں ڈبو کر دو۔

اس کے باپ نے مجھے منع کیا "تم اسے کھٹا پانی نہ دینا۔"

"بیوی کو" صاحب نے میم سے کہا۔

میم نے مجھے خالی گول گپوں کی پلیٹ دیتے ہوئے کہا

"ویری بیٹی"

صاحب نے مجھے اس زمانے میں دس روپے دیئے۔ حالانکہ ان گول گپوں کی قیمت ایک پیسہ تھی۔

میں نے اس سے کہا "یہ بہت ہیں۔" تو اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تو براہ کرم۔"

میری جانب نورن (میری اچھی لگی دیہاڑی

کی) مجھ سے حیرت سے دیکھ رہا تھا اسے جب میم نے محسوس کیا تو اس نے 5 روپے اسے بھی دیئے اور نیچے بیٹھے میدو کو جو برتن دور ہاتھ اسے بھی دو روپے دیئے۔ وہ بھر پلے گئے۔

نورن نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے میم صاحب کی طبیعت اچھل پھل ہے اس لئے اس کا کھٹا کھانے کا دل کر رہا ہوگا۔ ویسے عموماً گورے کھٹا کھانا پسند نہیں کرتے۔

"یار یہ میم کتنی خوبصورت اور ساتھ ہی اچھے دل کی مالک تھی۔" میں نے نورن سے کہا۔

"تو میم کی بات کر رہا ہے وہ بچی تو اس سے

دو ہاتھ آگے حسین و خوبصورت تھی۔ صاحب اس بچی کا نام فینیسی لے رہا تھا۔ ایک ہماری بیویاں ہیں کالی کلوٹی جل لگایاں ہوتی رہیں۔"

ارے باؤبی۔ یہ میم ویم گورے انگریزوں کی صرف چھڑی ہی گوری اور آٹھائیں نلی ہوتی ہیں لیکن سچ پوچھو تو ان کے دل اندر سے کالے، تصب سے بھرے ہوتے ہیں اور ان کے ذرا قریب جاؤ تو بھگوان قسم ان کے جسم سے ایسی ہلک آتی ہے جیسے کہ پیدائشی بچوں کی جڈیوں میں سے آتی ہے، ہماری عورتیں کالی چھڑی والی ضرور ہوتی ہیں لیکن وفادار اور اصل حسن والی ہوتی ہیں۔" مدبولہ۔

"ہاں میدو تو صحیح کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہوتی رہیں اور پھر وقت مقررہ پر ہم دونوں نے اپنی اپنی ریزمی بند کر کے گھر کی راہ لی۔

دوسرے دن ٹھیک اسی ٹائم رات کو پھر وہی جوڑا ہماری ریزمیوں کے پاس آیا۔ "یار تمہارے گول گپوں میں ایسا کونسا جادوئی امرت ہے جس کو کچھنے کے بعد میری بیگم ان گول گپوں پر عاشق ہو گئی ہے، یہ آج مجھے قہر آلائی ہے۔" صاحب نے کہا۔

"اسے ایک پلیٹ بنا دو اور مجھے دو چار پیسے ڈال دو۔"

میں ابھی گول گپوں کو چٹا کر اس میں چھو لے اور پانی بھی صحیح طریقہ سے نہیں ڈال پایا تھا کہ میم نے میرے ہاتھوں سے نمیدیوں کی طرح پلیٹ جھٹ سے جھین لی۔ مجھے یہاں وہ بڑی بدتمیز لگی تھی۔ لیکن میں منہ سے کچھ نہ بولا۔

اس شخص سے میں نے ادب سے پوچھا "سر آپ کہاں کام کرتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں سروے آف انڈیا۔ مجھے میں بحیثیت اسٹنٹ ڈائریکٹر آیا ہوں۔

اور تمہارے اس خوبصورت شہر میں تقریباً ایک ماہ رہوں گا۔"

”یوں ساکنہ صاحب“ میں نے پوچھا۔
نورن میری بات کا متھے ہوئے بولا۔ ”یارتو اس
ٹھکے کو کیا سمجھو گے۔“
صاحب نے طنزیہ طور پر ہنسنے ہوئے کہا ”تم
لوگ بس کٹے ٹپٹے چھوٹے اور گول گپے پیچو۔“ نورن
شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

صاحب نے اپنی جیب سے پھر 10 روپے
نکال کر مجھے دیئے اور 10 روپے نورن کو دیتے
ہوئے بولا۔ ”میری بات سے شاید تمہارا دل دکھا ہو میں
اس لئے معذرت چاہتا ہوں یہ 5 روپے میں خود اپنے
آج پر جرمانہ ڈالتا ہوں۔ اور یہ پانچ روپے اس کو دے
دو۔“ میدو کی طرف اشارہ کیا۔
”نہیں۔ نہیں سر۔ ایسی کوئی بات نہیں آپ
اچھے دل کے مالک ہیں اللہ آپ کو خوش
رکھے۔“ نورن بولا۔

صاحب نے کہا ”یہ بچی ذرا آپ کے پاس کچھ
دیر بیٹھے گی۔ ہم تھوڑی دیر بعد آتے ہیں۔“
”سر اس وقت تقریباً ساری دکانیں بند ہو چکی
ہیں اور دوسرے وہاں آگے کچھ تفریح کے لئے نہیں
ہے۔“ میں نے کہا۔
”بھئی ہم تفریح کے لئے تھوڑی آئے
ہیں۔ دراصل ہم صاحبہ پر یکھٹ ہیں انہیں ڈاکٹر نے
زیادہ سے زیادہ چلنے کو کہا ہے۔“ صاحب نے بڑی بے
باکی سے کہا۔

نورن نے مجھے اس طرح آنکھ ماری جیسے کہ وہ
مجھ سے کہہ رہا ہو کہ میرا اس ہم کے بارے میں صحیح شک
تھا کہ یہ اس حال سے ہے۔
”جی سر! ابھی ہم دونوں کچھ دیر یہاں رہیں
گے۔ آپ بے شک تھوڑی دیر بعد آرام سے آجائے
پہنچیں ہمارے پاس ہی بیٹھی رہے گی۔“ اور پھر وہ دونوں
چلے گئے۔
نورن نے اپنی ریڑھی کا کام سمیٹا اور اپنے
گھر چلا گیا۔ میں اکیلا اس بچی کے ساتھ بیٹھا رہا۔

میدو بھی میرے ساتھ بندھا رہا اب آئے کب آئے
مثال والی انتظار کی کیفیت شروع ہو گئی تھی۔
بہر حال وہ دونوں کافی دیر بعد آئے تھکن کی وجہ
سے میں حال سے بے حال تھا اور پھر نیند کا جھونکا بھی
مجھے تنگ کر رہا تھا۔

”سوری! ہم ذرا دور چلے گئے تھے۔“ صاحب
نے معذرت کی بہت ہی خوش اخلاقی سے۔
میں نے بھی جواباً مصنوعی خوش اخلاقی سے
کہا۔ ”کوئی بات نہیں سر۔“
صاحب نے اپنی جیب سے پھر کچھ روپے مجھے
اور میدو کو دیئے نوٹوں کو دیکھ کر ہماری ساری نیند
اور تھکاوٹ فوراً اڑن چھو ہو گئی ایک آدھ دن چھوڑ کر
صاحب بعد اپنی امیر اور بچی کے ساتھ لازماً اس ایک
مخصوص رات کے وقت ہمارے پاس آتے تھے۔
ان کی ذات سے ہم غریبوں کی مسلسل اچھی
دیہاڑیاں لگنے لگی تھیں۔

ایک رات صاحب نے اپنا نام بیاس سنگھ بتلایا
نیز یہ بھی بتلایا کہ وہ ناروال گاؤں کا رہنے والا ہے اور وہ
اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر لندن پڑھنے گیا تھا، وہاں
اس مہم جس کا نام بیوی ہے (جو واقعی حسین اور سراپے
کے لحاظ سے انتہائی بیوی فلت تھی) ہمارے درمیان عشق
شروع ہو گیا تھا اور پھر ہم نے شادی کر لی۔ ہم لوگ
جلد واپس لندن چلے جائیں گے۔“

ایک دن نورن نے مجھ سے کہا۔ ”یہ آفسر
ہمارے بڑے کام آ سکتا ہے۔“
میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“
اس نے کہا۔ ”یہ اپنے ٹھکے کا ڈائریکٹر ہے اس
سے میں یہ کام لوں گا کہ اپنے بڑے بیٹے کو اس کے ٹھکے
میں بھرتی کراؤں گا۔“
میں نے کہا۔ ”یار اس سے ہمیں یہ کام
لینا چاہئے کہ اس کی بدولت ہم اقبالہ میوہل کمپنی سے
اپنی ریڑھی کا مستقل لائسنس لے لیں۔“
”یار تو دھیرج رکھ۔ دیکھ میں کس چالپوسی سے

بیاس سنگھ سے کام لیتا ہوں۔“ اس نے بڑے وثوق
سے کہا تھا۔
حسب معمول ایک رات بیوی نے میری
ریڑھی سے گول گپے کھائے اور وہ دونوں میاں بیوی
ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بازار کی جانب
نکل گئے۔ جبکہ بچی فینسی ہمارے پاس بیٹھ رہی تھی۔
بیاس سنگھ چکر لگانے کے بعد مجھے لازمی مزید
روپے دینا تھا اس کی جانب سے دیئے گئے ایکسٹرا
مفت کے روپوں کا لالچ میری نیند کے آئے شمار
پر حاوی رہتا تھا۔

ایک رات نورن معمول کے مطابق چلا گیا
تھا جبکہ میدو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں میدو کا
ایک پرانا دوست اس چبیا ہی غریب وہاں آ نکلا۔ وہ
دیکھنے میں بالکل عام مزدور سا لگ رہا تھا اس کے
کپڑے پھٹے ہوئے۔ پاؤں میں سستی سستی ہوئی چنپل
اس کی غربت کی واضح عکاسی کر رہی تھی۔

وہ زمین پر بیٹھے برتن دھوتا میدو سے بڑی گرم
جوش سے ملا۔ ”میں ان کے پاس کام کرتا ہوں۔“ میدو
نے اس سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔
میں نے اخلاطاً اسے سلام کیا تو اس نے جواباً
مجھے غصے سے دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ”آپ کا نام
کیا ہے؟“
”کنیش“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ میں نے پھر سوال کر دیا۔
اس نے ماپوسی سے کہا کہ ”آج کل فارغ
ہوں۔ میں پہلے گھرات میں ایک ایسے شخص کے پاس
کام کرتا تھا جو کہ روحوں، بدروحوں سے دلدلہ
اور چادوگری کے کام کرتا تھا اب وہ مر گیا ہے لہذا میرا
کام بھی وہاں سے چھوٹ گیا ہے الغرض اب میں فارغ
ہوں۔ میں اب یہاں پر اپنے ماموں کے پاس آیا ہوں
ان کا یہاں کالج کی یونکوں کا کارخانہ ہے۔ میں ان کے
پاس ہی رہوں گا۔“

چونکہ وہ میدو کا مہمان تھا اس لئے میں نے اس

کے لئے سوڈے کی بوتل منگوا دی۔ اس نے بلا تامل غٹا
غٹا اسے پینا شروع کر دیا۔

اس کے بعد اس نے بڑے منہ پھٹ انداز میں
کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مجھے چھوٹے بھرے گول
گپے کھلا دیں۔“
”یہ تو گلے پڑنے والا مہمان ہے۔“ میں نے دل
میں سوچا۔ بہر حال میں نے اسے ایک گول گپے والی
پلیٹ بنا کر دی۔ گول گپے کھانے کے بعد وہ میدو
کو یہ کہہ کر چلا گیا کہ ”اچھا ہوا تو مجھے مل گیا اب ہماری
دوٹی خوب پروان چڑھنے کی میں کل پھر آؤں گا۔“

دوسرے دن وہ رات کو پھر آ گیا۔ اس بار میں
نے اسے زیادہ لفٹ ندی، میں نے اپنے ساتھ کھڑے
نورن کو کہا۔ ”یار، یہ میدو کا دوست بہت لچڑا انسان
لگتا ہے۔“

نورن نے میدو کو اپنے پاس بلا کر کہا ”اسے
اشارے اشارے میں کہہ دینا کہ میرے یہ دونوں مالک
تیری آمد سے ناراض ہیں تو یہاں نہ آیا کر۔“ میدو نے
ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں اسے طریقہ سے بھگا دوں گا۔ آپ
دھیرج رکھیں۔“

دوسرے دن رات میں وہ پھر آ گیا اور میدو
کے پاس بیٹھ کر اوٹ پانگ باتیں کرنے لگا۔ اتفاق
سے وہی شخص بیاس سنگھ اپنی امیر اور بچی کے ساتھ آئے
میں نے اسے موٹے موٹے گول گپے نکال کر ان پر کھٹی
میٹھی چٹنیاں ڈالیں اور ایک اچھی پلیٹ بمعہ کٹے پانی
کے میم کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔

جبکہ فینسی بچی معمول کی طرح ہمارے اسٹول
پر خاموشی سے بیٹھ گئی وہ اس دن انتہائی خوبصورت
لگ رہی تھی۔

نیچے زمین پر بیٹھا میدو کا دوست کنیش اس سے
اپنی الٹی سیدھی باتوں میں مگن تھا وہ تیز تیز بول رہا تھا وہ
بولتے بولتے رک گیا اور بغور صاحب اس کی میم اور بچی
کو ٹھٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔ اور پھر وہ آہستہ آہستہ جوں کی
چال چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا اور اس نے مزے

سے گول گپے کھاتی میم کو تھس سے دیکھنا شروع کر دیا۔
 ”نورن نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”اوئے
 گیش پیچھے ہٹ میم صاحب کو آرام سے گول گپے کھانے
 دے۔“

اور صاحب بیاس سنگھ نے اپنی ناک میں رومال
 رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ اس غلیظ شخص کے جسم سے کتنی غلیظ
 بدبو آ رہی ہے۔“

میم نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”دفع
 ہو یہاں سے۔“

وہ کچھ دیر اور مسلسل دیوانہ وار ان تینوں کو دیکھنے
 لگا تو میم نے اسے بھڑکی دیتے ہوئے کہا۔ ”بھاگ
 یہاں سے اگر تم میدو کے دوست نہ ہوتے تو میں تمہیں
 تھپڑ مار دیتا۔“ بیاس سنگھ نے اپنی میم کو مخاطب کر کے
 کہا۔ ”بیوٹی آؤ ذرا چہل قدمی کر کے آئیں اس
 دیوانے کے کپڑوں میں موجود بدبو میرے دماغ پر چڑھ
 گئی ہے آؤ ذرا چہل قدمی کر لیں۔“ فنیسی آپ تھوڑی دیر
 بیٹھیں ہم ابھی آتے ہیں۔“

بیاس سنگھ نے جاتے جاتے مجھے
 کہا۔ ”مسٹر عبدال۔“ اس بچی کا خصوصی خیال
 رکھنا اور اسے اس دیوانے سے دور رکھنا۔ دیکھو اس
 کو گندگی سے الگ رہی ہے۔“

فنیسی خاموشی سے بچ پڑی رہی۔
 میم اور صاحب کے جانے کے بعد نورن نے
 خصوصی طور پر گیش کو اپنے پاس انتہائی غصہ سے بلایا اور
 اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”تو نے ہمارے اچھے معزز گاہکوں سے اتنی
 بدتمیزی کیوں کی۔“

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں دعویٰ سے
 کہہ سکتا ہوں کہ یہ انسانی انگریز نہیں بلکہ یہ کوئی
 پراسرار مخلوق ہیں۔“

”تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ یہ تو اپنا بیوقوفانہ دعویٰ
 کس بنیاد پر کر رہا ہے۔“ نورن نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”میں نے ان گوروں کی غیر انسانی بو کو کوٹھلی
 ہے اور دوسرے ان کی گردن کے آخری حصے پر وہ نشان
 دیکھ لیا ہے جو کہ غیر انسانی مخلوق کی گردنوں کے نیچے
 ہوتا ہے۔“

”یکواس بند کر اور یہاں سے دفع ہو جا۔“ اس
 بار تو میدو نے بھی اسے دھکارتے ہوئے کہا۔ ”تو اب
 یہاں نظر نہ آنا اور آئندہ بھی تو یہاں نظر آیا تو ہم تیری
 ٹانگیں توڑ دیں گے۔“

”یار اس جوڑے کی وجہ سے ہماری ٹھیک ٹھاک
 دیہاڑی لگ جاتی ہے اور یہ اپنے پاگل پن میں لگتا ہے
 ان اچھے گاہکوں کو بھگوانے گا۔“

گیش نے ان تینوں سے ڈھٹ پنے سے کہا۔ ”یہ
 بازار اور سڑکیں کسی کے باپ کی ملکیت نہیں ہیں میں
 یہاں ہر قیمت پر آؤں گا۔“

”چل بھاگ یہاں سے۔“ اور پھر میں نے
 غصے میں آ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر بڑ دیا اس
 کے بعد وہ ہم سب کو گالیاں دیتا ہوا یہ کہہ کر چلا گیا کہ ”تم
 لوگ ایک نہ ایک دن میری جانب سے کئے گئے دعویٰ
 کی حقیقت کو سمجھ لو گے۔“

”جا، جا۔“ نورن نے اسے اپنی ریڑھی پر
 پڑے ہوئے دہی پھینکنے کا کٹھنہ مار تے ہوئے کہا۔ ”چل
 بھاگ یہاں سے۔“

وہ فنیسی کو بغور پاگلوں کی طرح گھورتا ہوا وہاں
 سے بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم آپس میں اس کے
 پاگل پن کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں
 دونوں میاں بیوی معمول کے مطابق چہل قدمی کر کے
 واپس آ گئے۔ بیاس سنگھ نے ہمیں دوبارہ میسے دیے۔
 میں نے بغور ان سب کی گردنوں کے نیچے گیش کے
 بتلائے ہوئے نشانات کو دیکھا۔ وہاں واقعی وہ نشانات
 موجود تھے۔

لیکن بیاس سنگھ، اس کی بیوی بیوٹی بالکل عام
 انسانوں کی طرح لگ رہے تھے وہ دونوں ہشاش بشاش

تھے۔ میں ارادہ فنیسی کے قریب پیار کرنے کے بہانے
 گیا میں نے اس کی گردن کے نیچے ویسا ہی ہلکا سا نشان
 دیکھا تو مجھے بھی ڈر سا کھٹکا ہوا اور یہ خیال آیا کہ ”ہو سکتا
 ہے کہ ان لوگوں کا واقعی کوئی غیر انسانی مخلوق سے تعلق
 ہو۔“ ان کے جانے کے بعد میں نے نورن کو اپنے پاس
 بلایا اور اسے اپنے اندر پیدا اندیشے کو بیان کیا تو نورن
 مجھ سے بولا۔ ”یاد رکھنا کہ میں نے بھی تیری دماغی
 کیفیت پر پاگل پن کا شک پڑتا ہے۔“

میں اس رات گیش کی جانب سے کی گئی بات
 کو دل میں لگاے سو نہ سکا۔ مجھے بھی کوئی خیال نہ آتا
 کہ یہ کچھ۔ الغرض میں نے وہ رات بڑے کرب میں
 گزاری۔ میں صبح ہی صبح اپنے جانے والے ایک
 اپنے شخص کے پاس گیا جو کہ جادو وغیرہ کا کام کیا
 کرتا تھا۔ میں نے اسے اس جوڑے کے اوپر بچی کے
 بارے میں اور گیش کے دعویٰ کے متعلق بتلایا تو اس
 نے مجھے ملا جلا جواب دیا۔ ”اس زمین پر بعض دفعہ
 غیر انسانی مخلوق تفریح، دل بہلانے کے لئے آ جاتی
 ہیں اور عموماً آیا ہوتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی گردنوں
 کے نیچے جو مخصوص نشان تم بتا رہے ہو چکی بات ہے
 میں نے ایسی بات کسی مافوق الفطرت وجود کے
 بارے میں نہیں پڑھی ہے گیش کا دعویٰ غلط بھی ہو سکتا
 ہے اور سچ بھی۔“

لیکن اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ”تم اس الٹے
 سیدھے بے مقصد سوچ کو اپنے دل و دماغ پر سوار نہ
 کرو۔ بلکہ تم صرف اپنی مزدوری کرو اور ان سے پیسے
 انٹھو۔“

دو دن بعد وہ دونوں اپنی بچی کے ساتھ آئے۔
 گیش بھی ایک آدھ دفعہ ہمارے سامنے سے
 بڑی اکرے سے گزرا، حقیقت میں وہ ہمیں اپنے تئیں یہ
 بتلانا چاہتا تھا کہ میں یہاں سے گزر سکتا ہوں۔ یہ
 بازار سڑکیں سرکاری ہیں کسی کے باپ کی جاگیر نہیں
 ہے۔

ہم نے اسے نہ صرف دیکھتے ہوئے نظر انداز

کر دیا تھا بلکہ اسے کوئی لفٹ نہ دی تھی۔ اس نے اپنے
 ہاتھ میں پیلے رنگ کا ایک تھملا پکڑا ہوا تھا جو کہ خالی سا
 پچکا ہوا لگ رہا تھا ایک رات پھر بیاس سنگھ اپنی میم کے
 ساتھ آیا اس رات ان کے ساتھ فنیسی نہ تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”صاحب آج فنیسی نہیں آئی۔“
 ”بھئی وہ بھتی ہے کہ عبدل انکل کے قریب
 جو پاگل شخص نظر آتا ہے مجھے اس سے بڑا خوف آتا ہے
 اس کے پاس سے مجھے بدبو آتی ہے وہ بہت غلیظ ہے۔“
 ”سر کیا حکم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بنادو۔ ایک اسپیشل پلیٹ میم صاحبہ کے لئے
 اور ایک میرے لئے۔“

میم اس دن پہلے سے زیادہ انتہائی خوبصورت
 لگ رہی تھی۔ اس کی سفید اور گلابی رنگت کی آمیزش والا
 اس کا چہرہ اور اوپر سے گہری نیلی آنکھیں دیکھنے والوں
 کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔

”یار! اس کے چہرے پر دولت حسن کی کتنی
 شادابی ہے۔ آج تو میرا دل میرے قابو سے باہر ہو رہا
 ہے۔“ نورن بولا۔

ہاں یار تو سچ کہتا ہے۔ آج یہ واقعی انتہائی
 جاذب نظر لگ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ گول گپے
 کھاتی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

”آہستہ آہستہ کھاؤ۔“ بیاس سنگھ نے اس کی
 جانب پیار بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد گیش دور سے آتا ہوا مجھے نظر آیا
 وہ تیز قدم چلتا ہوا ہمارے قریب آنے لگا تھا۔ بیاس
 سنگھ نے غصیلی نظروں سے اس کی جانب دیکھا
 اور پھر اس نے چپتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور کہا۔

”اس پاگل بدبو دار شخص کو ہمارے قریب آنے
 سے روکو۔“ میں نے اپنی جگہ سے چلاتے ہوئے کہا
 ”اوئے تو اگر ہمارے قریب آیا تو یاد رکھ تیرے ساتھ
 بہت برا سلوک کروں گا۔“

میں نے ایک ڈنڈا اٹھایا جبکہ نورن نے دبی
 پھینکنے والا چوٹی کٹھنہ پکڑ لیا تھا۔ وہ اتنی سرعت انگیزی



موت کی مسکراہٹ

عشقانی - پشاور

کمرے کے ملگجے اندھیرے میں دو ہیولے نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زندہ وجود کو اپنے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ کر ہوا میں معلق کر لیا اور پھر دونوں چہت پر پھنچے اور دونوں وجود کو.....

عیش و نشاط کے گرداب میں غوطہ زن جسم پر سکتہ طاری کرتی ایک عبرت ناک روداد

”قسم اسے یہ بات بتائیں سکتیں..... وہ بہت ظالم ہے..... وہ تمہیں مار ڈالے گا۔“ اسد نے پر تشویش لہجے میں کہا۔
”اسد تم سوچو! اگر تم بتاؤ گے، تو وہ تمہیں قتل کر دے گا، وہ بہت ہی ظالم ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں ہی بتا دوں!“
”مگر افسے میں وہ تمہیں نقصان پہنچا دے گا۔“
”خیر کچھ بھی ہو! میں اپنا ذہن بنا چکی ہوں۔ اب میں مزید تمہارے بنائیں رہ سکتی!“
”میں بھی!“ اسد بیا بھر لہجے میں بولا۔

”قسم اسے یہ بات بتائیں سکتیں..... وہ بہت ظالم ہے..... وہ تمہیں مار ڈالے گا۔“ اسد نے پر تشویش لہجے میں کہا۔
”اسد تم سوچو! اگر تم بتاؤ گے، تو وہ تمہیں قتل کر دے گا، وہ بہت ہی ظالم ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں ہی بتا دوں!“
”مگر افسے میں وہ تمہیں نقصان پہنچا دے گا۔“
”خیر کچھ بھی ہو! میں اپنا ذہن بنا چکی ہوں۔ اب میں مزید تمہارے بنائیں رہ سکتی!“
”میں بھی!“ اسد بیا بھر لہجے میں بولا۔

سے زمین پر گر کر بے سادہ سا ہو گیا۔

میدو اس کی جانب لپکا اور ہم میم صاحب کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھے۔ میم جس کا سر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی صرف پشت نظر آ رہی تھی جو کہ مکمل طور پر کھر دردی بے رنگ سی ہوئی تھی کسی نے کہا ”میم صاحب کو اسپتال لے کر جاؤ۔“

”یہ میم نہیں ہے یہ بدروح ہے۔“ گنیش نے چلاتے ہوئے کہا، ہمیں اس کی بات کا یقین تو ہو گیا تھا کہ یہ واقعی کوئی بدروح ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اس پریشانی کی کیل دماغ میں گھس کر چھ رہی تھی کہ ”یہ ہوا کیا اور ہو کیا رہا ہے؟“ دماغ کچھ بچھے سے ماؤف ہو چکا تھا۔

اسی اثناء میں تھوڑی دیر بعد نرون نے میم صاحب کو پکڑ کر جب سیدھا کیا تو اس کا چہرہ اتنا بھیا بک، بالکل روکھا اور کراہیت انگیز ہو چکا تھا کہ وہ دیکھنے میں واقعی چڑیل لگ رہی تھی۔

نرون اسے دیکھ کر دیے اپنا حواس کھونے لگا، اس کے قدم لڑکھڑنے لگے تھے۔ جبکہ میدو وہاں سے پہلے ہی بھاگ گیا تھا۔

میری خوف کے مارے دھوتی خراب ہو گئی، وہ اب بیوی نہیں رہی تھی بلکہ مکمل چڑیل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بجلی کی مانند شدید جھٹکے سے اٹھی اور تیزی سے اٹھ کر ایک اندھیری گلی میں بھاگتی ہوئی غائب ہو گئی، اسے وہاں کسی نے روکنے کی کوشش اور ہمت بھی نہ کی تھی۔ ماحول میں شدید تباہی اور خوف کی فضا چھا چکی تھی۔

اس کہانی کا دوسرا دردناک پہلو راوی نے یہ بتلایا کہ گنیش نے اسی حالت یعنی بے ہوشی میں اپنی جان دے دی لیکن وہ اپنے دعویٰ کا کھر اٹکا تھا۔



سے ہمارے قریب آ گیا تھا کہ ہمیں اسے روکنے کا موقع تک نہ ملا۔

میں نے جب یہ دیکھا کہ وہ جنونی انداز میں ہماری جانب آ رہا ہے تو میں نے ایک زوردار ڈنڈا اس کے کندھے پر مار دیا۔ اس نے بڑے ڈھٹ سے انداز میں اپنے ہاتھ میں پکڑے تھیلے میں سے ایک بانسری نکالی اور اسے زور زور سے بجانے لگا۔ ہم اسے پکڑنے، مارنے کی کوشش کرتے تو وہ چوہے کی طرح اچھل کر ادھر ادھر سے بھاگنے لگتا لیکن اس نے اپنے منہ میں گلی بانسری کو نہیں چھوڑا وہ اسے مسلسل دیوانہ وار بجانے جا رہا تھا۔

میں اور نرون اسے مزید مارنے کیلئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ پیاس سنگھ اپنے منہ سے عجیب و غریب کتوں اور بیلیوں والی آوازیں نکالتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ اس نے اپنی بیوی میم کی بھی پرواہ نہ کی۔

دوسری جانب میدو نے چلا چلا کر مجھے اور نرون کو آوازیں دے کر متوجہ کیا کہ ”میم کو دیکھو کیا ہو رہا ہے؟“ ہم نے گنیش کو وہیں چھوڑا اور میم صاحب کی طرف لپکے میم صاحب کے ہاتھ میں موجود گول گیوں کی پلیٹ، چھوٹ کر زمین پر گر گئی تھی۔

میم صاحب کو بچانے کیلئے دورہ سا پڑ رہا تھا کہ جوں جوں اس کے کانوں میں بانسری کی تیز آوازیں پڑ رہی تھیں اس کی حالت غیر سے غیر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ چڑمڑ ہو کر سینے لگی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے کہ آج کل کے کسی بڑے غبارے میں سے ہوا نکل رہی ہو اور وہ غبارہ سکر رہا ہو۔ یہی ہی نہیں بلکہ اس کے جسم سے انتہائی بھیا بک بدبو آنا شروع ہو گئی تھی۔ وہاں موجود ہم سب نے اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھے اچھبے کی حالت میں اسے دیکھ رہے تھے۔

بہر حال گنیش اپنی بانسری کو تیزی سے بجاتے ہوئے پسینہ میں شرابور ہو گیا تھا پھر وہ اچانک دھڑام

”ابھی ہمارے پاس پورے 4 گھنٹے ہیں۔ وہ چار گھنٹے بعد آفس سے آئے گا۔“ لیلیٰ پریشانی کو جھٹک کر بولی۔

”مجھے بھی تمہارے ساتھ سکون ملتا ہے۔ اس ہوٹل کے کمرے میں ہم تم اکیلے ہیں۔ کوئی دوسرا نہیں ہے، میرے قریب آ جاؤ!“

”میں تمہارے قریب ہی تو ہوں۔“ لیلیٰ، اسد کے بالکل قریب آ گئی لیلیٰ نے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔ اور پھر دونوں دنیا دنیا فیما سے بے خبر جذبات کے طوفان میں چھیڑے کھانے لگے۔ تین گھنٹے تک دونوں ساتھ رہے۔ اس کے بعد لیلیٰ بولی۔ ”اسد مجھے جانا ہوگا، عمران آنے والا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ! میری بیوی مہر بھی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“

دونوں ایک ساتھ ہوٹل کے کمرے سے باہر نکلے اور باہر نکل کر مختلف سمتوں میں طے گئے۔

لیلیٰ وہاں سے سیدھی گھر چلی گئی اس نے ایک نگاہ اپنی کلائی میں بندھی گھڑی پر ڈالی پانچ بج رہے تھے عمران کی واپسی کا وقت ہو رہا تھا وہ کسی بھی لمحہ گھر میں داخل ہو سکتا تھا۔

لیلیٰ اپنے بیڈروم میں گئی اس نے الماری سے عمران کی شارٹ گن نکالی اور اسے اپنے بیڈ کے سرہانے رکھ دیا۔ اس نے جیسے ہی بیڈ کی چادر درست کی۔ اس کے کانوں میں عمران کی گاڑی کی مانوس آواز سنائی دی۔

اس کی گاڑی کیراج میں رک چکی تھی، اور اب وہ اندر آ رہا تھا اس کے قدموں کی آواز اب واضح طور پر اس کے آنے کی ثبوت دے رہی تھی۔

ایک منٹ بعد دروازے کی پینڈل گھمانے کی صاف آواز آئی عمران ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر زور سے بولا۔

”لیلیٰ! میں آ گیا ہوں۔ چائے کی بڑی سخت طلب ہو رہی ہے جلدی سے پلیز! ایک کپ چائے لاؤ۔“

گھر لیلیٰ نے سنی ان سنی کر دی جبکہ اس نے

صاف طور پر عمران کی آواز سنی تھی۔ عمران نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا پھر ڈرائنگ روم سے نکل کر اندر بیڈروم میں آ گیا۔

لیلیٰ نے جواب دینے کے بجائے عجیب نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ تو وہ رک گیا۔ اور کن آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا، اور پھر بولا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں تمہارا انتظار! تم نے چائے کیوں نہیں دی!“

”میں بہت زیادہ مصروف تھی۔“

”مصرف..... کیا مطلب کیا کر رہی تھی؟“

لیلیٰ نے پہلے سے خود کو تیار کر لیا تھا اور وہ بالکل جھگڑے کی موڈ میں تھی!

”میں اپنے ایک دوست کے پاس گئی تھی اور واپسی پر میرا جسم ٹھنکن سے چور چور ہو رہا ہے۔“

یہ سنتے ہی عمران کی آنکھیں حیرت سے جیسے پھٹ پڑیں!

”کیا کیا تم نے؟“

”سنا نہیں تم نے! ابھی کہ ایک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ تھی!“

”کیا بکواس ہے یہ؟ تم وہاں کیا کرنے گئی تھی؟“

”بھولے مت، نو عمران۔ جو میں کہہ رہی ہوں صاف طور پر سنو! میرا کسی کے ساتھ زوروں کا انجیر چل رہا ہے میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی میں تم سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔“

یہ سنتے ہی عمران کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، وہ دروازے کے چوکھٹ کا سہارا لیتے ہوئے نیچے پھسلتا چلا گیا اور بے دم سا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر جم کر رہ گئیں اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا وہ کچھ دیر تک اسی حالات میں بیٹھا رہا۔

اور پھر چند لمحوں کے بعد اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

اور جب اس نے خونی نظروں سے لیلیٰ کو دیکھا تو وہ کانپ کر رہ گئی، خوف کی ایک سرد برقی لہر اسے اپنی

ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی ”کون ہے وہ کینہ؟“ عمران نے دھاڑتے ہوئے پوچھا!

میں جانا چاہتا ہوں کون ہے وہ؟ ”عمران کا لہجہ زہر خند تھا“

”یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تم مجھے آزار کر دو۔“ لیلیٰ نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

عمران غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھوں کی منجھیاں غصے سے پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔

”میں نے تم سے سوال کیا ہے وہ کون ہے؟“ اس کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔

”میں کسی بھی قیمت اس کا نام نہیں بتاؤ گی۔“

لیلیٰ کی بات سن کر عمران آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگا جبکہ لیلیٰ خوف سے سمٹ کر رہ گئی۔

نزدیک پہنچ کر عمران نے اپنے ہاتھ سے لیلیٰ کا گال ہونچ لیا، لیلیٰ خوف کی شدت سے بری طرح ہانپنے لگی۔

اس کے بعد عمران نے اپنے ہاتھ سے لیلیٰ کو اوپر اٹھایا لیلیٰ زمین سے ایک فٹ بلند ہو گئی اس کے بعد عمران کے مضبوط ہاتھوں نے لیلیٰ کو زمین پر زور سے دے مارا اور پھر اس کے اوپر جھکتے ہوئے بولا ”بتا کون ہے وہ؟“

لیلیٰ کو عمران کی دھمکنی کی طرح چلتی ہوئی سانس صاف طور پر محسوس ہو رہی تھیں۔

”بتا۔“ عمران نے ایک بار پھر لیلیٰ کا گلہ دہیچے ہوئے کہا۔

لیلیٰ نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی اور بولی ”مجھے چھوڑ دو، میرا گلے میں سانس گھٹ رہا ہے۔“

عمران نے یہ سنتے ہی اس کے گلے پر مزید دباؤ بڑھایا۔ اور غصے سے بولا۔

”ابھی تو میں نے حقیقت میں کوئی گزند نہیں پہنچائی ہے۔“

لیلیٰ اپنا حلقوم چھڑانے کے لئے ہاتھ بچر چلانے لگی۔

اور پھر اچانک عمران کے ہاتھوں کے درمیان اس نے ایک زوردار لٹ مار دی۔ جس سے عمران دہرا ہو کر پیچھے ہٹ گیا، مگر فوراً اس نے لیلیٰ کے جڑے پر ایک زوردار کھوسا جڑ دیا۔ جس سے لیلیٰ کی بھیاں کج چھٹ گئی۔ پھر اس کے گلے پر اسے اپنی گرفت ختم کر دی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ دروے دہرا ہو رہا تھا۔ پھر سنبھل کر لیلیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔

لیلیٰ جیسے ہی عمران کی گرفت سے نکل، وہ جلدی جلدی لمبے لمبے سانس لینے لگی اور فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

عمران نے اسے ٹھوکر مارا۔ اور پھر اس کے بالوں کو گرفت میں لے لیا۔

بالوں سے پکڑ کر اس نے لیلیٰ کو کھڑا کیا اور زور سے اسے بستر پر پھینک دیا اور پھر ہمیشہ کی طرح اپنی شرٹ اتارنے لگا۔

لیلیٰ کا وجود درد سے دکھ رہا تھا اس کا وجود درد کا آہاہ چگاہا بن گیا تھا وہ کراہ رہی تھی وہ اپنی اس کیفیت کو درست کرنے کے لئے لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی اس نے جلد ہی اپنی سانسوں پر قابو پایا۔

اب عمران شرٹ کے بغیر اس کے سامنے کھڑا تھا، لیلیٰ نے دوسرے ہی لمحے جست لگائی اور بیڈ کے سرہانے سے شارٹ گن نکال لی جو اس نے عمران کے آنے سے کچھ دیر قبل وہاں چھپائی تھی، اس نے شارٹ گن کا رخ عمران کی جانب کرتے ہوئے کہا۔

”بس..... مجھ پر تمہارا یہ ظلم آخری بار تھا۔“

”یہ..... یہ کیا ہے؟ دیکھو!..... دیکھو..... تم کوئی مت چلاؤ؟“ وہ ہکھلانے لگا۔

لیلیٰ نے شارٹ گن کی نال کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کیا۔

”نہیں، بہت سہمہ لیا میں نے تمہارا ظلم اگر تم ایک اچھے شوہر ہو تے تو میں بھی اپنے لئے دوسرا سہارا تلاش نہیں کرتی تم جانور ہو، ذلیل انسان، اب تم مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

”مم..... مم..... مجھے مت مارنا، میں تمہیں

ڈراما سچیت کی مشہور معروف کتابیں

75/-	پراسرار کہانیاں
75/-	دہشت ناک کہانیاں
75/-	حیرت انگیز کہانیاں
75/-	خوفناک کہانیاں
75/-	ڈرامائی کہانیاں
75/-	آئینی کہانیاں
75/-	بھیا ناک کہانیاں
75/-	خوفزدہ کہانیاں
75/-	ناگ دیوتا (مکمل ناول)
75/-	پشپاز دیوی (مکمل ناول)
75/-	پھندا (مکمل ناول)
75/-	قیدی روحیں (مکمل ناول)
75/-	غیبی آواز (مکمل ناول)
75/-	روح بیتی (مکمل ناول)
150/-	یوقاف (مکمل ناول) جلد
150/-	مداری (مکمل ناول) جلد
150/-	طلسم زاد (مکمل ناول) جلد
150/-	ہنت فرعون (مکمل ناول) جلد
150/-	ہمزاد کا عشق (مکمل ناول) جلد
150/-	بھنور (مکمل ناول) جلد
450/-	چادوگر (مکمل ناول) جلد
200/-	اوتار (مکمل ناول) جلد
60/-	لے ہاتھ
60/-	بھکتی روح
60/-	لاش کا ہنگامہ

شمع بک ایجنسی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

حرام خور، میرے ہوتے ہوئے تم نے کسی اور کو ہاتھ لگانے کی کوشش کیے کی۔“

اسد نے بڑی مشکلوں سے، مہرہ کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”میں آگ لگا دوں گی، اس گھر کو، نام بتاؤ مجھے اس کمینے عورت کا۔“ مہرہ بذیاتی انداز میں چیخی!

”بائبل عورت نکل میرے گھر سے، تو نے میرے گھر کو دوزخ بنا کے رکھا ہے، ہر وقت شرک، ہر وقت کسی پولیس کی طرح مجھ سے طرح طرح کے سوالات میں گویا اپنے ہی گھر میں مجرم بن کے آتا ہوں۔“ اسد دھاڑا۔

”کیا کہا، میں نکلوں اس گھر سے، ذلیل آدمی۔“ مہرہ نے ٹیبل لیپ پر سے گلہ بان اٹھا کر اسد پر دے مارا۔ وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر اسد کو مارنے لگی وہ بری طرح چیخ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں نکل رہا تھا۔ اسد بڑی مشکلوں سے اس کی بھینگی ہوئی چیزوں سے خود کو بچاتا رہا۔ جبکہ جہاں جہاں پر مہرہ نے اس کے چہرے پر خراشیں ڈالی تھی وہ بھی سو جن کی وجہ سے شدید درد کر رہی تھی۔

مہرہ نے ویوار سے وال کلاک اتارا اور اسد کی طرف زور سے پھینک دیا، وال کلاک، اسد کے کندھے پر لگا، وہ پوری قوت سے ڈگمگایا، وال کلاک کا شیشہ چھتا کے کی آواز سے ٹوٹ گیا کئی شیشے کے باریک ٹکڑے اس کی گردن میں لگے۔

خون کی باریک پتلی کبیریں، اس کے سفید شرٹ کو سرخ کرنے لگیں۔ جبکہ مہرہ اسد کی پرواہ کئے بغیر بدستور چیخ کر بولی۔ ”بتا مجھے وہ کون ہے؟ ورنہ میں اس گھر کو آگ لگا دوں گی۔“

”نہیں بتاؤں گا۔ جو کرنا ہے کر لے؟“ اسد غصے سے تھپیاں بھینچ کر بولا۔

”نہیں بتائے گا۔“ مہرہ چیخی، اور ایک بار پھر غصے سے اسد کی طرف بڑھی۔ اس نے جیسے ہی اپنے ہاتھ اسد کی گردن کی طرف بڑھائے۔

معمول مہرہ کی وی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور ٹی وی پر ساس بھوکی جھگڑا وسیلہ دیکھ رہی تھی۔

”کہاں سے آ رہے ہو؟“ مہرہ نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا؟

کہاں سے آؤں گا، ظاہر سی بات ہے آفس سے ہی آ رہا ہوں۔“ اسد نے بے زار لہجے میں کہا۔

”یہ تو میری بات کا جواب نہیں۔ سچ بتاؤ مجھے کس کے ساتھ رنگ رلیاں منارہے تھے، کس سچ ذات کے ساتھ وقت گزار رہے تھے۔“

”بکواس بند کرو۔ میرے سر میں شدید درد ہے مجھے تنگ مت کرو۔“ اسد بولا۔

”میں نے تمہارے آفس فون کیا تھا، تم آج آفس نہیں گئے، میں نے تمہارے دوستوں کو بھی فون کئے مگر تم کسی کے پاس نہیں تھے اور تمہارا فون بند تھا۔“

مہرہ، چیخ چیخ کر بولی، اس کی تنبیہ کرتی ہوئی انگلی اسد کے چہرے کے سامنے آگئی۔ ”بتاؤ مجھے بے حس انسان کس کے ساتھ گناہ کر کے آئے ہو؟“

”ذلیل عورت، تم نے میری زندگی جہنم بنادی ہے۔ ایک سال سے تم بے جا شک کی بنیاد پر مجھ پر بہتان لگاتی آئی ہو۔“

مگر سن لو! آج میں تمہارے شک کو یقین میں بدل دیتا ہوں۔

میں ہوٹل میں تھا ایک دوست کے ساتھ بڑا حسین وقت گزارا اس کے ساتھ ایک مہینہ ہو گیا ہے میرا اس سے انفر چل رہا ہے اور اب میں اس کے معاملے میں سنجیدہ ہوں میں اسے اس گھر میں لانے والا ہوں۔“

اسد نے سرخ نظروں اور تیز آواز سے مہرہ کی تنبیہ کرتی ہوئی انگلی جھٹک کر ہٹادی۔

مہرہ سن کر ایک لمحہ کے لئے سن سی ہو گئی مگر وہ جلد ہی سنبھل گئی اور ہمیشہ کی طرح اس بار بھی چیخی چلاتی

اسد پر بھٹ پڑی اس نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے اسد کے چہرے پر کئی گہری خراشیں ڈال دیں۔

”میں تم کو آگ لگا دوں گی۔ بے وفا انسان

آزاد کروں گا۔۔۔۔۔“ عمران ہٹکایا۔

”نہیں، تم بہت ظالم ہو، میرے بعد کسی اور کا جینا دوشوار کرو گے۔“

”اور پھر لیلی نے شارٹ گن کا ٹریگر دبا دیا، ٹریگر دباتے وقت وہ بیچانی ہنسی ہنس رہی تھی جبکہ موت کے خوف سے عمران کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اس کی ٹانگیں خوف سے کانپ رہی تھیں۔

لیکن یہ کیا ایک کھوکھلے کھٹکے کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیا۔

لیلی بھونچکی رہ گئی۔

عمران کی آنکھیں جو چند لمحے پہلے خوف و دہشت سے بھٹی پڑ رہی تھیں، اب ان میں آگ برسنے لگی تھی، اس نے لپک کر شارٹ گن لیلی کے ہاتھ سے چھین لی اور اوٹڈ شارٹ گن کے جیبیر میں داخل کرتے ہوئے حقارت سے بولا اب تو مرنے کے لئے تیار ہو جا۔

لیلی نے عمران کی انگلی کو شارٹ گن کے ٹریگر پر حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً پیچھے ہٹنے لگی، وہ اس سے چند فٹ دور چلی گئی۔

”سن! بذات عورت اگر تو مجھے اس کتے کا نام بتا دے، تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“ عمران نے تھوک نکلے ہوئے بولا۔

جواب میں لیلی نے نفی میں سر ہلایا اور آنکھیں فوراً بھینچ لیں، عمران نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا اور پھر ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا۔

☆.....☆.....☆

اسد نے گاڑی کیراج میں روکی، اور گاڑی سے اتر کر کیراج میں کھڑی مہرہ کی گاڑی کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔

”منٹوں ابھی تک گھر پر ہے۔ کہیں بھی نہیں گئی؟“

ایک منٹ بعد وہ داخلی دروازے سے گھر کے اندر چلا گیا سب سے پہلے وہ لاؤنج میں گیا، حسب

اسد نے زندگی میں پہلی بار، ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر چڑھایا تو تراخ کی گونجاہٹ اس کے منہ سے نکلی۔
”تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ دفع ہو جاؤ، میرے گھر سے، میری زندگی سے میرے دل سے! دور چلے جاؤ، تم نے میری زندگی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“ وہ بھیانک انداز میں پوری قوت سے چیخی۔

”افسوس! مجھے تم پر یہ ہاتھ اس وقت اٹھانا چاہئے تھا جب پہلی بار تم نے مجھ پر شک کیا تھا۔“ اسد بھی غضب ناک ہو کر گر جا۔

”تم ابھی دیکھو، میں کرتی کیا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت اپنے بھائیوں کو فون کر کے بلانی ہوں۔ پانچ بھائیوں کی اگلی بن ہوں میں۔ اب میں تمہارا کیا شہر نشہ کرتی ہوں۔“ وہ جتنی چنگھاڑتی فون کی طرف بڑھی۔
اسد نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ اور پوری قوت سے فون کا سیٹ زمین پر پھینک مارا۔
”تمہارے بھائیوں کے بے جالاؤ بیارنے تمہیں ایسا مل بنا دیا ہے تم پاگل ہو میں نے زندگی کا ایک سال تجھ پاگل کے ساتھ گزارا ہے، یہ کب صرف میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔“

”تراخ“ اسد کے منہ پر مہر کا ایک زانا دار طمانچہ پڑا۔

”کیا کہا تم نے مجھے، پاگل.....“ اس کا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ اسد نے پوری قوت سے طمانچہ اسے لوٹا دیا۔ جس سے مہر دو زمین پر لڑھک گئی۔

وہ دونوں خونخوار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

مہر چیخ کر بولی۔ ”جاری ہوں میں اپنے بھائیوں کو کہنے، یہ سب حساب سودسیت بے باقی کردوں گی، تمہارا تیار رکھنا، اس گھر سے تمہیں نکالوں گی، فٹ پاتھ پر ہو گے، ہاتھ پیر زرداؤں کی، بھیک مانگنے کے قابل نہیں چھوڑ دوں گی اور تمہاری اس محبوبہ کے چہرے پر تیزاب پھینک کر نہ جھلایا تو میرا نام بھی مہر وکمال نہیں۔“

وہ تن فٹ کرتی ہوئی ہمیشہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی اپنے بھائیوں کو کھینٹ کر لاتی تھی اور گھر کے داخلی دروازے سے نکل گئی، وہ کیراج کی طرف گئی اور وہاں سے اپنی ریڈ کرولا کار نکالی۔ اور زن سے باہر لگئی۔

اسد اطمینان سے کمرے کی کھڑکی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔
ریڈ کرولا، جیسے ہی مین گیٹ سے نکلے۔

اسد زیر لب بڑبڑایا۔ ”گڈ بائے میری پیاری مہر!“

☆.....☆.....☆

پلی کے قتلوں میں شدید ملین ہوئے گی اور پھر ایک زوردار دھب کی آواز آئی جیسے کوئی بھاری شے فرش پر گری ہو۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔
پلی نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں اور عمران کے بے جان جسم سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو کھورنے لگی۔

شارٹ گن عمران کی لاش کے پاس پڑی تھی۔
شارٹ گن کا ہیرل اور فریم پھٹ کر مڑی تری حالت میں ہو چکے تھے۔

عمران کا پورا چہرہ سج ہو گیا تھا اور اس کے جسم کے ارد گرد خون اور گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے، کہیں کہیں دھات کے ٹکڑے بھی نمایاں تھے، جو عمران کے منہ پر بیٹھے ہوئے ہو چکے تھے۔

سخت تکلیف کے باوجود پلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھرتی آئی۔

وہ سوچنے لگی کہ اس بات کے خلاف کوئی قانون نہیں ہے کہ کوئی بوی اپنے شوہر کی شارٹ گن کے ہیرل میں دھات جوڑنے والا سلوشن ڈال کر اسے اس طرح مضبوطی سے بند کر دے کہ فائر ہونے کے بجائے کارٹوس اندر ہی چل جائے، اور شارٹ گن کو چھاڑ دالے۔

پلی پہلے سے خود کو تیار کر چکی تھی کہ پولیس کو کیا

بیان دینا ہے۔ پولیس یہ بیان بلا عذر قلم بند کر لے گی کہ اس کا شوہر ایک تشدد پسند شخص تھا اور وہ اپنی بیوی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ مگر قتل کے نتیجے میں مشتہ قاتل کی حادثاتی موت واقع پڑ ہوئی اور پلی کو قتل کرنے والا خود قتل ہو گیا مگر ہم نکتہ یہ بھی تھا کہ پلی کو اس نظر سے بھی دیکھا جاتا کہ وہ مظلوم عورت جو زور شوہر کی تشدد برداشت کرنے والی موت کے منہ میں جانے سے بچ گئی۔
پلی نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور بڑبڑانے لگی۔
”یقیناً اسد نے بھی اپنی پاگل بیوی کو ٹھکانے لگانے کا پھر پورا انتظام کر دیا ہوگا۔“

☆.....☆.....☆

اسد بدستور کھڑکی میں کھڑا تھا۔ وہ خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا اس کی گردن اور چہرے پر کئی خوبی خراشیں تھیں، مگر اس نے اس کا ذرا بھی پرواہ نہیں کی، اسے یقین تھا کہ مہر وہ اب بھی اس گھر میں نہیں آئے گی اور نہ ہی وہ وہ دوبارہ اس کی زندگی میں طوفان برپا کر سکے گی۔

مہر کی ریڈ کرولا کار تیز رفتاری سے شہر کے سڑکوں پر رواں دواں تھی، اس کے بڑے بھائی کے گھر کا فاصلہ نصف گھنٹے کی دوری پر تھا۔ مگر وہ جلد سے جلد اس کے پاس پہنچ جانا چاہتی تھی۔

گاڑی کے شیشے بند تھے، اور اچانک مہر کو محسوس ہوا کہ اس کی گاڑی میں عجیب سی بو محسوس ہو رہی ہے۔

مہر نے جلد سے بریک پر پاؤں رکھا۔ مگر یہ کیا بریک تھیں ہو چکے تھے۔ ”اوہ مانی گاڑی۔“ مہر زیر لب بڑبڑاتی گاڑی پہاڑی پر سے نیچے کی طرف ڈھلان میں اترتی جا رہی تھی۔ بومیں اضافہ بدستور ہو رہا تھا اور مہر پریشانی سے بار بار بریک پر پاؤں مار رہی تھی مگر اس کی کوشش ناکامیاب ہو رہی تھی۔ گاڑی کسی بھی طور پر رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

مہر کے ذہن میں اسد کی گونج سنائی دینے لگی۔
”میں ہوٹل میں تھا ایک عورت کے ساتھ بڑا

میں وقت گزارا۔ اس کے ساتھ ایک مہینہ ہو گیا ہے میرا اس سے اخیر چل رہا ہے اور میں اس کے معاملے میں سنجیدہ ہوں۔ میں اسے اس گھر میں لانے والا ہوں۔“

”نہیں۔“ مہر پوری قوت سے چیخی، وہ حد درجہ پریشان تھی وہ جب بھی پریشان ہوتی تھی تو جلدی سے سگریٹ سلگا لیتی تھی اس نے اپنی کار کے ایش بورڈ سے سگریٹ نکالی اور اسے ہونٹوں کے درمیان رکھ لیا وہ لائٹر تلاش کرنے لگی مگر اس کے اعصاب کنٹرول میں تھے، وہ گاڑی پر مکمل گرفت رکھے ہوئے تھی پالا خراس لائٹر مل گیا وہ جیسے ہی لائٹر سے سگریٹ جلانے والی تھی اچانک اس کے موبائل کی تیل بج اٹھی۔

مہر نے موبائل نکال کر دیکھا اس کے اسکرین پر اسد کا نام جگمگا رہا تھا، مہر کا دل چاہا کہ موبائل گاڑی سے باہر پھینک دے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے کال اینڈنگ کی۔
”کیسے کہتے تم نے میری گاڑی کی بریک فیل کی ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔“

”پہلے خود کو تھو پھالو پھر مجھے دیکھنا اور ہاں مرتے وقت چیخنے نہیں۔“ اسد کی مکروہ ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔

”کیسے، ذلیل،“ مہر چیخ کر گرجی۔
”جو گرجتے ہیں وہ رہتے نہیں۔“ ہاہا ہاہا.....

اسد نے قہقہہ لگایا تو مہر نے غصے سے موبائل بند کر دیا اور پوری قوت سے موبائل کو سیٹ کے پیچھے پھینک دیا۔
جو سگریٹ اس کے ہونٹوں سے گری تھی اس نے اسے دوبارہ اٹھا کر ہونٹوں میں دبایا اور لائٹر نکال کر کیش کیا۔
لائٹر جیسے ہی جلا پوری گاڑی کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا مہر کی بھیانک چیخ گونج کر رہ گئی۔ سی این جی سینڈ رو دھماکے سے پھٹ گیا گاڑی سڑک سے اڑتی ہوئی ہوا میں معلق ہو گئی اور چند لمحوں میں فلا بازیاں کھاتی ہوئی زمین پر اترنے نہ گئی۔

جلتی ہوئی گاڑی میں زخمی مہر چلنے لگی اور کچھ ہی دیر میں زندگی سے اس کا ناطو ٹوٹ گیا۔



انتقام

نظارت نصر- فیصل آباد

ہر طرف رات کا ہیبت ناک ماحول طاری تھا، اسٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکا مردہ برف کی طرح ساکت پڑا تھا کہ اچانک اس میں حرکت پیدا ہوئی، وہ کسمساتے ہوئے اسٹریچر پر اٹھ بیٹھا اور پھر.....

دلخراش، دلفگار، دہشت ناک اور تجیر انگیز کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفہ کہانی

مگر مجبوری تھی جب بھی اس کی ڈیوٹی یہاں لگتی اسے چاروٹا چار آٹا ہی پڑتا اور سب سے زیادہ ستم اس وقت ہوتا جب اس کی بیڈیوٹی ٹائٹ میں لگ جاتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

”کیا تھا اللہ میاں! اگر میری ڈیوٹی آج اس جگہ نہ لگتی۔“ اس کا دل چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ روزی روٹی کے اس سلسلے کو بند کر کے وہ کھاتی کہاں سے۔ پہلے ہی اسپتال میں پتہ

اسپتال کی خوبصورت عمارت میں یہ ایک

بدصورت حصہ تھا۔ اگرچہ عمارت تو اس حصے کی بھی ویسی ہی عالی شان تھی مگر اس کی بدصورتی کی وجہ دراصل اس کا پوسٹ مارٹم روم ہونا تھا۔

یہاں پر اکثر اوقات عجیب کٹی بھٹی، جلی ہوئی قبر سے نکلی ہوئی رخشہ لاشیں لائی جاتی تھیں جن کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا تھا تاکہ یہ پتہ چلا جاسکے کہ ان لوگوں کو اگر کسی نے قتل کیا تھا تو کیسے کیا تھا۔ کئی اس اسپتال میں کام کرنے والی ایک نرس تھی۔ اسے سب سے زیادہ نفرت اسی شعبے سے تھی،

شادی کی پہلی رات میں دونوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ ہم دونوں غنی خوشگوار زندگی کا آغاز کریں گے نہ بھی بھینچی زندگی کا کوئی طعنہ تشنہ ایک دوسرے کو دیں گے نہ کوئی بے بنیاد شک ایک دوسرے پر کریں گے، نہ مار پیٹ سے کام لیں گے، ہم اپنے بچوں کے لئے مثالی جوڑا بنیں گے جن کا آئیڈیل ہر ماں باپ بننا چاہے گا۔

وہ دونوں اپنی مون منانے کے لئے دوسرے دن ہنی مون منانے کے لئے دینی جانے والے تھے دونوں کی خوشیاں دیکھنے کے قابل تھیں، دونوں مستقبل کے تانے بانے بنتے رہے، اسد کی جان اپنی بیوی اور لیلیٰ کی جان اپنے شوہر سے چھوٹ گئی تھی۔ خوشیوں میں مگن رات کے آخری پہرہ وہ دونوں نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

لیکن وہ آنے والے وقت سے بے خبر تھے، ان کے قریب ہی موت کھڑی ان پر مسکرا رہی تھی۔

نیند کی آغوش میں گئے انہیں ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اندھیرے کمرے میں دوروشن ہیولے نمودار ہوئے ایک ہیولے کی عورت کا جبکہ دوسرا ہیولہ ایک مرد کا تھا۔

دونوں ہیولے ہوا میں معلق آگے کو بڑھے اور گہری نیند میں غرق لیلیٰ اور اسد کو دونوں نے اپنے ہاتھ کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ مرد ہیولے نے لیلیٰ کو اور عورت ہیولے نے اسد کو جکڑ رکھا تھا۔

اسد اور لیلیٰ دونوں بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ ان دونوں کو لے کر وہ دونوں ہیولے چار منزلہ مکان کی چھت پر پہنچے اور بڑی سفاکی سے دونوں کی گردنوں کو پہلے توڑا اور پھر دونوں کو چھت سے نیچے زمین پر دے مارا۔

اسد اور لیلیٰ کی لاش زمین پر بے یار و مددگار پڑی تھی۔ پھر دونوں ہیولے اپنی اپنی سمت روانہ ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گئے۔



آدھا گھنٹے کے اندر اسد کی گاڑی کے آگ پر قابو پایا گیا اس کی آدھ جلی بھیا نک لاش گاڑی سے نکال کر ایبوسٹنس میں ڈال کر مقامی اسپتال لے جایا گیا۔ گاڑی اور مہرہ دونوں کا حال بد سے بدتر ہو چکا تھا دونوں پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔

اسد کو آدھے گھنٹے کے بعد اطلاع مل چکی تھی۔ اطلاع ملنے ہی وہ خوشی سے پھولے نہیں سارہا تھا۔

رات کو ہی اسد نے مہرہ کے کار کے بریک فری کر دیے تھے۔ اور سی این جی سیلنڈر کے وال ڈھیلے کر دیے تھے، کہ کار اسٹارٹ ہوتے ہی پریش کی وجہ سے سی این جی گاڑی میں پھیل جاتی اور دوسری بات یہ جو اسد کو معلوم تھی وہ یہ تھی کہ مہرہ کی جین اسو کرے۔ اور وہ پریشان ہو تو سب سے پہلے سگریٹ سلگا لیتی ہے۔ اس لئے اسد نے نہایت ہی بھیا نک موت کا جال مہرہ کے لئے بچھایا تھا۔

اور مہرہ والا خرموت کے بھیا نک شکنجے میں جکڑ کر اس دنیا سے دور چلی گئی۔

مہرہ کے بھائیوں نے مہرہ کی موت پر شدید ہنگامہ کیا۔ مگر گاڑی اس قدر جل چکی تھی کہ کوئی ثبوت وہ اسد کے خلاف ثابت نہیں کر سکے اور بعد میں معاملہ سی این جی کے سیلنڈر پھٹنے پر ڈال دیا۔

مہرہ کی آخری رسومات اس کے بھائیوں نے نہایت احترام و عقیدت سے ادا کیں اور اسد نے بھرپور شرکت کی۔ جبکہ مہرہ کی آخری رسومات میں اسد نے خود کو بہت ہی زیادہ افسردہ ظاہر کیا۔

دوسری جانب لیلیٰ بھی صاف طور پر بچ گئی کیونکہ اس کے شوہر کی لاش کی حالت ایسی ہی تھی۔ جیسے وہ لیلیٰ پر تشدد کرتے کرتے موت کے منہ میں چلا گیا ہو، لیلیٰ کے جسم پر موجود نیل اور تشدد کے نشانات نے بھی اسے اچھا خاصہ مظلوم بنایا۔ عمران کی جتنی جائیداد تھی وہ اس دن موت کے بعد لیلیٰ کو مل گئی۔ اور لیلیٰ کو ایک ظالم شخص سے نجات مل گئی۔ لیلیٰ نے اپنے عدت کے دن پورے کئے اور پھر سادگی سے اسد سے شادی کر لی۔

اس لئے سب ترس ہی اس سے بچ کر رہی تھیں مگر سہیلی کی شاید قسمت بری تھی کہ وہ اسے دیکھ کر خونخوار ریشہ ختمی ہونے لگا جتنا تھا وہ ٹھٹھا بیٹھا بولتا تھا ہی سہیلی کو برا لگتا اس کا دل چاہتا کہ وہ کنی دس اس کا بھی پوسٹ مارٹم کر ڈالے کیونکہ فراز کی ڈیوٹی ہمیشہ صرف اسی شعبے میں ہوتی تھی کیونکہ یہاں کام کم ہی ہوتا تھا۔ لیکن وہ اپنی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ فراز کو نظر اتنا زکریا کے اس نے کاغذات کا پلندہ اپنی طرف کھکھکایا۔ اور انہیں رتبہ اور فاقوں میں لگانے لگی کچھ رپورٹیں تھیں انہیں اس نے لفافے میں بند کر کے مہر لگا دی۔ وہ کام میں مصروف تھی اور فراز اسے کہنے میں زچ ہو گئی۔

Dar Digest 8

9 May 2013

ہے۔ نئے لپے لوپر سے مردے کو بچھا اور اس کا دل
Dar Digest □

دھڑکنا بھول گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ابھو بیٹی! اتھوڑا سا کھانا کھا لو۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

سُملی اپنے بستر پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی جب اس کی ماں اس کے لئے کھانے کی ٹرے لے کر آئی۔ مگر سُملی خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ اس کی ماں نے زبردستی دو چار لقمے اسے کھلائے اور برتن لے کر چلی گئی۔ اس جادے کو بیٹے تقریباً ہفتہ ہو گیا تھا مگر ابھی تک سُملی صدمے سے باہر نہیں نکل سکی تھی فراڈ کو گرفتار کر لیا گیا تھا کیونکہ خنجر پر اس کے منکر پرنس مل گئے تھے اس نے اعتراف بھی کر لیا تھا کہ سُملی اس کی محبت کا مذاق اڑاتی تھی اس لئے غصے میں آ کر اس نے سُملی کو قتل کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اس رات اسے مردے کے چنگل سے جوئیہ ڈاکٹر کی اسی ٹیم نے نکالا تھا جو مراد کو مٹانے چلی گئی تھی۔ جب وہ واپس وہاں آئے تو یہ دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے کہ مردہ سُملی کو گود میں لئے اس کا خون پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکیاں تو جیجیں مارتی ڈر کر دوڑ گئیں جبکہ چند ایک جی دار لڑکوں نے مردے پر حملہ کر دیا جو جھک کر سُملی کا خون پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک زبردست ٹھوکر لگنے پر مردہ ایک طرف لڑھک گیا۔ اور سُملی اسی طرح اسٹریچر پر پڑی رہ گئی ان ڈاکٹرز نے اسے سمجھ لیا۔

اس کے بعد اس خوف کی وجہ سے وہ ہوش میں آتے ہی بے ہوش ہو جاتی تھی اس لئے اسے کئی دن تک اسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔ وہاں سے ڈسچارج ہو کر وہ گھر آ گئی۔ لیکن خوف اس کے اندر پنچے گاؤں کی بیٹہ گیا تھا۔ وہ پھر اسپتال نہ جا سکی۔

باہر شاید رات اتر آئی تھی کیونکہ اس کی ماں نے کمرے کی لائٹ جلادی تھی۔ وہ خاموشی سے پھر بستر پر لیٹ گئی۔ اسی وقت اس کی ماں اندر آ گئی لوڈ شیڈنگ کا وقت ہونے والا تھا اس نے ایک طرف رکھے کینڈل اسٹینڈ میں لگی تینوں موم بتیاں روشن کر دیں دو منٹ بعد لائٹ چلی گئی۔

سُملی خاموشی سے لیٹی ان موم بتیوں کی طرف دیکھتی

رہی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ وہ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی مگر وہ دھیان سے نہیں سن رہی تھی۔ اسی وقت ایک زبردست ہوا کا جھوٹکا آیا اور تینوں موم بتیاں بجھ گئیں۔ اس کی ماں نے انہیں دوبارہ جلانے کے لئے اٹھنا چاہا مگر سُملی نے اس کا ہاتھ تھام لیا مجھ سے دور مت جاؤ لالہ۔“ ماں پھر سے بیٹھ گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

سُملی نے سامنے والی دیوار کی طرف دیکھا وہاں دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ ان کی چمک اتنی تیز تھی کہ سُملی کا سانس سینے میں اٹکنے لگا وہ کوشش کے باوجود اپنی نگاہ وہاں سے ہٹا نہ سکی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں بڑی ہونے لگیں اور پھیلنے پھیلنے پوری دیوار پر محیط ہو گئیں۔

سُملی کا سارا جسم یوں لرز رہا تھا جیسے اسے جاڑے کا بخار چڑھا ہو۔ اس کے لرزے بدن کو محسوس کر کے اس کی ماں نے پوچھا ”کیا بات ہے“ مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس نے پلٹیں جھپک کر دیکھا اب سامنے کا منظر تبدیل ہو چکا تھا اب سامنے اسی مردے کا منہ دکھائی دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اندھیرے میں اس کا پورا وجود ظاہر ہو گیا وہ ایک سفید لبادے بلکہ کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے اپنے انگوڑے ہونے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے تو سُملی چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

اس کی ماں نے بڑی کوشش کر کے اسے پھر سے ہوش دلایا۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”بیٹی! آخر تجھے کیا دکھائی دیتا ہے مجھے بھی تو کچھ بتا۔“ سُملی رونے لگی اس نے ماں کے کندھے سے سر ٹکا کر کہا۔

”امی ایک مردہ ہے وہ میرا خون پینا چاہتا تھا لیکن اس وقت ڈاکٹر وہاں نہ تھے اس سے بچا لیا۔ مگر اب جب بھی اندھیرا ہوتا ہے مجھے ڈر آنے پہنچ جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایک نایک دن وہ مجھے ماڈلے گا۔“

اس کی ماں نے اسے تسلی دی۔

”تم حوصلہ رکھو بیٹی میں ایک ایسے بزرگ کو جانتی ہوں جو جن بھوتوں کے حامل ہیں۔ کل میں تمہیں ان کے

پاس لے جاؤں گی۔ دیکھنا وہ اس مردے کے بھوت کو ایک منٹ میں چلا کر اٹھ کر دیں گے۔“

سُملی کو اپنی ماں کی ایسی باتیں سن کر کافی حوصلہ ہوا۔ اور پھر کچل بھی آ گئی تو وہ پرسکون ہو کر سو گئی۔ آدھی رات کے وقت اس کی پھر سے آنکھ کھٹی اس کی چار پائی زور زور سے مل رہی تھی اس نے چیخنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی چند لمحوں بعد چار پائی ہٹا بند ہوئی سُملی نے دیکھا کہ اس کی ماں اس کی برابر والی چار پائی پرسکون سے گہری نیند سوئی ہوئی تھی چار پائی کے ہٹنے جلتے کوٹا تاہم جان کر سُملی نے آنکھیں پھر بند کر لیں چند لمحوں بعد چار پائی پھر سے ملی۔ سُملی نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

مگر کمرے میں گھب اندھیرا چھایا ہوا تھا سامنے کچھ فاصلے پر وہی آنکھیں روشن ہو گئیں ان میں غضب اور شیطانت صاف نظر آ رہی تھی۔ سُملی کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔ آنکھیں پھیلنے لگیں، وہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کمرے میں پھیل گئیں کچھ ہی دیر میں وہ اس کے بالکل قریب آ جاتی تھیں اور پھر پلٹ کر وہ چلی جاتی تھیں سُملی کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ اتنی بے بس تھی کہ اپنی آنکھیں بند بھی نہیں کر سکتی تھی۔

بیش کی طرح وہ آنکھیں چند منٹ تک اسے دہشت زدہ کر کے غائب ہو گئیں پھر ایک بار اندھیرے میں اس مردے کا چہرہ واضح ہو گیا تھا اس کی کھال لگی ہوئی تھی۔ اور منہ کھلا ہوا تھا اس کے ڈر کیولا کی طرح گے لمبے دانت ہونٹوں سے باہر نظر آرہے تھے۔ اس کی خوف ناک انداز سے پھٹکی ہوئی آنکھیں دیووں میں گول گول گھوم رہی تھیں۔ سُملی کے سامنے پر پینا گیا۔

مگر وہ بند تھا مگر مردے کے جسم پر لپٹا کفن یوں پکڑ پکڑا ہوا تھا جیسے تیز ہوا کی زد میں ہو۔ سُملی اس کی طرف دیکھتی رہی کیونکہ اس کی آنکھیں باوجود کوشش کے وہاں سے ہٹ نہیں رہی تھیں مردے نے دونوں ہاتھ یوں پھیلا لئے جیسے وہ کسی کو پکڑنا چاہتا ہو اور دھیرے دھیرے سُملی کی طرف بڑھنے لگا۔ سُملی کو موت سامنے نظر آنے لگی۔ جیسے ہی مردے نے اس کے قریب آ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی وہ حفاظت

خود اختیاری کے جذبے کے تحت بے اختیار اچلی اور بستر سے نیچے جا کھڑی ہوئی کمرے کا دروازہ قریب ہی تھا سُملی نے زبردستی دروازہ کھولا اور باہر نکل کر بھاگنے لگی۔ اس کا رخ بیرونی دروازے کی طرف تھا، باہر نکلنے سے قبل اس نے مڑ کر دیکھا مردہ اسی طرح بازو پھیلائے بے ہنگم قہقہے لگاتا اس کے پیچھے تھا۔

وہ اندھا دھند گلیوں میں بھاگنے لگی اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ کس سمت جا رہی ہے اس کے قدم لمبے پھر کس وقت جب اس نے خود کو اسی اسپتال کے سامنے پایا جس میں وہ نوکری کرتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مردہ اس کے تعاقب میں اپنے لبادے کو پکڑ پکڑا دوڑا چلا آ رہا تھا۔ وہ پھر سے بھاگنے لگی اسپتال کی راہداریاں سنسن پڑی ہوئی تھیں وہ بھاگتے بھاگتے منہ کے بل گری اس کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی کیونکہ وہ جس چیز سے ٹکرا کر گری تھی وہ ایک مردہ جسم تھا جو جانے کیسے فرش پر پڑا تھا۔ اس نے دیکھا وہ اناٹومی والے ڈپارٹمنٹ میں آ گئی تھی۔

اسی وقت مردہ ایک دم اس کے سامنے آ گیا، اس نے اپنے سر دہاتھوں میں سُملی کا گلا دیوچ لیا۔ سُملی نے چیخ کر پوچھا۔

”آخر میرا قصور کیا ہے تم کیوں مجھے مار ڈالنے پر تلے ہو؟“ مردے نے عجیب بھدري پٹنی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم یاد کرو۔ میں تم سے اپنے قتل کا بدلہ لے رہا ہوں۔ تم نے مجھے لا پرواہی سے ایسا انجکشن لگایا تھا جس سے میری موت واقع ہو گئی تھی۔ میں اس اسپتال میں زندگی لینے آیا تھا مگر تم نے مجھے موت کے حوالے کر دیا۔ اب میں تمہیں قتل کر کے اپنے قتل کا بدلہ لوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کا دباؤ اتنا بڑھا کہ سُملی کی سانسیں رک گئیں۔

اگلے دن کے اخبارات میں مردے کے ہاتھوں میں دہی مردہ بیٹی سُملی کی تصویریں شہر کے ہر اسٹال پر موجود تھیں اور شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔



خونی مردے

صفر شاہین - ملتان

پرہول قبرستان میں دل دھلا دینے والی قرب و جوار کا سینہ چیرتی ہوئی ایک چنگھاڑتی آواز سنائی دی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رونگٹے کھڑے کرتی دلخراش اور دل گلزار منظر رونما ہوا۔

رات کے گھٹاؤپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک عجیب و غریب حیرت ناک انوکھی کہانی

تیس چالیس افراد مقامی پولیس اسٹیشن کے باہر جمع تھے۔ سردیوں کا سورج کمر میں لینا طلوع ہوا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور قصبے کے لوگ ابھی گرم بستروں میں دبکے ہوئے تھے اتنی صبح پولیس اسٹیشن پر لوگوں کی موجودگی انپکڑ نوازش کے لئے حیرت کا باعث تھی۔ نوازش وقت کا پابند آفسر تھا اور ٹھیک آٹھ بجے تھانے پہنچنا اس کا معمول تھا۔ اس سلسلے میں وہ بحیثیت انچارج اپنے ماتحتوں کو بھی سختی سے ہدایت کرتا رہا تھا کہ وہ لوگ وقت کی پابندی کریں۔

انپکڑ نوازش نے اپنی جیب تھانے کے باہر دیوار کے ساتھ روکی اور انجن بند کر کے جیب سے اتر آؤ گیٹ پر کھڑے سنتری نے جلدی سے اسے سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ نوازش نے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے مجمع کی طرف دیکھا سب لوگ دیہاتی تھے۔ ان میں چند اچیز عمر خواتین بھی تھیں جو زمین پر رکھی ایک چارپائی کے گرد غمزدہ بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔ چارپائی پر کوئی شخص تھا جس کے جسم پر کھیل پھیلا ہوا تھا، نوازش کے آنے پر وہ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے۔ یہ لوگ کیوں جمع ہیں؟“ نوازش نے گیٹ پر پہنچ کر سپاسی سے پوچھا۔

”یہ قریبی گاؤں سے آئے ہیں سر۔ لاش کا معاملہ ہے۔“ سپاسی نے کہا اور تفصیل بیان کی۔

”اوہ۔۔۔۔۔؟“ نوازش نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے ایک فرد کو میرے کمرے میں لے آؤ۔“

یہ کہہ کر نوازش تھانے میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ اسے میں اس کا ماتحت سب انپکڑ ناصر بھی اندر آ گیا اور اس نے سلام کیا۔

”بیٹھو ناصر۔ باہر کون لوگ ہیں؟“ نوازش نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”معلوم نہیں سر۔“ ناصر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ ”میں ناشتا کر رہا تھا کہ مجھے سنتری نے اطلاع دی۔ اب میں ان کی طرف جا رہا تھا کہ آپ آ گئے۔ شاید کوئی قتل کا کیس ہے۔“

اسی لمحے سنتری دو افراد کے ساتھ اندر آیا۔ ان دونوں افراد نے نوازش کو سلام کیا، حلیہ سے وہ اپنے لوگوں میں ممتاز معلوم ہوتے تھے۔

”سر۔ یہ گاؤں کا نمبر دار غلام نبی ہے۔“ سنتری نے ادھیڑ عمر دیہاتی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ لاش کا بھائی ہے۔“

”لاش کا یا مقتول کا۔“ نوازش نے سنتری کا گھورا۔



”قیل کا کیس نہیں ہے سر۔“ سنتری نے تیزی سے کہا۔

”اچھا۔ تم باہر جاؤ۔“ نوازش نے چوکتے ہوئے کہا تو سنتری باہر چلا گیا اور نوازش نے دونوں افراد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں بائیں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے، اسی عمر نمبردار کا سامنے تقریباً چالیس برس کا سمٹا مندا دی گئی۔

”نمبردار صاحب۔ فرمائیں کیا معاملہ ہے؟“ نوازش نے تیزی سے نمبردار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر صاحب۔ گزشتہ رات ہمارے گاؤں میں عجیب معاملہ پیش آیا۔“ نمبردار نے کہا اور دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا نام اللہ بخش ہے، پرسوں اس کا جوان بھائی رحیم بخش بیٹھے کا شکار ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ کل سہ پہر ہم نے رحیم بخش کو گاؤں سے باہر قبرستان میں دفن دیا تھا لیکن آج فجر کی اذان کے وقت جب لوگ نماز کے لئے گھروں سے باہر نکلے تو گاؤں سے باہر کتوں کا بے پناہ شور سنانا دیکھتے قبرستان میں بھونک رہے تھے، گاؤں کے دو تین افراد صورت حال معلوم کرنے قبرستان پہنچے تو وہاں رحیم بخش کی لاش قبر کے باہر پڑی تھی اور وہاں چند کتے جمع تھے، ان افراد کی اطلاع پر ہم سب وہاں گئے تو رحیم بخش کی میت کا کفن خون آلود تھا، کفن کھول کر دیکھا گیا تو لاش کے سینے پر نائے لگے ہوئے تھے جیسے اسپتال والے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کا سینہ سینے ہیں۔ پھر ہم نے رحیم بخش کی قبر دیکھی تو قبر کھلی ہوئی تھی یوں تو مردار خور جانور بھی تازہ قبروں کو کھود کر میت کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن رحیم بخش کی لاش بالکل سلامت تھی اس لئے ہم لاش یہاں لے آئے ہیں تاکہ پولیس حقائق معلوم کرے۔ ہمارے خیال میں یہ جانوروں کا کام نہیں ہے۔ ورنہ ہم آپ کو زحمت دینے کے بجائے لاش کو دوبارہ دفن کر دیتے۔“ اتنا کہہ کر نمبردار خاموش ہو گیا۔

نوازش اور سب انسپکٹر ناصر نے حیرت سے

نمبردار کا بیان سنا۔ معاملہ واقعی عجیب تھا۔ ایک مردہ جنم کو قبر سے نکالنا اور اس کا سینہ چاک کرنا پھر سینہ کو نائے لگا کر بند کرنا اور اسے قبر کے باہر پھینک دینا حیوانوں کا کام نہیں ہو سکتا تھا، مذہب اور قانون کی رو سے یہ ناقابل معافی جرم تھا۔ نوازش نے لاش کا معائنہ کرنا ضروری سمجھا۔

”ناصر۔ تم قلم کاغذ لے کر آؤ۔ میں لاش دیکھتا ہوں۔“ نوازش نے سب انسپکٹر ناصر کو ہدایت کرتے ہوئے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ نمبردار اور اللہ بخش کے ہمراہ تھانے سے باہر آیا جہاں رحیم بخش کی میت موجود تھی۔ قریب بیچ کراس نے وہاں بیٹھی غم زدہ مردوں کو ہٹا دیا۔ پھر میت سے کھل بنایا۔ وہ چھپس چھپس برس کے سمٹا مندا جوان کی لاش تھی۔ سفید کفن پر مٹی اور خون چھا ہوا تھا۔ نوازش کے اشارے پر اللہ بخش نے کفن کو کھولا تو نوازش کو بے حد حیرت ہوئی۔ کیونکہ لاش کو گردن سے لے کر ناف تک چڑچھاڑ کے بعد بے دھڑکنے طریقے سے دی گئی تھی اس کے علاوہ لاش کے جسم پر کہیں کسی زخم کا نشان نہ تھا۔ اسنے میں سب انسپکٹر ناصر بھی آ گیا۔ اس نے بھی لاش دیکھی اور حیران رہ گیا۔

”سر۔ یہ تو کسی نے لاش کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔“ ناصر نے نوازش سے کہا۔

”ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے۔“ نوازش نے سر ہلایا۔ ”اب تم نمبردار اور اللہ بخش کے علاوہ ان لوگوں کے بیان بھی جنہوں نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی اس کے بعد لاش اسپتال لے جاؤ۔“

یہ ہدایات دے کر نوازش نے نمبردار اور اللہ بخش کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر آپ لوگ کیس درج کرنا چاہتے ہیں تو پھر میت کو اسپتال لے جانا پڑے گا اور لاش کے پوسٹ مارٹم سے پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نامعلوم افراد نے لاش کو قبر سے نکالا اور اس کا سینہ چاک کر کے نائے لگا دیے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

اس سوال کا جواب پوسٹ مارٹم کرانے سے ہی ملے گا۔“ انسپکٹر صاحب۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔

کیونکہ آج میرے بھائی کی میت خراب کی گئی ہے تو ہو سکتا ہے کہ کل کسی اور لاش کو بھی قبر سے نکالا جائے اور اس کی بے حرمتی کی جائے۔“ اللہ بخش نے مودبانہ لہجہ میں کہا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن ہیں، جن لوگوں نے یہ بھیاک جرم کیا ہے۔ میں انہیں پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ نوازش نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔ ”اب آپ اپنے بیان لکھوائیں اور سب لوگوں کو گاؤں بھیج دیں۔ صرف آپ دونوں یہاں رہیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ میرے ساتھ قبرستان جائیں گے۔“

یہ ہدایت کر کے وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور حوالدار سلامت علی کو طلب کر لیا۔

”موبائل تیار کر آؤ۔“ کانسٹیبل اور تم میرے ساتھ جاؤ گے۔“ اس نے سلامت سے کہا۔

”بہتر چناب۔ کہیں دور جانا ہے تو موبائل میں بیڑول بھر دیا جائے۔“ سلامت نے مودبانہ لہجہ میں کہا۔

”شہر سے باہر گاؤں میں جانا ہے۔ ڈرائیور سے کوئیل پانی چیک کر لے۔“ نوازش نے کہا تو سلامت خوش ہو گیا۔

”سر جی..... گاؤں کی دیسی مرغیاں بڑی مزے دار ہوتی ہیں۔“ سلامت نے اجتماعتہ لہجہ میں۔

”ٹھٹ اپ۔“ نوازش نے اسے ڈانٹا۔ ”ہم تحقیق کے لئے جا رہے ہیں، مرغیاں کھانے نہیں، قبرستان جانا ہے ہمیں۔“

”اچھا جی.....“ سلامت نے چونک کر کہا۔

”کیا کی کا قاتل پڑھنے۔“

نوازش نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا اور سلامت نے گھبرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد ناصر کمرے میں داخل ہوا تو نوازش نے سوالیہ

نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان لوگوں کے بیانات لے لئے ہیں سر۔“ ناصر نے کہا اور پھر رجسٹر پر لکھے بیانات پڑھ کر سنانے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم لاش اسپتال لے جاؤ۔ میں گاؤں جا رہا ہوں میرے آنے تک پوسٹ مارٹم رپورٹ مل جانی چاہئے۔“ نوازش نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”رائٹ سر۔ کیا لاش کو پوسٹ مارٹم کے بعد اس کے ورثہ کے حوالے کرنا ہے؟“ ناصر نے پوچھا تو نوازش نے اثبات میں سر ہلایا اور کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پولیس موبائل شہر سے نکل کر گاؤں کی طرف جانے والی مٹی سڑک پر دوڑنے لگی نوازش فرنیٹ سیٹ پر تھا۔ اس کے عقب میں حوالدار سلامت اور دو مسلح کانسٹیبل، نمبردار غلام نبی اور مرحوم کا بھائی اللہ بخش بیٹھے تھے۔ تقریباً دو میل چلنے کے بعد موبائل نے چھوٹی سی نہر کا پل عبور کیا تو عقب میں بیٹھے اللہ بخش نے بلند آواز میں کہا۔

”تھانیدار صاحب۔ آگے جہاں موڑ ہے اس کے بائیں جانب قبرستان ہے۔“

نوازش نے بائیں جانب دیکھا۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر ایک مٹی چار دیواری نظر آ رہی تھی جو زمین سے تقریباً چار فٹ بلند تھی اور اس میں داخل ہونے کے لئے راستہ بنا ہوا تھا جو موٹی کی طرف سے جاتا تھا۔ نوازش کی ہدایت پر ڈرائیور نے موڑ پر پہنچ کر گاڑی روک دی۔ نوازش موبائل سے اترا تو دوسرے لوگ بھی موبائل سے اتر گئے۔ قبرستان کی طرف جانے کا کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا اور اس پر گاڑی نہیں جاسکتی تھی چنانچہ ڈرائیور کے سوا سب لوگ قبرستان کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

نوازش سب سے آگے تھا اور وہ آس پاس کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ احاطے کے قریب بیچ کراس نے نمبردار کی نشاندہی پر اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں رحیم بخش کی لاش پائی گئی تھی۔ مٹی جگہ تھی اور وہاں متعدد جوانوں اور بچوں کے نشانات موجود تھے اس لئے یہ اندازہ لگانا

کہ ان میں مجرموں کے قدموں کے نشانات کون سے ہیں؟ ممکن نہ تھا۔ البتہ لاش پڑے رہنے سے زمین پر اس کا نشان بن گیا تھا۔ قدموں کے نشانات اس کے آس پاس تھے۔

پھر وہ سب قبرستان میں داخل ہوئے وہ گاؤں والوں کا آبائی قبرستان تھا جس میں بڑے بڑے اور گھنے درختوں کے علاوہ خوردو پودوں کی بہتات تھی اکثر قبروں کے سرہانے درخت اور پودے نظر آ رہے تھے۔ مرحوم رحیم بخش کی قبر تقریباً وسط میں تھی۔ قبر ابھی تک کھلی ہوئی تھی اور اس کے گرد مٹی کے ڈھیر نظر آ رہے تھے نوازش نے قبر کا جائزہ لیا۔ معلوم ہوا تھا کہ کسی اوزار سے قبر کے اوپر کی مٹی ہٹائی گئی تھی۔ مٹی کے ڈھیروں پر بھی جوتوں کے نشانات موجود تھے جو ظاہر ہے گاؤں والوں کے ہی ہو سکتے تھے جنہوں نے لاش ملنے کے بعد یہاں آ کر قبر کا جائزہ لیا تھا۔

”کیا لاش ملنے کے بعد آپ لوگوں میں سے کوئی قبر میں داخل ہوا تھا۔“ نوازش نے نرودار سے پوچھا۔

”نہیں جناب..... سب لوگ باہر کھڑے تھے کسی میں ہمت ہی نہ تھی کہ قبر میں اترتا۔“ نمبردار نے جواب دیا۔

”کیوں؟ اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔“ خوالدار سلامت علی نے تیزی سے کہا۔

آخر ایک دن تو سب کو ہی.....

”سلامت۔ خاموش رہو۔“ نوازش نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا اور پھر جھک کر قبر کے اندر جھانک لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑا قبر کے اندر میں جوتوں کے نشانات نظر آ رہے تھے جو قبر کے سرہانے کی طرف اور وسط میں تھے۔ وہ نشانات کافی واضح تھے۔

”سلامت۔ ذرا دیکھنا، یہ نشانات کس قسم کے جوتوں کے ہیں۔“ نوازش نے سیدھے ہو کر سلامت سے کہا۔

”سچی۔ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں سے پوچھ لیں کہ انہوں نے رحیم بخش کی لاش کو کس قسم کے جوتے پہنائے۔“ سلامت نے اعتماد انداز میں کہا۔

”نہیں جناب۔“ نمبردار نے جلدی سے کہا۔ ”بھلا میت کو جوتے پہنانے کی کیا ضرورت تھی ہمیں۔“

”سلامت.....“ نوازش نے سلامت کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”سچیدہ رہو۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“

”سوری سر.....!“ سلامت نے یوگلا کر کہا اور پھر آگے بڑھ کر قبر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر جھک کر قبر میں جھانک لگا۔

”سچی۔ یہ تو پشاور کی چپل کے نشانات معلوم ہوتے ہیں۔“ سلامت نے چند لمحوں بعد نوازش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”پشاور کی چپل کا تلو اسی طرح کا ہوتا ہے۔“ نوازش نے چونکتے ہوئے پوچھا تو سلامت نے اثبات میں سر ہلادیا، تب نوازش سیدھا کھڑا ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ وہ کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تھانے میں واپس آ گئے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھ کر انسپکٹر نوازش کی آنکھیں جھپکے لگیں۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ مرحوم رحیم بخش کی لاش قبر سے نکالنے کے بعد اس کا سینہ چاک کر کے اندر سے دل گردے اور کلیجہ نکال لیا گیا تھا اس مقصد کے لئے یقیناً ڈاکٹری اوزار استعمال کئے گئے تھے۔ اعضا نکالتے ہوئے بڑی نفاست سے کام لیا گیا تھا البتہ سینے کی سلائی کرتے ہوئے جلد بازی یا تاخیر بہ کاری سے کام لیا گیا تھا اور بڑے بے ڈھنگے طریقے سے ٹانگے لگائے تھے۔

اسپتال والوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ لاش کے اعضا کسی ایسے گروہ نے نکالے تھے جس نے اعضا

کو فروخت کرنا چاہتا تھا۔ پولیس کو اب اس گروہ کا سراغ لگا تھا۔ اور یہ آسان کام نہ تھا۔ لیکن نوازش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جتنی القاب مجرموں کو گرفتار کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچائے بغیر جنم سے نہیں بیٹھے گا۔ اس نے رحیم بخش کی لاش واپس گاؤں بھجوا دی اور خود مجرموں کا سراغ لگانے کے لئے یعنی طور پر پلاننگ کرنے لگا۔ شام کے وقت اس نے اپنے چند ماتحتوں کو طلب کر لیا۔

”تم لوگ شہر میں پھیل جاؤ اور معلوم کرو کہ آج کسی میت کو دفنایا گیا ہے یا نہیں۔“ اس نے ماتحتوں کو ہدایت کی۔

”سر۔ اس قسم کے واقعات شہروں میں نہیں گاؤں گھوٹوں میں ہوا کرتے ہیں۔“ سب انسپکٹر ناصر نے کہا۔ ”کیونکہ وہاں قبرستان گاؤں کے باہر اور آبادی سے کچھ فاصلے پر بنائے جاتے ہیں تاکہ دوسرے گاؤں والے بھی وہاں میت دفن نہ کیں۔“

”تمہاری بات درست ہے ناصر۔ لیکن جب انکا وارداتوں کا آغاز ہوا ہے تو پھر مجرم ہر جگہ ہاتھ مار رہے ہیں۔ اب ضروری تو نہیں کہ آج بھی کوئی فوت ہوا ہو۔ لیکن اس گروہ کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں یہ اقدام کرنا ہی پڑے گا بہر حال چند سپاہیوں کو ارد گرد کی بستیوں اور گھوٹوں میں بھیج دو۔ سات آٹھ بجے تک معلومات مل جانی چاہئیں مجھے۔“ نوازش نے کہا۔

”شام کے ساڑھے چھ بجے حسب توقع نوازش کو ایک ماتحت نے رپورٹ دی کہ قصبے میں شیخ محمد دین کی والدہ کو جو گزشتہ رات فوت ہوئی تھی آج سہ پہر مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ دوسری اطلاع دس بارہ منٹ بعد ملی کہ دیہی بستی نور پور میں ایک کسان کو تھوڑی دیر پہلے دفنایا گیا ہے، نوازش کے حصول مقصد کے لئے دوسری اطلاع پہلی سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔

”ناصر۔“ اس نے سب انسپکٹر ناصر سے کہا۔ ”آج رات نور پور کے قبرستان کی گمرانی ہوئی چاہئے۔“

”سر۔ شیخ عمر کی والدہ بھی فوت ہوئی ہے۔ اس کے قبر کی گمرانی.....“ ناصر نے کہا۔

”نہیں.....“ نوازش اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”بے کار ہے۔ اول تو مجرم شہر کے قبرستان میں واردات کرنے سے گریز کریں گے۔ اور شیخ عمر کی والدہ ساتھ ہاتھ برس کی بوڑھی خاتون تھی اور رپورٹ کے مطابق گزشتہ دو ماہ سے ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی اگر مجرم انسانی، اعضا کی اسگٹنگ کرتے ہیں تو ان کے لئے بڑھیا کی لاش بیکار ہے جبکہ نور پور دیہی آبادی ہے اور وہاں کبھی بھی نہیں ہے۔ پھر وہاں مرنے والا کسان تو جوان تھا۔ مجرموں کے لئے اس کی لاش قبر سے نکالنا آسان رہے گا جبکہ شہر میں مجرموں کے لئے خطرات زیادہ ہیں۔“

”پھر بھی جناب۔ ہمیں کسی امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔“ ناصر نے کہا۔ ”کیونکہ مجرم بھی ہماری طرف سے ہوشیار ہوں گے۔ انہیں یقیناً پتہ ہوگا کہ پولیس رحیم بخش کے واقعہ کی تفتیش کر رہی ہے اور اس سلسلے میں دیہی قبرستان کی گمرانی کرے گی۔“

”تمہاری بات درست ہے ناصر۔“ نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ مجرموں نے رحیم بخش کی لاش سے اس کے نازک اعضا نکالے ہیں اور وہ جوان تھا۔ اگر بوڑھوں اور کمزور افراد کے اعضا انہیں درکار ہوں تو انہیں قبریں کھود کر لاشیں نکالنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے افراد کو تو وہ انوار کے بھی اپنا مقصد پورا کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ ناصر نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”نور پور کے سمجھوں؟“

”سلامت اور تم چلے جاؤ۔ زیادہ نفری کی ضرورت نہیں، ورنہ مجرم ہوشیار ہو جائیں گے۔ فی الحال ہمیں ان کے ٹھکانے کا سراغ لگانا ہے گرفتاری کا مرحلہ بعد میں آئے گا۔“ نوازش نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ”رات نو بجے سے صبح چھ بجے تک تم دونوں کو چھپ کر تازہ قبر کی گمرانی کرنی ہے۔ سادہ لباس میں

جانا۔ مگر اس کو ساتھ رکھنا۔“

نوازش نے مزید چند ہدایات دیں جو ناصر نے ذہن نشین کر لیں۔ پھر وہ نوازش کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناصر نے حوالدار سلامت کو اپنے کمرے میں طلب کر کے انپکٹر نوازش کا حکم سنایا تو سلامت گھبرا گیا۔

”اوہ سرجی۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ مجھ پر نہیں تو میرے بچوں پر ہی رحم کھائیں۔“ سلامت نے بولکھلا کر کہا۔

”تمہارے بچے!“ ناصر نے اسے حیرت سے گھورا۔ ”مگر تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

”آخر ہوئی تو ہے ناں۔ پھر بچے پیدا ہوتے کون ہی دیر لگتی ہے۔“ سلامت نے منہ بسور کر کہا۔

”یکومت۔“ ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔“

”فرض تو میں فجر کی نماز میں روزانہ ادا کرتا ہوں سرجی۔“ سلامت تیزی سے بولا۔

”نال منول کرنے کی بجائے تم نوازش صاحب کے پاس چلے جاؤ اور ان سے بات کرو۔“ ناصر نے اسے گھومتے ہوئے کہا۔

”اچھا جناب چلے۔“ سلامت نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میرا معطل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

چند منٹ بعد ناصر کی موٹر سائیکل سڑک پر دوڑ رہی تھی اس کے عقب میں حوالدار سلامت بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ چائے کا تھرماس سلامت نے کندھے پر لٹکا رکھا تھا جبکہ رات کے کھانے کے طور پر بسکٹ کے دو پیکٹ اس نے کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے۔ ناصر کی جیبوں میں بھی دو پیکٹ تھے سردیوں کی رات شرع ہو چکی تھی۔ بستی نور پور شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھی وہ بستی تین روڈ سے تقریباً ایک میل دور تھی جبکہ بستی کا قبرستان بستی

سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر نہر کے قریب واقع تھا ناصر نے موٹر سائیکل بستی کی طرف جانے والے راستے پر اتار دی۔ یہ راستہ بستی کے باہر سے گزر کر نہر کی طرف جاتا تھا نہر کے پار بھی کئی بستیاں تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ قبرستان کے سامنے پہنچے۔ قبرستان اس راستے کے بائیں جانب چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ قبروں کو جالوروں سے بچانے کے لئے قبرستان کے گرد چار فٹ بلند کچی چادریوار بنائی گئی تھی جس میں داخلے کے اور راستے تھے ایک سڑک کی طرف سے اور دوسرا بستی کی جانب سے۔ قبرستان کی اندرونی

اطراف میں بڑے بڑے اور گھنے درخت تھے جو نہ تاریکی میں بڑے ہولناک دکھائی دے رہے تھے۔

قبرستان کا چونی پھاٹک بند تھا۔ وہاں پہنچ کر ناصر نے موٹر سائیکل روکی اور انجین بند کر دیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے، قبرستان پر سکوت مرگ طاری تھا۔

دونوں موٹر سائیکل سے اترے اور ناصر کے اشارے پر سلامت نے بڑھ کر پھاٹک کھول دیا۔ ناصر موٹر سائیکل اندر لایا اور سلامت نے پھاٹک بند کر دیا۔

چاروں طرف جچی پکی قبریں پھیل ہوئی تھیں جن کے آس پاس قدرتی پودے اور گھٹی جھاڑیاں آگے

ہوئی تھیں ناصر نے پھاٹک کے بائیں جانب دیوار اور درختوں کے درمیان موٹر سائیکل کھڑی کی۔

پھر سلامت کے ساتھ قبرستان میں گھوم پھر کر ان کا قبر تلاش کرنے لگا۔ اس نے پھل نارنج کی محدود درختوں

میں جلد ہی ایک تازہ قبر تلاش کر لی۔ وہ قبر مٹی کا ڈھیر دکھائی دے رہی تھی اور اس کے سر ہائے ایک جڑاؤ تھا

تھا جو کہ ہوا سے بچھ گیا تھا۔ پھر اس قبر سے دس بارہ قدم اور اونچے تعویذ والی قبر کا رخ کیا جس کے سر ہائے ایک

درخت تھا اور اس درخت کی شاخیں قبر پر چکی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے چھینے کے لئے بہترین جگہ تھی۔ چنانچہ

دونوں اس قبر کے عقب میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں سے وہ تازہ قبر اور پھاٹک کو دیکھ سکتے تھے۔

”سرجی۔ میرا خیال ہے کہ کچھ پیٹ پوجا کر لو“

”سرجی۔ میرا خیال ہے کہ کچھ پیٹ پوجا کر لو“

چاہئے۔“ سلامت نے ناصر سے کہا۔

”آہستہ بولو۔۔۔۔۔؟“ ناصر نے ہدایت کی۔

”کیوں سرجی؟ کیا مردے سن لیں گے۔“

سلامت نے ہنسنے لگا۔

”یہاں مذاق کی گنجائش نہیں ہے احق۔“

ناصر نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی۔ چائے پینے کی گنجائش تو ہے نا۔“

سلامت نے تھرماس کھولتے ہوئے کہا۔

ناصر خاموش رہا انہوں نے چائے کے ساتھ

بسکٹ کھائے پھر ناصر نے سگریٹ سلگایا اور پھاٹک کی

طرف دیکھنے لگا۔

قبرستان کی فضا پر ہولناک سناٹے کا راج تھی۔

اس ابدی سکوت میں ہوا سے کوئی خشک پتہ بھی کھڑکھڑاتا

تو سلامت چونک کر خوف زدہ نہ ہوا۔ اس نے دھیر دھیر دیکھنے

لگتا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سب

انپکٹر ناصر پر بے چینی طاری ہوتی جا رہی تھی۔ قبرستان کا

چونی پھاٹک اگرچہ بند تھا لیکن متقل نہیں تھا اور اسے

کھولنے کے لئے زور لگانا پڑتا تھا اس کا کھینچوں کی طرف

کھینچنے والا پھاٹک بھی بند تھا۔ مگر راستے میں حائل قبروں

اور جھاڑیوں کے سبب ان کی نگاہوں سے اوچھل تھا۔

دس منٹ گئے لیکن کوئی غیر معمولی بات ظہور میں نہ

آئی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اور گرم

لباسوں کے باوجود دونوں ٹھنڈے جا رہے تھے۔ وہ

دونوں قبر کے سر ہائے کی جانب بیٹھے تھے۔ ایک

ٹھنڈے پر ناصر اور دوسرے پر سلامت تھا سردی سے

سلامت کے دانت بچ رہے تھے گزشتہ ایک گھنٹے کے

دوران انہوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن

اب سلامت اس طویل خاموشی سے تنگ آ چکا تھا۔

”سرجی۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں ناصر

کو مخاطب کیا۔ ”چائے دوں آپ کو؟“

”نہیں۔ ابھی طلب نہیں ہے۔“ ناصر نے

آہستہ سے کہا۔

”مگر میری تو سردی سے قلفی جی جا رہی ہے۔“

مجھے لگتا ہے ہم جھک مار رہے ہیں۔“ سلامت بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ناصر نے

اندھیرے میں اسے گھورا۔

”اور کیا۔۔۔۔۔؟“ سلامت نے منہ بتایا۔ ”جب شہر

میں مجرموں کے لئے ایک تازہ لاش موجود ہے تو انہیں

اتنی دور آ کر کیا ضرورت ہے۔“

”کیوں نہ کرو۔“ ناصر نے اکتا کر کہا۔ ”مجرم

آئیں نہ آئیں، ہمیں تو اپنی ڈیوٹی پوری کرنی ہے۔“

”اچھا جی۔ آپ کا مطلب تو یہ ہوا کہ۔ وہ

آئیں نہ آئیں، جی ہیں نگاہیں۔ چھپ چھپ

کر دیکھیں ہم ان کی راہیں۔“ وہ گنگناٹے لگا تو

ناصر بے اختیار مسکراتے لگا۔

”بس۔ اب خاموش ہو جاؤ۔“ ناصر نے سخت

لہجے میں کہا اور سلامت خاموش ہو کر تازہ قبر کی طرف

دیکھنے لگا۔

”اوہ۔ سرجی۔ آپ نے کچھ سنا۔“ چند لمحوں

بعد وہ ایکدم ہم کر بولا۔

”کیا بات ہے۔“ ناصر نے چونکتے ہوئے اس

کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”لگتا ہے کوئی مردہ دوسرے مردے سے باتیں

کر رہا ہے۔“ سلامت سر اسیمہ لہجے میں بولا۔ ان کی

ہلکی ہلکی آواز سنی ہے میں نے۔“

ناصر نے غور سے سننے کی کوشش کی مگر اسے مطلق

کوئی آواز نہ سنائی دی، اس نے سر جھک کر کہا۔ ”کچھ

نہیں، تمہیں وہم ہوا ہے۔“

اسی لمحے ان کے عقب سے ہلکی سی آواز ابھری

اور سلامت ایک دم ڈر کر ناصر کے قریب ہو گیا۔

”سرجی۔ کوئی ہمارے پیچھے چل رہا

ہے۔“ سلامت نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔“ ناصر نے

اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”خواہ خواہ بورت کرو۔“

”نہیں سرجی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ قسم لے

لیں۔“ سلامت نے آہستہ سے کہا۔

ٹھیک اسی لمحے ناصر کی سماعت سے ایک غیر معمولی آواز نکل کر اُڑی اور وہ چونک کر قبرستان کے پھاٹک کی طرف دیکھنے لگا۔

قبرستان کا داخلی پھاٹک آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ ناصر نے سلامت کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو سلامت بھی پھاٹک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں پھاٹک تھوڑا سا کھل گیا اور ایک کفن پوش اندر آیا۔ وہ سر تا پا سفید کفن میں لپیٹا ہوا کوئی مردہ تھا۔ اسے دیکھ کر سلامت ایک دم خوف زدہ ہو گیا۔ ناصر کی نگاہیں اس کفن پوش مردے پر مرکوز تھیں اندر آ کر اس مردے نے گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

”سر۔ سر جی۔“ سلامت نے خوف سے ہکلائے ہوئے کہا۔ ”یہ تو۔ یہ تو لاش ہے۔“

کفن پوش مردہ تازہ قبر کے سامنے پہنچا اور وہاں رک کر اس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے رخ بدلا اور تازہ قبر کے سر پائے پہنچ گیا۔ ناصر اور سلامت کی طرف اس کی پشت تھی۔ چند لمحوں بعد ایک دم شعلہ بھڑکا اور قبر پر رکھا چراغ جلنے لگا۔ ناصر مدھم مدھم اس مردے کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور سلامت خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کفن پوش نے سیدھے ہو کر پھاٹک کی طرف رخ کیا اور ایک ہاتھ لہرایا۔ ناصر اور سلامت نے تیزی سے پھاٹک کی طرف دیکھا تو وہاں تین اور کفن پوش کھڑے تھے۔ وہ تینوں بھی آگے بڑھنے لگے چراغ کی روشنی میں وہ بھی ہوئی رو میں معلوم ہو رہے تھے وہ اپنے ساتھی مردے کے پاس پہنچے اور پہلا مردہ آہستہ آہستہ ان سے کچھ کہنے لگا۔

دفعاً ان کفن پوش مردوں نے رخ بدل کر اس سمت دیکھا جس طرف ناصر اور سلامت پوشیدہ تھے اور پھر زور زور سے قہقہہ لگانے لگے، ناصر ان کی اس حرکت پر حیران ہوا لیکن سلامت دہشت زدہ ہو کر کانپنے لگا۔ ناصر کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر پھر ان کفن پوش مردوں کو اپنی طرف آتے دیکھ

کر اس کے بدن میں عجیب سنسانہ سی پھیلتی جلی کی جڑیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ چاروں کفن پوش مردے بے ڈھنگے پن سے ہلکے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

”اچھا ہوا اب ہم پیٹ بھر کر گوشت کھا لیں گے۔“ دفعاً ایک مردے کی آواز بلند ہوئی۔

”پولیس والوں کا گوشت تو مجھے بہت مہر مہر ہے۔“ دوسرے مردے نے ہنسنے ہوئے کہا۔

ان کی باتیں سن کر سلامت خوف سے گھٹکیاں لگا۔ ناصر نے ریوالور کے دستے پر ہاتھ کی گرفت تیز کر لی تھی۔

”س۔ سر جی۔“ نکل چلیں۔۔۔۔۔ سلامت نے یہ مشکل سرگوشی کی۔

لیکن ناصر نے کوئی جواب نہ دیا، اسی لمحے چار پھر بچھ گیا اور وہاں تاریکی پھیل گئی وہ چاروں کفن پوش مردے اس قبر سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر روک گئے۔

”باہر نکل آؤ دوستو۔“ ایک مردے کی گرج دار آواز دی۔ ”ہم کھلی جگہ پر تمہارا خون پینا چاہتے ہیں۔“

جواب میں وہ دونوں خاموش رہے۔ انچہ نوازش کی ہدایت کے مطابق ناصر بڑی برداشت سے کام لے رہا تھا۔

”وہ ادھر نہیں ہیں۔ ورنہ ہمیں دیکھ کر ہی خوف سے پیچھے ہٹ جاتے۔“ ایک مردے کی آواز ابھری۔

”تو پھر وہ کہاں ہو سکتے ہیں۔“ دوسرے مردے نے کہا۔ ”ان کی موٹر سائیکل تو دیوار کے پاس موجود ہے۔“

”جلد ہی دیکھو۔“ تیسرے مردے کی آواز سنائی دی۔ ”ابھی بہت کام کرنا ہے ہمیں۔“

”آؤ۔ ادھر دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے“ دوسرے پھاٹک کے قریب چھپے ہوئے ہوں۔“ چاروں مردے نے کہا۔

پھر ان کے ہیولے حرکت کرتے ہوئے دوسرے پھاٹک کی طرف جانے لگے۔ ناصر سوچنے لگا کہ اگر وہ اپنی موٹر سائیکل قبرستان سے باہر ہی کہیں چھپا

آتا تو یقیناً وہ کفن پوش مردے ان کی موجودگی سے بے خبر رہتے جلد ہی وہ چاروں کفن پوش درختوں کی آڑ میں چلے گئے۔

”س۔ سر جی۔ یہاں سے چلیں۔ یہ آدم خور مردے ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ سلامت نے ناصر سے سرگوشی کی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ناصر نے سخت لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”چپ چاپ بیٹھو اور دیکھتے رہو۔“

”سلامت دوبارہ کچھ نہ بولا۔ چند لمحوں بعد اچانک کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی اور ناصر چونک پڑا۔

انجن کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی چند لمحوں بعد وہ آواز بند ہو گئی جیسے انجن بند کر دیا گیا ہو۔ ناصر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق کوئی گاڑی قبرستان کے باہر آ کر روک گئی تھی۔ وہ پھاٹک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد پھاٹک کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کدال تھی۔

”سلامت۔۔۔۔۔ ہوشیار ہو جاؤ۔“ ناصر نے آہستہ سے سلامت کو مخاطب کر کے کہا۔

”کک۔۔۔۔۔ کیوں۔ سر جی؟“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”ادھر دیکھو۔ قبر کھودنے والا آ رہا ہے۔“ ناصر نے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سلامت نے پھاٹک کی طرف سے آنے والے کفن پوش کو دیکھا اور حیرت سے اچھل پڑا۔ ”اوہ۔ یہ تو زندہ انسان ہے سر؟“

”وہ کفن پوش بھی زندہ انسان ہیں۔“ ناصر نے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھے دیکھتے رہو، میں ذرا باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر ناصر اپنی جگہ سے پیچھے کی طرف سر کٹا چلا گیا۔ سلامت حیرت سے کدال بردار کو دیکھ رہا تھا۔ مجاہد ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ

آدی تازہ قبر کے پاس پہنچا اور رک کر جب سے کچھ نکالنے لگا پھر اس کے ہاتھ میں ایک نارنج روشن ہو گئی اس نے نارنج قبر کے سر پائے بڑی اینٹ پر اس طرح رکھی کہ روشنی قبر کے پاؤں کی جانب پڑنے لگے۔ سلامت کو اس کے چہرے پر سیاہ نقاب دکھائی دیا۔ اس نقاب پوش نے چست لباس پہنا ہوا تھا جس کے اوپر اس نے گرم جرسی پہن رکھی تھی۔ نارنج رکھنے کے بعد اس نے منہ سے الوکی کرخت آواز نکالی۔ ایک لمحہ بعد اس جانب سے بھی الوکی آواز ابھری جس طرف کفن پوش مردے گئے تھے۔ سلامت نے اس طرف دیکھا تو وہ کفن پوش واپس آ رہے تھے لیکن اب ان کے سروں سے کفن اتر رہا تھا۔ جلد ہی وہ کفن پوش نقاب پوش آدمی کے قریب آ گئے۔

”تم لوگ ادھر کیا کر رہے تھے۔؟“ کدال بردار نقاب پوش نے سخت لہجے میں ان سے پوچھا۔

”پولیس والوں کو دیکھنے گئے تھے جنت۔“ ایک کفن پوش نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”پولیس۔۔۔۔۔؟“ نقاب پوش کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔

”میں کیپٹن۔۔۔۔۔“ کفن پوش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں پہنچے تو ادھر پھاٹک سے ذرا بہت کر موٹر سائیکل کے ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ وہ موٹر سائیکل درختوں کے پیچھے دیوار کے ساتھ کھڑی ہے اور اس کی نمبر پلیٹ کارنگ مخصوص ہے لیکن وہ ہمیں نہیں ملے۔ شاید ہمیں دیکھتے ہی ڈر کر فرار ہو گئے تھے۔؟“

”اوہ۔ تم نے اچھی طرح چیک کر لیا ہے نا۔؟“ نقاب پوش نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا جسے کفن پوش نے کیپٹن کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

”میں سر۔“ دوسرے کفن پوش نے کہا۔ ”نمبر سکس اور فور اب انہیں باہر تلاش کرنے گئے ہیں۔“

”خیر تم کام شروع کرو۔ موٹر سائیکل پر آنے والے دو سے زیادہ افراد نہیں ہوں گے اور ان سے بخوبی نمٹا جاسکتا ہے۔“ کیپٹن نامی شخص نے کہا۔

اس کی بات سن کر ایک کفن پوش نے اپنا کفن اتارا اور کدال اٹھائی۔ دوسرے کفن پوش نے نارنج اٹھائی اور اس کی روشنی قبر پر ڈالنے لگا۔

نقاب پوش کیپٹن نے اپنی جیب سے ریوالمور نکالا اور ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا کدال والا شخص قبر کی کھدائی کرنے لگا۔

”نمبر فور اور سکس کھیتوں کی طرف ہیں یا سرک کی جانب.....؟“ کیپٹن نے سوال کیا۔

”جہاں نہیں۔ ہم تو پھانک سے واپس چلے آئے تھے آپ کی گاڑی کی آواز سن کر۔“ نارنج بردار نے جواب میں کہا۔

”اچھا۔ تم جلدی کام ختم کرو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔“ کیپٹن نے کہا اور پلٹ کر پھانک کی طرف بڑھنے لگا۔

سلامت خاموشی سے اسے دیکھتا رہا کیپٹن پھانک سے باہر نکل گیا تو سلامت دوبارہ قبر کھودنے والے کفن پوش کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے ناصر کی فکر تھی کہ کہیں نمبر سکس اور فور کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ چند منٹ بعد اسے اچانک اپنے عقب میں خشک پتے چھرانے کی آواز سنائی دی۔ سلامت نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔

ادھر سب انسپکٹر ناصر کوئی آواز پیدا کئے بغیر دیوار کے پاس پہنچا پھر ریوالمور جیب میں رکھ کر وہ دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ اس طرف کھیت تھے اور وہ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا چار دیواری کی طرف پہنچا اور آڑ میں رک کر سامنے کی جانب جھانکا تو اس طرف پھانک سے چند قدم دور ایک وین کھڑی تھی جس کی بتیاں بجھی ہوئی اور انجن بند تھا ستاروں کی مدھم روشنی میں دور سے یہ اندازہ کرنا سراسر تھا کہ وین کے اندر کوئی فرد موجود ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ دبے پاؤں وین کی طرف بڑھنے لگا اس جانب وین کا پہلو تھا۔ وہ ہاتھ میں ریوالمور لئے کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر وین کے قریب پہنچا۔ کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکنے پر وہ ایبولنس

وین ثابت ہوئی جس میں اسٹریچر سمیت کئی چیزیں موجود تھیں۔

ناصر نے جیب سے پشل نارنج نکالی اور اس کی روشنی وین کے اندر ڈالی تو بے اختیار چونک پڑا۔ اندر ایک ٹرے میں کئی آلات جراحی رکھے تھے۔ اس نے نارنج بجھائی اور وہاں سے ہتھ کر واپس چل دیا۔ گھر پر پہنچ کر وہ جوں ہی قبرستان کے پہلو کی جانب مڑا۔ ایکدم بوکھلا گیا۔ وہاں دو کفن پوش کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں ریوالمور دبے ہوئے تھے۔ ایک کفن پوش شخص نے فور ایسی اپنے ریوالمور کی نال ناصر کے پیچ سے لگا دی۔

”خبردار۔ کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ سینے میں سوراخ کردوں گا۔ ریوالمور پھینک دو۔“ کفن پوش آہستہ سے غرایا۔

ناصر نے گہرا سانس لیا اور اپنے ہاتھ میں موجود ریوالمور گرایا۔ دوسرے کفن پوش نے ریوالمور اٹھا کر ناصر پر تان لیا۔

”نمبر فور۔ یہ سب انسپکٹر ناصر ہے۔ یقیناً اس کا کوئی ساتھی بھی ہوگا۔“ سامنے والے کفن پوش نے ناصر سے نگاہیں بٹائے بغیر دوسرے سے کہا۔

”تمہارا ساتھی کہاں ہے انسپکٹر؟“ نمبر فور نامی دوسرے کفن پوش نے سخت لہجے میں ناصر سے پوچھا۔

”میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔“ ناصر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”نمبر سکس۔ اسے بے ہوش کرو۔ وقت کم ہے۔“ نمبر فور نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”کیپٹن خورال کا فیصلہ کرے گا۔“

نمبر سکس نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر فور ای ریوالمور کا دستہ ناصر کی کیپٹی پر رسید کر دیا۔ ناصر لڑکھڑا اور ڈوبے ذہن کے ساتھ زمین پر گر جاتا گیا۔ ہوش آیا تو وہ قبرستان کی بجائے اسپتال میں بیٹھ پڑا تھا اور ایک ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر رہا تھا جبکہ انسپکٹر نواز شہزاد قریب کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل

بھی موجود تھا۔

”پہلو ناصر۔ کیسی طبیعت ہے۔؟“ نواز شہزاد نے اس پر جھپٹتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں سر۔“ ناصر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے یہاں کون لایا۔؟“

”میں لایا ہوں۔ تم قبرستان کے باہر کھیتوں میں بے ہوش پڑے تھے۔“ نواز شہزاد نے کہا۔ ”حوالدار سلامت کہاں ہے؟“

”وہ قبرستان کے اندر تھا۔ شاید وہ بھی وہاں بے ہوش پڑا ہو۔؟“ ناصر نے جواب میں کہا۔

”نہیں۔ ہم نے قبرستان کا ایک ایک گوشہ چھان مارا ہے۔ سلامت وہاں نہیں ملا۔“ نواز شہزاد نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

”اوہ۔ کہیں وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں۔“ ناصر نے ایکدم چونکتے ہوئے کہا۔

”وہ کون؟ تم ذرا اچھی طرح ہوش میں آ جاؤ تو پھر تفصیل رپورٹ دینا۔ میں تمہارے پاس ہی ہوں۔“ نواز شہزاد نے نرمی سے کہا۔

”ٹھیک یوسر۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ”بس ذرا سر میں درد ہے ایک مجرم نے میری کٹنی پر ریوالمور کا دستہ مارا تھا۔“

پھر وہ تفصیل سے گزشتہ واقعات بتانے لگا۔ اس نے ایبولنس وین کا نمبر بتایا تو نواز شہزاد نے وہاں موجود کانسٹیبل کو وین کی تلاش کے سلسلے میں چند ہدایات دیں۔ پھر دوبارہ ناصر کی رپورٹ سننے لگا۔

”میں رات بھر تمہاری کال کا انتظار کرتا رہا۔“ پھر پارک بے میں تمہاری طرف جانے کا فیصلہ کیا۔“ اور جب ”میں وہاں پہنچا تو تم قبرستان کے اندر باہر کہیں نظر نہ آئے پھر تلاش کرنے پر تم قہر جی کھیت میں بیٹھے دکھائی دئے۔“ قبرستان کے اندر تازہ قبر کھدی ہوئی تھی اور اس میں سے لاش غائب تھی۔ اس قبر کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک قبر کے عقب میں جائے کا قبر باس اور حوالدار سلامت کا ریوالمور بھی ملا۔

لیکن سلامت خود کہیں نہ ملا۔ یقیناً مجرم اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔“

”اوہ۔ کہیں وہ لوگ سلامت کو قتل کر کے اس کے اندر ونی اعضا بھی نہ نکال لیں۔“ ناصر نے چونکتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا۔

”اگر تم خود کوفٹ محسوس کرتے ہو تو آؤ چلتے ہیں۔“ نواز شہزاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں کانسٹیبل واپس آ گیا۔

”سر میں نے تمہارے فون کر دیا ہے مگر وین کی تلاش میں آدی بھیج دیئے ہیں۔“ اس نے نواز شہزاد سے کہا۔

چند منٹ بعد ناصر اور نواز شہزاد اسپتال سے پولیس اسٹیشن پہنچے تو ایک نئی اطلاع ان کی منتظر تھی کسی نامعلوم شخص نے فون پر تھا نہ مگر کو اطلاع دی تھی کہ حوالدار سلامت علی اس کی قید میں ہے۔ اگر اس کی زندگی درکار ہے تو لاشوں کی چوری کے سلسلے میں کسی قسم کی کارروائی نہ کی جائے اور جس لمحے بھی ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا یا ہمیں خطرہ محسوس ہوا تو ہم حوالدار سلامت کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اگر پولیس نے تعاون کیا تو ایک ماہ بعد سلامت کو آزاد کر دیا جائے گا۔

چونکہ مجرموں نے موبائل فون سے کال کی تھی اس لئے ان کا فون نمبر ٹریس نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال نواز شہزاد اور ناصر مجرموں کی اس کال سے پریشان ہو گئے تھے اگر وہ مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتے تو پورے محکمے کی بدنامی ہوتی اگر وہ کوئی قدم اٹھاتے تو سلامت کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ کافی سوچ بچار کے بعد نواز شہزاد نے حتیٰ فیصلہ کیا کہ مجرموں کو وہ کھلی چھوٹ نہیں دے گا اگر مجرم مسلسل اپنے خوفناک اور غیر انسانی فعل کو دہراتے رہے تو پورے علاقے میں کھرام مچ جائے گا اور لوگ پولیس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

”لیکن سر..... سلامت کا کیا بنے گا؟“ ناصر نے نواز شہزاد کا فیصلہ سن کر کہا۔

”ایک آدمی کی جان بچانے کے لئے ہم پورے شہر کو بھرموں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔“ نواز نے سخت لہجے میں کہا۔

ناصر بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن حوالدار سلامت علی ان کے لئے اہم تھا۔ اس وقت گیارہ بجے تھے دوپہر تک مجرموں کی دین کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی۔ نور پور کے قبرستان سے چوری کی جانے والی لاش کا بھی کوئی کھوج نہ لگایا جا سکا۔ پہلی واردات میں مجرموں نے ایس بیس دین کے اندر ہی اپنا کام مکمل کر کے لاش وہیں پھینک دی تھی لیکن وہ دوسری لاش اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

دوپہر کے بعد نواز نے بے دلی سے سوچ لیا۔ پھر چائے پینے کے دوران ایک سپاہی نے آن کر اطلاع دی کہ محلہ بھادرا باد میں صبح سویرے ایک نوجوان لڑکی فوت ہوئی تھی جسے عید گاہ کے قبرستان میں شام کے وقت دفنایا جائے گا لڑکی کی موت کی وجہ غمگینیا تھا جس میں تین دن جتلا رہنے کے بعد وہ مر گئی تھی نواز نے اطلاع لانے والے سپاہی کو ہدایت کی کہ وہ سادہ لباس میں لڑکی کے جنازے کے ساتھ جائے اور دفن کے دوران جنازے کے شرکاء پر نگاہ رکھے کوئی شخص مشتبہ محسوس ہو تو اس کی نگرانی کی جائے پھر رات کے وقت اس لڑکی کی قبر کی نگرانی کی جائے۔

شام سے ذرا پہلے ایک اور اطلاع موصول ہوئی کہ نواحی گاؤں بلوچ نگر میں ایک نوجوان زمیندار کو پیر دغا کیا گیا ہے وہ نوجوان گزشتہ روز کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لئے فورٹ عباس گیا تھا۔ وہاں دعوت و بیمہ میں اس نے اتنا زیادہ کھایا تھا کہ شدید پیٹ درد میں مبتلا ہو کر وہیں فوت ہو گیا تھا اور آج اس کی میت وہاں سے گاؤں لائی گئی تھی جہاں اسے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ نواز کے لئے یہ اطلاع پہلے سے زیادہ اہم تھی کیونکہ گزشتہ واردات میں بھی دیہی علاقوں میں کی گئی تھیں چنانچہ رات آٹھ بجے وہ سب انسپکٹر ناصر اور دو سپاہیوں کے ساتھ بلوچ نگر روانہ ہو گیا جو شہر سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

وہاں جانے کے لئے نواز اس کے ماتحتوں نے سادہ لباس پہنے تھے اور بس سے سفر کیا تھا۔ پھر وہ مین روڈ پر بس سے اترے اور پیدل ہی گاؤں بلوچ نگر جانے والے راستے پر چلنے لگے۔ اس راستے پر نواز کا ایک ماتحت اے ایس آئی تاجر پہلے سے ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ بھی سادہ لباس میں تھا اور شام ساٹھ بجے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کوئی گاڑی یا شہری آدمی گاؤں کی طرف جاتا ہوا نہیں دکھائی دیا۔ نواز نے تاجر کو ہدایت کی کہ جب بھی کوئی گاڑی گاؤں کی طرف جائے وہ فوری طور پر موبائل فون سے اسے کال کرے اس کے بعد نواز اپنے ماتحتوں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔

حوالدار سلامت کا اغوا پولیس کی بدنامی تھی اس لئے اس واقعہ کی نواز اور اس کے ماتحتوں کے سوا کسی کو خبر نہ تھی نواز نے اپنے عمل کو کتنی سے منع کر دیا تھا کہ وہ تھانے سے باہر سلامت کے اغوا کا ذکر نہ کریں لیکن اب بلوچ نگر کی طرف بڑھتے ہوئے نواز سوچ رہا تھا کہ اگر مجرموں نے اپنی دھمکی پر عمل کر ڈالا تو پورے شہر میں یہ خبر پھیل جائے گی اور نہ صرف لوگوں کا پولیس پر سے اعتماد اٹھ جائے گا بلکہ محکمے کے افسران بالائی اس سے جواب طلب کریں گے کہ انہیں سلامت کے اغوا کی خبر کیوں نہیں دی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بلوچ نگر کے قبرستان کے قریب پہنچ گئے۔ قبرستان گاؤں کی آبادی سے تقریباً تین سو گز پیچھے اور سڑک سے چالیس پیچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ قبرستان کے گرد حفاظتی چار دیواری نہیں تھی البتہ اس کے چاروں طرف پرانے گئے درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی اس میں داخل ہونے کے دوران تھے تھے یعنی ایک سڑک کی جانب اور دوسرا کھیتوں کی طرف تھا۔ گاؤں والے ادھر سے ہی جنازہ وہاں لایا کرتے تھے کیونکہ اس طرف سے آبادی قریب تھی۔

نواز اور ناصر دونوں سپاہیوں کے ہمراہ

خاموشی سے قبرستان میں داخل ہوئے۔ ستاروں کی روشنی میں دور تک قبریں دکھائی دے رہی تھیں۔ نوجوان زمیندار ہاشم خان کی تازہ قبر پر چراغ جل رہا تھا۔ اکثر قبروں کے پاس جھاڑیاں یا پھول دار پودے لگے ہوتے تھے۔ نواز نے ہاشم خان کی قبر کے پاس رک کر اس پاس کا جائزہ لیا پھر دونوں سپاہیوں میں سے ایک کو ہاشم کی قبر سے چند قدم دور ایک جھاڑی کی آڑ میں بٹھایا اور دوسرے سپاہی کو کھیتوں کی طرف سے آنے والے راستے کے پاس ایک درخت پر چڑھنے کی ہدایت کی جو ہاشم کی قبر کے بائیں جانب واقع تھا۔ پھر اس نے ناصر کو قبرستان کے داخلی راستے کے قریب ایک گئے درخت کے پیچھے پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا جبکہ وہ خود ہاشم کی قبر کے سرہانے ایک جھاڑی میں گھس گیا اور خود کو جھاڑی میں چھپا کر انتظار کرنے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے گزر گئے لیکن کچھ نہ ہوا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ پر بے چینی سے کسی واقعہ کے رونما ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ رات کے بارہ بجے سنا سر کشادہ تھے والے درخت کی آڑ میں بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں قبرستان کے داخلی راستے پر مرکوز تھیں۔ تقریباً سوا بارہ بجے اچانک ہی قبرستان میں دو کفن پوش عطا اعزاز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ہاشم خان کی قبر کی طرف بڑھ رہے تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں نارنج روشن تھی۔

اچانک ایک شخص نے رک کر جیب سے کوئی چیز نکالی۔ پھر چند لمحوں بعد اس کی آواز قبرستان کی بھیا تک سنائی دینے لگی۔ عاتباہ وہ موبائل فون پر کسی کو کال کر رہا تھا۔

”نیس سر۔ یہاں ہمارے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ جی ہاں۔ چراغ جل رہا ہے۔ رائٹ سر۔ آپ بے فکر رہیں، میں اور آصف دونوں نے اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔ بہر حال میں مزید چیک کرتا ہوں اور پھر آپ کو کال کرتا ہوں۔“

وہ کفن پوش خاموش ہو گیا۔ آصف یقیناً دوسرا

کفن پوش تھا۔ جس نے نارنج سنبھال رکھی تھی۔

”تم بہت جھوٹے ہوا تارک۔“ نارنج بردار کی ہنسی ہوئی آواز ابھری۔ ”جائزہ لئے بغیر ہی رپورٹ دے دی۔“

”آصف۔ تم جانتے ہو کہ باس خود کتنا جھوٹا عیار ہے۔ بایاں دکھاتا ہے اور دایاں مارتا ہے۔“ طارق نامی کفن پوش بولا۔ ”ہمیں ایک قبرستان میں بھیجتا ہے لیکن خود دوسرے میں چلا جاتا ہے۔ برسوں بھی اس نے مجھے اور اسلم کو شہر کے قبرستان میں بھیجا تھا لیکن خود نور پور کے قبرستان سے لاش لینے چلا گیا تھا۔“

”گویا تمہیں یقین ہے کہ اب بھی وہ ادھر آنے کی بجائے عید گاہ کے قبرستان میں جائے گا۔“ آصف نے کہا۔

”میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے بہر حال آؤ۔ کارروائی پوری کر لیں۔“ طارق نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ دونوں ادھر ادھر بٹھکنے لگے۔ ناصر اور نواز نے ان کی باتیں سنی تھیں اور فکر مند ہو گئے تھے طارق اور آصف پندرہ منٹ تک نارنج کی روشنی میں قبرستان کے مختلف حصوں کا جائزہ لینے کے بعد ہاشم خان کی قبر پر واپس آ گئے۔

نواز مرحوم ہاشم خان کی قبر کے سرہانے کی جانب واقع جھاڑی میں چھپا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ آصف نے نارنج بجھا دی تھی۔ مگر چراغ کی روشنی میں نواز کو ان کی شکلیں واضح دکھائی دے رہی تھیں طارق نامی کفن پوش کے ہاتھ میں موبائل فون تھا جس پر وہ نمبر مار رہا تھا۔

”طارق بول رہا ہوں باس۔“ چند لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ”جی ہاں۔ ہم نے دوبارہ چیک کیا ہے۔ لیکن کوئی غیر معمولی چیز نہیں دکھائی دی۔ اوہ تو کیا ہم واپس آ جائیں؟ بہت بھتر۔ ٹھیک ہے سر۔ ہمیں ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔“ اس نے خاموش ہو کر موبائل آف کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ آصف نے تیزی سے پوچھا۔

”آج کا پروگرام کینسل کر دیا گیا ہے۔“ طارق

نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ عید گاہ والے قبرستان میں پولیس نگرانی کر رہی ہے اور وہاں خطرہ ہے جبکہ تمہارے اسٹیکر نواز سب انسپکٹر ناصر اور اے ایس آئی نادر غائب ہیں۔ پاس کو اندیشہ ہے کہ وہ تینوں اس طرف موجود ہیں لیکن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں اس نے ہمیں واپس پیچھے کا حکم دیا ہے۔“

”تو آؤ پھر لیں۔“ آصف نے کہا۔ ”باس کے اندازے غلط نہیں ہو کرتے۔“

وہ دونوں قبرستان سے باہر کوچل دیئے۔ نواز سب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ چنانچہ وہ کوئی آہٹ پیدا کرنے بغیر جھاڑی سے نکلا اور صحرے کی سمت دیکھ کر مخصوص انداز میں ہاتھ لہرایا۔ ناصر نے اس کا اشارہ سمجھ لیا اور ایکشن کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر جوں ہی آصف اور طارق اس سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچے۔ وہ اچانک درخت کی آڑ سے نکل کر ان دونوں کے سامنے آیا اور اس نے ان پر یو لور تان لیا۔

اوپر ایک کمرے میں سلامت کے ہاتھ پشت پر بندھے پڑے تھے اور وہ کمرے کے فرش پر پڑا سوچ رہا تھا کہ اس قید خانے سے کیسے نکلے۔ قبرستان میں کسی نے اچانک اس کے سر پر ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ اس کمرے میں بند تھا۔ کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی واحد دروازہ بند تھا بے ہوشی کے دوران اس کی جیبیں خالی کر دی گئی تھیں اور اس کی کلائی سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی۔ اس لئے وہ یہ اندازہ لگانے سے بھی معذور تھا کہ باہر دن ہے یا رات دو گھنٹے پہلے دروازہ کھول کر دو نقاب پوش ریوالور بردار اندر آئے تھے ایک نے اس کے ہاتھ کھولے تھے اور دوسرا اس پر ریوالور تان کر کھڑا رہا۔ پھر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی اندر آئی اور کھانے کی ٹرے سلامت کے آگے رکھ کر چلی گئی تھی۔ نقاب پوشوں کے حکم پر اس نے کھانا کھا یا اور وہ دونوں اسے دوبارہ باندھ کر کمرے سے باہر نکال گئے

تھے۔ سلامت نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ایک آدمی نے اسے اشارے سے بتایا تھا کہ وہ دونوں گونگے ہیں۔

سلامت سمجھ گیا کہ وہ دونوں اس سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ پھر نوجوان لڑکی اس کے لئے ایک کبل لائی تھی لیکن اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے کبل سلامت پر ڈالا تو سلامت نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی۔

”کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔“ سلامت نے کہا تو لڑکی نے سلامت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”میرا نام کوئی نہیں ہے۔“ میں گونگی اور بہری ہوں۔ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

اس کی اوپر سلامت نے ٹھنڈا سانس لیا اور وہ لڑکی کمرے سے نکل گئی۔ جاتے وقت اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا کبل سلامت نے اندازہ لگایا تھا کہ باہر رات کا وقت ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ناصر اور نواز اس کی آزادی کے لئے کوشش کر رہے ہیں یا نہیں؟ مجرم کیا چاہتے ہیں اور اسے کیوں قید کر رکھا ہے؟ یہی کچھ سوچتے ہوئے اسے نیند آگئی پھر اچانک کسی نے اس کے پہلو میں ٹھوک کر سید کی اور اس نے درد سے بلبلہ کر آ نکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو ایک نقاب پوش اور وہی لڑکی کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ٹھوکا یقیناً نقاب پوش نے ہی رسید کی تھی کیونکہ وہ سلامت کے قریب کھڑا تھا اور لڑکی دروازے کے پاس موجود تھی۔

”اشو حوالدار تمہاری آزادی کا وقت آ گیا ہے۔“ نقاب پوش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”جگانے کے لئے ٹھوکر مارنا ضروری تو نہیں تھا۔“ سلامت نے فرش سے اٹھ کر اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”زیادہ بات کی تو دانت توڑ دوں گا۔“ نقاب پوش نے غراتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہاتھ کھول دو۔ پھر دیکھتا ہوں تم کسے دانت توڑتے ہو۔“ سلامت نے غصے سے کہا۔

”بکومت..... باہر چلو۔“ لڑکی نے سلامت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... مس کوئی..... میں نے تمہیں تو کچھ نہیں بولا۔“ سلامت نے حیرت سے کہا۔

”میرا نام کوئی نہیں ہے۔“ لڑکی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”تم نے خود تو بتایا تھا پچھلی ملاقات میں۔“ سلامت نے مسکرا کر کہا۔

”اس سے بات مت کرو۔“ نقاب پوش نے سلامت کو دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”کیوں..... کیا یہ تمہاری سسٹر ہے۔“ سلامت نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اس پر نقاب پوش نے فوراً ہی سلامت کی کمر میں لات رسید کر دی اور سلامت لڑکھڑا کر مرنے کے بل لڑکی کے قدموں میں جا گرا۔

”کھڑے ہو جاؤ۔“ لڑکی نے جھک کر ریوالور سلامت کے سر سے لگاتے ہوئے حکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ کمرے سے باہر آئے۔ باہر راہداری تھی جس میں لڑکی کمرے تھے۔ چھت میں نصب بلب روشن تھا۔ لڑکی نے اس کے آگے چلتے ہوئے کہا۔ ”میرے پچھلے چلے آؤ۔“

”سلامت اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کے عقب میں نقاب پوش چل رہا تھا۔ لڑکی دائیں ہاتھ کے تیسرے کمرے میں داخل ہوئی تو سلامت بھی اندر داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں شاندار صوفیہ سیٹ، ٹی وی اور دوسرا فرنیچر موجود تھا۔ سامنے والے صوفے پر ایک اور نقاب پوش بیٹھا سلامت کو گھور رہا تھا اس کے ہاتھ میں ریوالور تھی، بائیں دیوار کے پاس ایک لمبی آہنی میز رکھی تھی جس کے برابر میں ایک چھوٹی میز پر چند آلات جراحی پڑے تھے۔

”اتنی دیر لگادی اسے لانے میں۔“ صوفے پر بیٹھے شخص نے ریوالور بردار نقاب پوش سے سخت لہجے میں پوچھا۔

”باس..... یہ نمبر سیون سے مذاق کر رہا تھا۔“ لڑکی نے تیزی سے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ سلامت نے غصے سے کہا۔

اس نے مجھے بے بس دیکھ کر میری کم میں لات رسید کی تھی؟“

”اس نے تو صرف لات رسید کی تھی جبکہ میں تمہیں ذبح کرنے والا ہوں حوالدار سلامت علی۔“ نقاب پوش پاس نے غراتے ہوئے کہا۔

”کک..... کیوں؟“ سلامت نے بوکھلا کر کہا۔ ”میں نے کیا جرم کیا ہے؟“

”جرم تمہارے افسروں نے کیا ہے۔“ پاس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انہیں وارنٹ دی تھی کہ اگر پولیس نے ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو سلامت کو قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس وارنٹ کی پروا نہیں کی۔“

”تو سرجی..... اس میں میری کیا خطا ہے۔“ سلامت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”آج ذرا انصاف سے کام لیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ پاس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”صرف یہ کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ کمرے واڑھی والا اور پکڑا جائے موچھوں والا۔ یہ انصاف اور قانون کے خلاف ہے۔“ سلامت نے منہ بنا کر کہا۔

”بکومت.....“ پاس نے اسے ڈانٹا۔ ”یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔“

لڑکی سلامت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ پاس کی ڈانٹ سن کر سلامت خوف زدہ ہو گیا مگر خاموش رہا۔

”نمبر سیون۔ سلامت کے آپریشن کی تیاری کرو۔“ پاس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے ہا۔ اسے ٹیبل پر لٹا دو۔“

اس کا حکم سن کر سلامت کا چہرہ خوف سے ایکدم زرد پڑ گیا اور موت کے خوف سے اس کے بدن میں

سنسناٹ پھیل چلی گئی، نمبر سیون نے ریوالور جیب میں رکھا اور لڑکی سے بولا۔ ”روبی، نمبر تھری کو بلاؤ۔“
لڑکی جس کا نام روبی تھا، پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ باس ٹپکتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔
ایک منٹ بعد روبی وہیں آئی تو اس کے ساتھ ایک صحت مند اور میٹھا عرصہ تھا۔ شاید اسی کا نام نمبر تھری تھا۔ لیکن سلامت اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کی شکل اسے کچھ جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ سلامت نے اپنے ذہن پر زور دیا اور اسے فوراً ہی یاد آ گیا۔ اس آدمی کا نام دلاور تھا اور گزشتہ سال اسے نشیات پیچنے کے جرم میں پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ مگر عدالت نے اسے صرف چھ ماہ کی سزا دی تھی۔

”نمبر تھری، حوالدار سلامت کو آپریشن ٹیبل پر لٹانے میں میری مدد کرو۔“ نمبر سیون نے دلاور سے کہا۔
دلاور نے آگے بڑھ کر سلامت کو شانے سے پکڑا اور کہتے ہوئے دیوار کے ساتھ موجود آپریشن ٹیبل کے پاس لے آیا۔
”چھوڑ دو مجھے۔ ورنہ تم پچھتاوے گے۔“ سلامت نے غصیلے لہجے میں کہا۔
”لیکن دلاور نے سلامت کے منہ پر گھونسا سید کر دیا اور غرایا۔ ”چلو۔ میز پر لیٹ جاؤ۔ ورنہ حلیہ بگاڑ دوں گا۔“

نمبر سیون بھی قریب آ گیا۔ پھر ان دونوں نے سلامت کو اٹھا کر میز پر لٹا دیا، نمبر سیون نے میز سے منسلک پڑی ٹیبل سے سلامت کے دونوں پاؤں کس دیے جب دلاور نے سلامت کے پشت پر بندھے ہاتھ کھولے اور میز کے ساتھ باندھ دیے۔ اب سلامت اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے سے محذور تھا۔ موت کے خوف سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ روبی نے ایک الماری سے ایپرن نکال لیا اور ایک ایپرن نمبر سیون کے حوالے کر کے دوسرا خود اپنے جسم پر باندھ لیا۔ نمبر سیون نے بھی ایپرن باندھا۔

”باس۔ کیا اسے بے ہوش کر دوں؟“

نمبر سیون نے باس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم..... تم لوگ کیا کر رہے ہو.....؟“ سلامت نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”تمہارا آپریشن۔“ نمبر سیون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سینہ چاک کیا جائے گا اور پھر.....“

”نن۔ نہیں۔“ سلامت نے دہشت سے چیخ کر کہا۔ ”ارے ظالمو! کم از کم مجھے بے ہوش تو کرو تاکہ میں اپنی چیز بچاؤ نہ دیکھ سکوں۔“

”بے فکر ہو۔“ باس نے میز کی طرف سے آتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تمہاری شرگ کاٹی جائے گی بعد میں سینہ چیرا جائے گا اور.....“

ٹھیک اسی لمحے فائر کے دھماکے سے کمرہ گونج اٹھا۔ ان لوگوں نے تیزی سے دروازے کی طرف دیکھا تو ایک آدمی ہاتھ میں ریوالور لئے وہاں کھڑا انہیں گھور رہا تھا، اسے دیکھ کر باس بے اختیار اچھل پڑا۔ سلامت بھی خوش ہو گیا کیونکہ ریوالور بردار انسپکٹر نواز ش تھا۔ اس نے تجھمانے لہجے میں کہا۔

”خبردار۔ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔ پولیس نے پورے گرجا گھر کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔“

”تم کون ہو.....؟“ باس نے سخت لہجے میں کہا۔
”تم مجھے اچھی طرح پہچانتے ہو ڈاکٹر۔“ نواز ش نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے نمبر سیون نے تیزی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ریوالور نکالے۔ روشن دان کی طرف سے ایک فائر ہوا اور نمبر سیون نے چیخ کر اپنے شانے پر ہاتھ رکھ لیا جہاں سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔ سلامت نے بے اختیار چہرہ گھما کر روشن دان کی طرف دیکھا تو وہاں سب انسپکٹر ناصر بیٹھا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ریوالور باندھا ہوا تھا۔

روبی کا خوبصورت سفید چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا تھا جبکہ دلاور نے ہاتھ بند کر رکھے تھے۔ اسی لمحے اے ایس آئی نادر چند سپاہیوں کے ہمراہ تیزی سے

کمرے میں داخل ہوا۔
”سر..... ان لوگوں کے علاوہ صرف دو افراد ملے ہیں اس عمارت میں۔“ نادر نے نواز ش سے کہا۔ ”نہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

سپاہیوں نے باس اور اس کے ساتھیوں پر اقلین تان لیں جبکہ نادر نے ریوالور سے دلاور کو گرفتار کیا تھا۔ نواز ش نے آگے بڑھ کر اپنے ریوالور کی بال باس کے سینے سے لگا دی جو آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کوٹ کی جیب کی طرف بڑھا رہا تھا۔

”نہیں۔ اب تم کچھ نہیں کر سکتے ڈاکٹر۔“ نواز ش نے سخت لہجے میں کہا اور دوسرا ہاتھ باس کی جیب میں ڈال کر اس کا ریوالور نکال لیا۔ تب باس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

پولیس اسٹیشن میں چند صحافیوں کے علاوہ میڈیا کے ڈوکر افراد بھی موجود تھے۔ وہ حوالات میں بند مجرموں کی تصویریں بنا رہے تھے۔ انسپکٹر نواز ش، سب انسپکٹر ناصر، اے ایس آئی نادر اور حوالدار سلامت علی بھی وہاں موجود تھے۔ انسپکٹر نواز ش صحافیوں کو کیس کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔

”بواجوئے گمر کے قبرستان میں لٹن پوش طارق اور آصف کی گھٹگوٹن کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ان دونوں کو گرفتار کر کے ان کے ذریعے ان کے سرغنہ تک پہنچا جاسکتا ہے چنانچہ میں انہیں پکڑ لیا اور وہیں ان پر تشدد کر کے ان کی زبان کھلوائی۔ پھر ان کی نشاندہی ہوئی اور وہیں شہر آیا اور گرجا گھر پر چھاپے مارا اس وقت یہ ایک سلامت کو بے ہوش کئے بغیر آپریشن ٹیبل پر باندھ کر اس کا پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے تیار تھے۔ اگر میں ایک منٹ بھی تاخیر سے اندر جاتا تو ڈاکٹر حوالدار سلامت کو زخم کر چکا ہوتا۔“

نواز ش خاموش ہوا تو صحافی حیرت سے ادھیڑ مڑا کر کوئی کہنے لگے جو کہ سفید قام غیر ملکی تھا۔

”انسپکٹر صاحب۔ آپ کو کیا پہلے اس پر شک نہیں ہوا تھا؟“ ایک صحافی نے نواز ش سے سوال کیا۔

”نہیں۔ میرے فرشتوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر مجرم ہو سکتا ہے۔ آپ سب بھی ڈاکٹر رابرٹ کو فادر رابرٹ فورڈ کے نام سے پہچانتے ہیں یہ ایک سال پہلے کراچی کے ایک چرچ سے یہاں آیا تھا۔ یہ لڑکی روبی اس کی داشتہ ہے لیکن بظاہر باپ بیٹی بنے ہوئے تھے۔ یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد ایک غیر ملکی گروہ نے ڈاکٹر سے رابطہ قائم کر کے اسے بھاری معاوضے پر اپنے لئے کام کرنے پر آمادہ کیا۔“ نواز ش نے جواب میں کہا۔
”کون سا کام.....“ صحافی نے پوچھا۔

”یہی۔ تازہ لاشوں کو قبر سے نکالنا اور ان کے بدن کو چیر پھاڑ کر کے نازک اعضا نکالنا پھر ان اعضا کو بذر رعبہ رجنٹ میل پارسل کرنا۔ شروع میں ڈاکٹر نے اپنا ایک گروہ ترتیب دیا جس میں جرائم پیشہ افراد کو شامل کیا گیا۔ پہلے ڈاکٹر لاش کا پوسٹ مارٹم وہیں قبرستان میں ہی کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان وارداتوں کا کسی کو پتا نہ چل سکا۔ کیونکہ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش قبر میں دوبارہ دفن کر دی جاتی تھی۔ لیکن ایک گاؤں میں ان لوگوں نے جلد بازی میں لاش قبرستان کے باہر ہی پھینک دی تھی اور صبح گاؤں والے لاش اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ ڈاکٹر رابرٹ نے اعتراف کیا ہے کہ گزشتہ چار ماہ میں یہ کم از کم تیس لاشوں کے اعضا نکال کر فروخت کر چکا ہے۔ اسے ایک لاش کے اعضا کا معاوضہ اچھا خاصا ڈالر کی شکل میں ملتا ہے اور یہ رقم لندن کے ایک بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں جمع کرادی جاتی ہے۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ چار پانچ لاکھ ڈالر جمع کر کے لندن میں برنس کرے گا۔“ نواز ش نے تفصیل سے بتایا۔

”اب بے چارہ جیل میں ساری عمر برنس کرتا رہے گا۔“ سلامت نے طنز پر لہجے میں کہا۔
”اس کے جرم کی سزا پانچ سی کا تختہ ہے، اب یہ جہنم میں برنس کر سکے گا۔“ نواز ش نے ہنس کر کہا تو تمام لوگ بے اختیار مسکرانے لگے۔



خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلم کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے ستلاشی لوگوں کے لئے اچھے میں ذاتی حیرت انگیز اور تیراگیز کہانی

دماغ پر شدید بحران سوار ہو گیا۔ ہر شے سے وحشت مچنے لگی۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور اضطراری طور پر کسی سنان گوشے کی تلاش میں چل پڑی۔ آس پاس ابھی تک کسی درندے کی موجودگی کے نشان نہیں ملے تھے اس لئے مارشل کے مسافر کی خوف کے بغیر دور تک نکل جاتے تھے۔ اس وقت بھی دور دور تک لوگ بکھرے نظر آ رہے تھے میں کسی سنان اور پرسکون گوشے کی تلاش میں تھی چنانچہ کافی دور نکل آئی۔ ہر طرف کھجوروں کے درخت بکھرے ہوئے تھے اس کے علاوہ سرسبز چٹانیں نظر آ رہی تھیں میں بے خیالی میں بہت دور نکل آئی۔ ماحول تاریک ہوتا جا رہا تھا ایک چٹان کے دوسری طرف پہنچی تو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ کوئی عورت ہے ایک لمحے کے لئے دل خوف سے دھڑک اٹھا۔ بہت سے دوسرے دل میں جاگے بھوت، پریٹ، چڑیل، کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے سوچا کہ واپس دوڑ جاؤں۔ لیکن پھر ایک اور خیال آیا ممکن ہے کوئی تسم رسیدہ عورت ہو، جہاز پر ایسے بہت سے مرد عورتیں تھیں جن کے پیارے طوفان کی نذر ہو گئے تھے اور وہ تیارہ گئے تھے ایسے لوگ اکثر روتے نظر آتے تھے۔ ممکن ہے وہ بھی

کوئی ایسی ہی عورت ہو، جو بھری طرح تباہی کی تلاش میں اس طرف آ گئی ہو چنانچہ میں چند قدم آگے بڑھی۔ میرے قدموں کی آہٹ پر عورت نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور میری جان نکل گئی۔ برف جیسا سفید چہرہ، پتلا آگ برسائی آنکھیں، شناسا نقوش، یہ وہی عورت تھی جو مجھے پراسرار طور پر اس مکان میں لٹی تھی اور اس نے مجھ سے نفرت کا اظہار کیا تھا۔ میرے قدم جیسے جم کر رہ گئے۔ میں واپس پلٹ کر بھاگنے کی کوشش بھی کرتی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ میرے اعصاب خوف سے شل ہو گئے تھے حالانکہ ماحول تاریک ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے کے نقوش میں ایک انوکھی چمک تھی۔ اچانک اس کے نقوش تبدیل ہونے لگے اور اس کے چہرے پر نفرت ابھر آئی۔ اسکے سفید دانت چمکے اور وہ ہونٹ سکڑ کر چٹان کے دوسری طرف کود گئی۔ چٹان خالی ہو گئی۔

میں کہتے کے عالم میں کھڑی تھی اچانک مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی تو میں نے سہم کر گردن گھمائی میں نے ایک اور حیران کن منظر دیکھا وہ روشنائی تھا جس نے ایک عجیب و غریب حلیہ بنا رکھا تھا وہ قدم دور کے راہبوں اور کاہنوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھا۔

ہاتھ میں ایک اڑدھے کی شکل کا عصا تھا۔ اور سر پر ایک لمبی سی رینگن ٹوپی جس میں چمکدار پتھر لگے ہوئے تھے۔
 جب ہی اس کی تھمتائی آواز سنائی دی۔
 ”سمونا دوختہ وار دوسا نا عاغب، تقدیس ہو تیری۔
 تقدیس ہو تیری۔ اشواتیہ اشونی کی سب سے مقدس روح، تقدیس ہو تیری۔ تقدیس ہو تیری، تقدیس ہو تیری اور کوع کے سے انداز میں جھک گیا۔
 مجھے نہ جانے کیا سوچی، میں اسے نظر انداز کر کے اس چٹان کی طرف دوڑی جس پر مجھے وہ مخصوص عورت نظر آئی تھی اب تک میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ عورت روشاق ہی کا دوسرا روپ تھا۔ لیکن اس وقت وہ دونوں ہی نظر آ گئے تھے اور میرے تجسس نے ہی میرے اعصاب درست کر دیئے تھے میں چٹان کے دوسری طرف پہنچ گئی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ میں وہیں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
 ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی، آنے والا روشاق ہی تھا وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”مشکل ہے؟“ اس نے پراسرار انداز میں کہا۔
 اور میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی وہ پھر بولا۔ ”وہ جا چکی ہے۔“
 ”کون ہے وہ؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”اس“ وہ جیسے چوک کر بولا۔ لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا یہ چونکنا مصنوعی ہے میں نے اسے محسوس کر لیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے کہا۔
 ”ایک سوال کروں مسٹر روشاق۔“
 ”جی عالیہ۔“
 ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“
 ”معصوم سوال ہے کیا جواب دوں۔“
 ”آپ میرا پچھا کر رہے ہیں۔“
 ”ہاں۔“ وہ سکون سے بولا۔
 ”آخر کیوں؟“
 ”اس سوال کا جواب پہلے بھی دے

چکا ہوں، دوبارہ سن لو۔“ میں اکثر تمہارا تعاقب کرتا ہوں۔ خصوصاً ان اوقات میں جب تم تنہا ہوتی ہو۔
 اور دوسروں سے الگ تھلک، اس اوقات میں تم سے دور نہیں ہوتا۔
 ”آخر کیوں؟“
 ”اس خیال سے کہ شاید تنہائی میں ہارون دانش تمہارے پاس آنے کی کوشش کرے اور میں ایک بار صرف اسے بتا سکوں کہ میں اس کا دشمن نہیں، دوست ہوں۔“
 ”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ میرے آس پاس ہوتے ہیں۔“
 ”تمہیں یقین نہیں ہے؟“
 ”مجھے۔۔۔۔۔ میں چوک کر بولی۔
 ”ہاں بے بی، تم نے مجھ سے جو فاصلے اختیار کر رکھے ہیں ان میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ ہارون دانش نے جو راستے اختیار کئے ہیں وہ غیر دانش مندانہ ہیں۔ اور وقت بتائے گا کہ ان فیصلوں نے اسے کیا نقصان پہنچایا۔ اور تم بھی بہت ہی حقیقتوں سے آشنا ہو لیکن ہارون کی طرح تم بھی مجھ سے تعاون نہیں کر رہے۔“
 ”میں کوئی حقیقتوں سے آشنا ہوں۔“
 ”کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ ایرنوس کی تحویل میں موجود تالیوٹوں میں ہارون دانش اور تمہاری ماں کے تصوراتی اجسام موجود ہیں۔“
 ”میری ماں۔“ میرے منہ سے جیسے حسرت بھری سسکی نکل گئی۔
 ”میں نے تصوراتی کا لفظ استعمال کیا ہے۔“
 ”وضاحت بھی کر دو۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔
 ”ممکن نہیں ہے بی۔ یہ کہانی تاریخ میں گم ہو گئی ہے۔ ہم سب ہی تاریخ کی کھون میں ہیں۔“ روشاق کی پراسرار آواز ابھری۔
 ”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”تمہیں معلوم ہے۔“ وہ بولا۔
 ”مجھے کچھ نہیں معلوم۔“ میں نے چیخ کر کہا۔
 ”جھوٹ بول رہی ہو تم۔ میں نے تہہ خانے میں تمہارے الفاظ سنے تھے تم اپنے باپ کو مخاطب کر رہی تھیں۔ وہ بھی کرخت لہجے میں بولا۔ اور میں گہری گہری سانس لینے لگی۔ میں نے ذہن کو سنبھالا اور کہا۔
 ”مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا۔ ایرنوس کی زندگی میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا وکسن ڈیزل سے کوئی تعلق ہے۔“
 ”وکسن ڈیزل۔“ روشاق کی آواز میں بھڑبھڑاہٹ پیدا ہو گئی۔ ”اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو اس بات کے امکانات ہیں کہ وکسن ڈیزل۔۔۔۔۔ روشاق نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔
 اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ممکن ہے وکسن ڈیزل کو ہارون دانش نے کوئی ہدایت کی اور مجھے اس کے پاس پہنچ دیا۔ لیکن اب۔۔۔۔۔ وہ بے بس ہو چکا ہے اور اس کا اظہار بھی کر چکا ہے۔ مرنوئی بھی بری طرح بددل ہو کر مجھے چھوڑ چکی ہے اور عسکری نے بھی منہ موڑ لیا ہے۔ ہارون دانش کی طرف سے بھی مجھے کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔ بالکل نہیں اور بے یار و مددگار ہوں حالات ہولناک اور غیر یقینی ہیں ایسی مشکل میں اگر روشاق سے تعاون کر لوں تو برا تو نہیں ہوگا۔ کون ہے میرا نہ ماں باپ کا پتہ نہ کسی اور کا۔ اسی وقت روشاق کی آواز ابھری۔
 ”اب مجھے ایک اور شبہ ہو رہا ہے۔“
 ”کیا مسٹر روشاق؟“ میں نے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا جیسے میری موجودگی بھول گیا ہے۔ پھر اس نے کہا۔
 ”وکسن ڈیزل کوئی ہی کھیل کھیل رہا ہے۔“
 ”سب کے اپنے اپنے کھیل ہیں مسٹر روشاق۔ ہر ایک کی صورت بدلی ہوئی ہے، سب فریما، جھوٹ، اپنے مقصد کے لئے سرگرداں، کتنے

کردار میرے گرد بکھرے ہوئے ہیں احمد جیدی، عدنان شانی، وکسن ڈیزل اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“
 ”تم گمشدہ وجود ہو بے بی، تمہیں ہی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“
 جن باتوں کو تم سچ کا نام دیتی ہو وہ صرف کہانیاں ہیں، زندگی صرف ایک حسین مجبوری ہے ہر انسان اس مجبوری کو پرورش کرنے کے جن کرتا ہے تم بھی یہی کرو، اپنے بارے میں سوچو صرف اپنے بارے میں جہاں سچ بولنا پڑے وہاں سچ بولو، جہاں جھوٹ ضروری ہے اس سے دریغ نہ کرو۔ اسی طرح یہ مجبوری ٹالی جاسکتی ہے ورنہ مشکلوں کے سوا کچھ حاصل نہیں۔“
 ”میں جس مشکل کا شکار ہوں مسٹر روشاق، اس کا کوئی حل ہے۔“ میں نے سوال کیا۔
 ”ان مشکلات کا آغاز کہاں سے ہوا؟“ وہ بولا۔
 ”اس وقت سے جب آپ لوگ یعنی امیر الحسنات، مائیکل جون اور آپ ہارون دانش کے پاس آئے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔
 ”اس سے پہلے۔“
 ”میری زندگی پرسکون تھی۔ ہارون دانش ایک شفیق باپ تھے ماں کے بارے میں مجھے صرف اتنا علم تھا کہ وہ یہ دنیا چھوڑ چکی ہیں۔“
 ”تمہاری مصروفیات کیا تھیں۔“
 ”ہارون دانش کے ساتھ پریش زندگی گزار رہی تھی۔ پھر آپ لوگ آئے تو اس کا پروگرام بنا کارچوک کی پہاڑیوں میں ایک تہذیب کی تلاش کا منصوبہ طے ہوا۔ اور وہیں سے ہماری بلکہ میری بد نصیبی کا آغاز ہوا۔“
 ”کارچوک تک کا سفر کرتے ہوئے تمہیں کسی عجیب بات کا احساس نہیں ہوا۔“
 ”کیسی عجیب بات۔“
 ”جیسے تم کسی ایسی جگہ جا رہی ہو جہاں سے تمہارے ماضی کا کوئی واسطہ ہے۔“

”میرا ماضی۔“ میرے دل کو دکھا سا لگا۔

”میرا مطلب ہے کوئی ایسا احساس جو اجنبی اجنبی سا ہو، لیکن خود سے شملک لگے۔ میں سوچ میں ڈوب گئی روشاق کے ساتھ اب اپنا رویہ بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ اب مناسب بھی لگ رہا تھا کیونکہ یہ شخص سب سے کارزار تھا، کسی اور سے تو اب کوئی امید ہی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”نہیں مسٹر روشاق، اس وقت تک کوئی احساس نہیں تھا لیکن وہاں جو کچھ ہوا اس نے میرے دماغ کی چولیس ہلا دیں۔“

”مثلاً؟“ اس نے سوال کیا اور میرے ذہن میں کلبلا ہٹ ہونے لگی۔ وہ باتیں میرے ذہن پر ڈنک مارنے لگیں۔ سب کچھ یاد آنے لگا اور میں کھوٹی کھوٹی آواز میں بولی۔

کارچوک کے غار، وہاں ملنے والا تابوت اس میں میری لاش، وہ کون تھی مسٹر روشاق، وہ میں تو نہیں تھی۔ وہ تو نزائندہ تھی میرا اس سے کیا تعلق تھا اور مندر کی وہ پجاری اس کے لئے ہونے والی جنگ وہ تو ایک طلسم تھا۔“

”وہ طلسم نہیں تھا بے بی، وہ تاریخ کی سب سے بڑی سچائی تھی۔“ روشاق نے کہا اور میں جیسے خواب سے چوٹ بڑی۔

”وہ طلسم نہیں تھا۔“ میں نے کہا اور روشاق چوٹ کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”مسٹر ہارون نے بعد میں تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ وہ تابوت آپ لے گئے تھے، وہ لاش آپ نے چرائی تھی؟“

”تم سب کا یہی خیال ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں تھا، وہاں کچھ اور ہی ہوا تھا۔“ وہ پر خیال لہجے میں بولا۔

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے کہا اور وہ چوٹ بڑا۔

پھر بولا۔

”یہ وقت کی امانت ہے جس میں خیانت ممکن نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”یہ رویہ ہے حسب کابات کافی حد تک مجھ سے متعلق ہے لیکن میں ہی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہارون دانش نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور روپوش ہو گئے۔“

”ایک سوال کروں؟“ روشاق بولا۔

”ہوں۔“

”تم ہارون دانش کا نام اجنبیوں کی طرح لیتی ہو، انہیں ڈیڑی، بابا پاپا نہیں کہتیں۔“

”ہاں۔ اب سب کچھ اجنبی ہو گیا ہے۔ ماں بھی نامعلوم ہے اور باپ بھی۔“ میری آواز سسکی میں بدل گئی۔

”کافی حد تک ٹھیک کہتی ہو۔ ویسے اگر دل قبول کرے تو یقین کر لو، جو کھیل اس جہاز پر ہوا ہے یا اس جزیرے پر جاری ہے وہ بس ایک وقفہ ہے حالانکہ یہ سب کچھ تمہاری کوئی تمہارے شہر میں بھی ہو سکتا تھا۔ اس جہاز پر، یا اس جزیرے پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں نہیں سمجھتی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ تم ان سب سے الگ ہو۔ تمہارا اپنا مقام ہے جسے کوئی زوال نہیں ہے۔ سارے زوال تم پر سے گزر چکے ہیں، تم تاریخ ہو، ایک ٹھوس اور مستحکم تاریخ جو اپنا سفر گزار چکی ہے۔ اور وقت کی کتاب میں درج ہے نہیں بدلا نہیں جاسکتا۔“

”تاریخ؟“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہاں، جو کبھی نہیں بدلتی۔“

”کیسے مسٹر روشاق؟“

”کاش! یہ تفصیل تمہیں ہارون دانش بتاتا۔“

”آپ نہیں بتا سکتے؟“

”نہیں۔ لیکن تمہیں کچھ اعتراضات کرنے ہوں گے۔“

”کیا.....؟“

”تمہیں ہارون دانش کے وجود پر یقین ہے۔“

”بابا۔“ میرے حلق سے سسکی نکل گئی۔ میں نے ٹھوکر لہجے میں کہا۔ ہاں مجھے یقین ہے۔ ان کی لائبریری میں مجھے ان کے سگاری خوشبو سی می میں نے ان کے قدموں کی چاپ، ان کے وجود کی خوشبو محسوس کی ہے۔ اور اب میں ان کے کس کو ترستی ہوں، یہی میں ان سے انحراف کرتی ہوں اسے کے ہمدانی نے ایک عمارت تک میری رہنمائی کی تھی اور میں نے.....؟“

”ہمارے؟ اچانک روشاق چوٹ بڑا۔

”ہاں۔ میں نے اسے عمارت میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا دیا۔“ اور وہ ہاتھ ملنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلا۔

”اوہ۔ اوہ، کاش مجھے یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی۔ وہ بے وقوف بلاوجہ میرے ہاتھوں زندگی سے محروم ہو گیا۔“

”کون.....؟“ میں نے چوٹ کر پوچھا۔

”ابروفس۔“ روشاق نے ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کیا پانی آواز میں کہا۔

”اسے تم نے قتل کیا تھا۔“

”مجبوری تھی بے بی، وہ میرے راستے روک رہا تھا اور اس نے مجھے ایک نقصان سے دوچار کیا تھا۔ خیر اس کا تذکرہ چھوڑ دو۔ مجھے بتاؤ۔ اس کے بعد تم نے کبھی ہارون دانش کو اپنے نزدیک پایا۔“

”نہیں؟“

”مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“

”لیکن روشاق۔ تم قائل ہو۔ تم نے اتنی آسانی سے ایک زندگی لے لی۔ اور۔ اور اے کے ہمدانی کے بارے میں تم کہتے ہو کہ اسے احر جیندی نے زخمی کیا تھا۔“

”میں اپنے اور تمہارے درمیان سچ کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، بے بی کوئی جھوٹ ہاتھ آجائے تو تمہاری سوچیں آزاد ہوں گی۔ ابھی میرے

خلوص کو زخمی کرنے کی کوشش نہ کرو۔“

”مشکل تو یہ ہے مسٹر روشاق کہ ہر شخص نے مجھے تاریکی میں رکھا ہے کوئی مجھے یہ نہیں بتاتا کہ میری ابتدا کیا تھی۔ میری ابتدا کیا ہے۔ کوئی ایسا ہے جو مجھے انسان سمجھے مجھے میرے تاریک ماضی سے روشناس کرائے۔“

”میں ہوں۔ صرف میں ہوں، میرے سوا اور کوئی نہیں بتا سکتا۔“

”اگر تم مجھے یہ بتا دو روشاق، تو تم سے اچھا دوست میرے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”ضرورتاًؤں گا بے بی، جتنا مجھے معلوم ہے ضرورتاًؤں گا۔ لیکن ایک مشکل ہے۔“

”کیا.....؟“ میں نے بے فرائی سے پوچھا۔

”جو لوگ تمہارے ہمدارین گئے ہیں وہ میرے دشمن ہیں، جب تک وہ تم سے شملک ہیں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں ان سے قطع تعلق کر لوں گی۔“

”لیکن وہ تم سے قطع تعلق نہیں کریں گے۔“

”میں انہیں منہ نہیں لگاؤں گی۔“

”نہیں بے بی، وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے، کبھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”مجھے بتاؤ۔ وہ مجھے کیسے مجبور کر سکتے ہیں؟“

”جیندی نے تمہیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ولسن ڈیزل کو یہ خدشہ ہوا ہے کہ تم اس سے دور ہو رہی ہو تو وہ بھی کچھ نہ کچھ کرے گا۔“

”تو آخر، میں کیا کروں۔؟“

”کچھ کر سکو گی؟“

”ہاں، سب کچھ، جو تم کہو گے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ روشاق کی کھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

”تب تمہیں تین افراد کو قتل کرنا ہوگا، احمد جیندی، عدنان شانی اور ولسن ڈیزل! تمہیں ان تینوں کو زہر دے کر ہلاک کرنا ہوگا۔“

میرے حلق سے خوف کی آواز نکل گئی۔ بمشکل تمام میرے حلق سے نکلا۔ ”زہر.....؟“

”ہاں..... وہ زہر، جس نے ابروؤں کو ہلاک کیا تھا۔“

”تمہیں نہیں۔ یہ میں کیسے کر سکتی ہوں، میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔“ میں وحشت زدہ لہجے میں بولی۔

”میں جانتا ہوں اسی لئے کہتا ہوں کہ وقت کا انتظار زیادہ بہتر ہے، جب تمہیں دوسروں کے تسلط سے آزاد پاؤں گا تو بہت کچھ بتا دوں گا، ان حالات میں یہ ممکن نہیں ہے۔“

”میرا ایک غر انسان ہے۔ وہ اپنے خطرناک دشمنوں کو بھی عامی نگاہوں سے دیکھتا ہے، جہاز پر اس نے احر جینیڈی کو جو سزا دی تھی اگر سفر جاری رہتا تو احر جینیڈی وہی کام کرتا رہتا جو اسے سونپا گیا تھا۔ اب وہ اس جزیرے پر دوسروں کی طرح آزاد ہے اور ممکن ہے کہ اس طرح تمہارے آس پاس بھی موجود ہو اور ہماری باتیں سن رہا ہو۔“

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تو روشاق آہستہ سے ہنس دیا پھر بولا۔

”اسے اہمیت نہ دو، نہ تمہیں اس سے کوئی خطرہ ہے اور نہ مجھے۔“

”اوہ! مسٹر روشاق! کاش آپ میری مشکل حل کر سکتے؟“

”یقین کرو بے بی، تمہاری مشکل کا حل نہ میرے پاس ہے نہ احر جینیڈی، عدنان شانی اور وکسن ڈیزل کے پاس، صرف وقت تمہارا رہتا ہے، وہی تمام فیصلے کرے گا۔“

”لیکن آپ مجھے کچھ تو بتا سکتے ہیں کہ جس طرح میرے باپ کا ایک ٹوٹا پھوٹا وجود ہے اسی طرح کیا میری ماں بھی موجود ہے؟“

”ہاں وہ ہے۔“

”زندہ ہے؟“ میں نے بے قراری سے سوال کیا۔ روشاق تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

”میری سمجھ لو۔“

”کیا وہ نزالہ ہے یا کوئی اور ایسا نام جو تاریخ میں چھپا ہوا ہو، نزالہ اس لڑکی کو کہا گیا جو کارچوک کی پہاڑیوں میں ہے ہوئے غاروں میں ایک تابوت میں موجود تھی اور سو فیصدی میری بمشکل تھی، یہی سوچا جاسکتا ہے کہ وہ اگر نہیں تھی تو شاید میری ماں تھی۔“

ایک بار پھر روشاق گہری سوچوں میں ڈوب گیا پھر بولا۔ ”تمہیں وہ نزالہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ تمہاری ماں ہے۔“

”تو پھر وہ کون تھی؟“

”تاریخ کا ایک انوکھا باب، شاید آشتوانی مندر کی سب سے بڑی پجاریں جو بہت بڑا درجہ رکھتی تھی۔“

”لیکن.....؟“

”ہاں جس طرح وہ روپ دھار سکتی ہے، جیسے اس گھر میں جہاں تم نے اسے دیکھا تھا، میرا مطلب ہے وہ جسے ابھی ابھی تم نے ایک الگ حیثیت سے دیکھا۔“

”میرے خدا، میرے خدا، تو کیا وہ؟“

”ہاں میں نے کہا تھا کہ وہ بے شمار روپ دھار سکتی ہے، لیکن بے بی پھر راز اس میں گہرے ہیں اور مستقبل کی گرد میں دھندلائے ہوئے ہیں اس لئے میں بھی ان کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”ایک بات بتائیے مسٹر روشاق، جیسا کہ میں نے آپ کو تفصیل بتائی کہ وہاں ایک شخص ہارون دانش کے سامنے میں ملا۔ کپڑے کی بیڈوں کا ایک ڈھیر کیا وہ بے جسم ہو چکا ہے، یعنی مسٹر ہارون دانش جو میرے نام نہاد باپ ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ بے جسم ہو چکے ہیں تو کیا دوبارہ بھی انہیں ان کا جسم واپس نہیں ملے گا۔“

”میں نے کہا تھا بہت سے راز ایسے ہیں جن سے میں بھی ناواقف ہوں۔“

”آپ ایک بات بتائیے مجھے مسٹر روشاق، آپ جسے میرا تعاون کہتے ہیں اس کے

لئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔“

”اگر غلطیوں دل سے یہ وعدہ کرو تو میں تمہارے لئے صرف ایک بات کہوں گا جو تمہارے لئے مشکل نہ ہوگی، میں تمہیں بتاؤں ہارون دانش تم سے زیادہ دوڑتے ہیں، جس طرح تم نے نزالہ کو دیکھا وہ ثبوت ہے اس بات کا کہ انہوں نے اپنے تابوت چھوڑ دیئے ہیں، لیکن اسی جہاز میں سفر کیا ہے انہوں نے، اگر کسی وقت ہارون دانش تم سے مخاطب ہو تو اس سے کہنا کہ اس نے کمزور ہمارے تلاش کئے ہیں، اس سے کہنا کہ اتنی مورخ، ایٹلا ستارہ نیچے اتر چکا ہے، اس سے کہنا کہ تو نے اپنے کناہ کا پھل پالیا، لیکن اب بھی باز نہیں آیا اس سے کہنا کہ مزید حقائق سن کر، جو بن چکا ہے اور جو ماضی میں چلا گیا ہے اسے نہیں بھلایا جاسکتا اس سے کہنا کہ راقوس سے بہتر رہبر اور کوئی نہ ہوگا۔ اس کا جھول چاہے کرے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا، کبھی تاریخ سے بھی کوئی جنت، وہی ہے۔ اس سے کہنا کہ راقوس سے ملے وہی اس کی رہنمائی کرے گا۔ تاریخ گزرے ہوئے دور کا نام ہے اور جو دور گزر جاتا ہے وہ گزر رہی جاتا ہے، اسے واپس نہیں لایا جاسکتا۔“

”راقوس کون ہے؟“ میں نے سوال کیا اور روشاق کوئی جواب دینے بغیر واپسی کے لئے مڑ گیا، میں اسے آواز دیں وہ تپتی ہوئی گئی مگر وہ نہیں رکا، کچھ دیر کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، رات خوب گہری ہو گئی تھی اس لئے مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا اور میں تیز تیز قدموں سے واپس چل پڑی۔ کھلے آسمان کے نیچے بے قرار کرنے کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہیں تھی جہاں چاہو پڑو، مجھے سب سے زیادہ دکھ صوفی کے بے ریشی کا تھا اور اس سے میں بہت دلبرداشتہ ہو گئی تھی۔ رات میں اسے تلاش نہیں کر سکی اور ایک جگہ کھردری زمین پر لیٹ گئی۔

دوسری صبح کوئی خاص نہیں تھی، ہاں گیارہ بجے کے قریب میں نے مسٹر صوفی کو دیکھا جو ایک ڈاکٹر کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھی۔ جب ہم مارشل کے اسپتال میں کام کر رہے تھے تو ڈاکٹر عارف سے

ہماری ملاقات ہوئی تھی، تقریباً پچیس سال کے پر و کار نوجوان تھے اور ہم سے نہایت نرمی اور محبت سے پیش آئے تھے۔ لیکن اس وقت ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے مسٹر صوفی خوش ہوں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کافی سکون محسوس کر رہی ہے۔ میرے قدم نہ رے کہ اور میں آگے بڑھ کر ان کے قریب پہنچ گئی، ایک لمحے میں میں نے محسوس کر لیا کہ سسر کے چہرے کے تاثرات خوشگوار نہیں ہیں، انہوں نے مجھے ہزاری سے دیکھا۔

”ہیلو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہیلو مس کیسی ہیں آپ، آپ تو مس صوفی کی دوست ہیں۔“ ڈاکٹر عارف نے کہا۔

”آپ دوست نہ کہیں، صرف شناسا۔“ صوفی نے بے ریشی سے کہا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”شناسائی تو دوستی کی پہلی سیرمی ہوتی ہے، اسپتال میں آپ دونوں کو یکجا دیکھا تھا۔“

”جی جی بالکل، آئیے بیٹھے۔“ ڈاکٹر عارف نے کہا۔

”شکریہ ڈاکٹر ادھر سے گزر رہی تھی رک گئی، مداخلت کے لئے معذرت۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گئی، صوفی بری طرح بگڑ گئی تھی، جو کچھ بھی تھا میں اسے برا نہیں کہہ سکتی تھی۔ کہاں تک میرے ساتھ لگی رہتی بے چاری حالات کا شکار ہو کر بھجھلا گئی تھی۔

بہر حال اچھا ہے اگر اس کی کچھ دل بستگی ہو جائے، وقت کچھ اور آگے بڑھ گیا، اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی مگر کب تک، گارساں اور اس کے ساتھی چند دوسرے افراد کے ساتھ زیادہ تر مارشل پر رہتے تھے، انہوں نے مخصوص علاقے کو ممنوعہ علاقہ بنادیا تھا، خوراک پر بدستور پابندی تھی، ہاں جنگل میں جو کچھ مل سکتا تھا کھایا جاسکتا تھا، چائے اور دوسری چیزیں پرزبردست کنٹرول تھا اب لوگوں میں کچھ بے چینی سی پیدا ہوئی تھی، پھر اس سلسلے میں ایک اجتماع

ہوا، میں بھی وہیں موجود تھی، مسافروں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص جس کا تعلق شاید برطانیہ سے تھا اس اجتماع کی صدارت کر رہا تھا اس نے کہا۔

”آپ لوگوں سے میں مسٹر گارساں کے رویے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں، بے شک مسٹر گارساں جہاز کے کپتان ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہماری زندگیوں کے محافظ بھی بنے، لیکن یہاں آنے کے بعد دو تشویش ناک صورتیں سامنے آئی ہیں، نمبر ایک یہ کہ ان کا رویہ ایک حکمران جیسا ہے، دوم یہ کہ وہ یہاں سے روانگی کی کوئی بات نہیں کرتے، یوں لگتا ہے جیسے وہ یہاں آکر مطمئن ہو گئے ہوں، لیکن کیا ہم لوگوں کو بقیہ زندگی یہیں گزارنی ہوگی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ چند لوگوں نے بے چینی سے کہا۔

”تو پھر اب کیا کریں، کیا ہوتا چاہئے؟“

”مسٹر گارساں سے سوال کیا جائے کہ اب یہاں سے آگے کا سفر کیسے شروع ہوگا وہ کب تک جزیرے کو چھوڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آگے کے لئے ان کا کیا منصوبہ ہے؟“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں، بے شک گارساں ہمارا محسن ہے، لیکن اب آگے کے بارے میں اس کا ارادہ بھی کچھ پتہ چلے۔ خیر میں آپ لوگوں کے تعاون سے مسٹر گارساں سے اس سوال کے لئے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

سب نے آمادگی کا اظہار کیا، ان سب کے تعاون کے ساتھ مسٹر جین گارساں سے ملے اور گارساں نے نہایت نرم روی سے ان کی باتیں سنیں، پھر کہا کہ کل ان باتوں کا جواب دیا جائے گا، اس نے جواب کے لئے کچھ بھی منتخب کر دی۔ ساحلی چٹانوں کے درمیان وسیع میدان میں اس نے جہاز کے ہر ایک ایک مسافر کو طلب کر لیا تھا اور پھر مقررہ وقت پر وہ ایک میگا فون ہاتھ لے کر خود بھی ایک چٹان پر جا کھڑا ہوا، وہ بہت

خوش نظر آ رہا تھا اس نے کہا۔

”معزز دوستوں کو میں خود بھی مخاطب کرنا چاہتا تھا، تاکہ اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں تفصیل بتا دوں۔ آج وہ وقت آ گیا ہے جب میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی، سنیں آپ لوگوں کا تعلق مختلف ممالک سے ہے۔ لیکن جو دوسرے ممالک سے اور خصوصاً اسپین سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے اسپین کے عظیم خاندان گارساں کے بارے میں سنا ہوگا۔ میرا دادا اسپین مارگٹ اسپین کا بادشاہ رہ چکا ہے، مگر میرے باپ جو ان اسپین کو بادشاہت نہیں کی اور وہاں سے اس خاندان کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ اسپین میں جب میرے باپ کو سزائے موت دی گئی تو میں جنوبی امریکہ میں زیر تعلیم تھا، باپ کے قاتلوں کے خلاف میرے دل میں نفرت بیدار ہو گئی اور میں خفیہ طور سے اسپین واپس آ گیا، میں نے اپنے باپ کے قاتلوں کے خاندان تباہ کر دیے اور پھر جرم میری زندگی بن گیا، اس کے بعد میں نے بخانے کیا کیا کچھ کیا، وہ ایک لمبی کہانی ہے، لیکن میرے اندر بادشاہت کے جراثیم ہیں، میرے دل میں بادشاہت کے خواب چمکیاں پلٹے رہتے تھے، میں فطرتاً ہی بادشاہ ہی ہوں اور میں نے بادشاہ بننے کی آرزو کو ہمیشہ دل میں زندہ رکھا اور بخانے کیوں مجھے یقین تھا کہ ایک دن میرا یہ خواب پورا ہوگا، میں نے لاتعداد بحری جہاز لوٹے اور خزانہ جمع کیا، لیکن میری آرزو پوری نہ ہوئی اور میں گرفتار ہو گیا۔ گارساں کا خواب ادھر رہ گیا، لیکن تقدیر اس کے بعد بھی مجھے میرے خوابوں کی تعبیر دینا چاہتی ہے، ایک دلچسپ حادثے نے میری آرزو پوری کر دی، مارشل سمندری طوفان کی نذر ہوا، بعد کے حالات کا تذکرہ فضول ہے کیونکہ آپ سب انہیں جانتے ہیں، ہم اس جزیرے تک آ گئے، یہ جزیرہ جہاں تک میں نے دیکھا ہے سرسبز و شاداب ہے، یہاں کی زمین زرخیز ہے اور صدیوں انسانی زندگی کی کفالت کر سکتی ہے، یہاں کے نوآباد ایک حسین زندگی

عزیز کر سکتے ہیں، اس دوران میں مکمل جائزہ لیتا رہا ہوں میرے دوستو، مارشل ایک مکمل جہاز ہے لیکن ہم عام سمندری راستوں سے اتنے دور ہٹ گئے ہیں کہ اب انہیں پانا ممکن نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو میں اس طرح جانا پسند نہ کرتا، پیارے دوستو! میں نے ایک منصوبہ بنایا ہے اور یہاں آنے کے بعد اس پر کام کرتا رہا ہوں، میری ضروری کارروائیاں مکمل ہو گئی ہیں اور اب آج جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ مستقبل میں میرا کیا ارادہ ہے تو اس وقت میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنے پروگرام کا اعلان کر دوں، دوستو! گارساں کا دادا اسپین کا بادشاہ تھا، نسلیں بادشاہت کا حراج نہیں بھولتیں، بے شک میں بحری قزاقوں رہا ایک دہشت گرد قاتل رہا لیکن میرے ذہن میں بھی ایک بادشاہ پروان چڑھ رہا تھا، ایک مطلق العنان حکمران مجھ میں جی رہا تھا۔ جسے کسی بھی اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا تھا۔ بظاہر یہ منصوبہ نامکمل ہی لگتا تھا، لیکن ہر نامکمل کی تکمیل کسی نہ کسی ہو ہی جاتی ہے، اب یہ جزیرہ میں نے اپنی مملکت قرار دیا ہے اور آپ لوگ میری قلمرو کے معزز باشندے قرار پائے ہیں، میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرتے ہوئے آپ لوگوں کے لئے یہ حکم صادر کرتا ہوں کہ ایک بادشاہ کو غلوں دل سے قبول کریں، میں اور میرے ساتھی آپ کے لئے منصوبہ بندی کریں گے، آپ کو ایک بہتر زندگی دی جائے گی، آپ نے دیکھا کہ مارشل میں آپ کے ساتھ میرا جو رویہ راہ و در حقیقت ایک بادشاہ ہی کا رویہ ہے، میں رحم اور انصاف کرنا جانتا ہوں، مجھے حکمرانی کرنا آتی ہے اور میری قلمرو میں رہنے والے معزز باشندوں کو بہت سے مشکل مسائل سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ لیکن شرط وفاداری ہے، آپ لوگ میری اس نئی مملکت کو خلوص دل سے اپنی زمین سمجھ کر لیں اور مجھے اپنا بادشاہ، باقی منصوبے اس کے بعد سامنے آئیں گے، آپ لوگوں نے میرا موقف سن لیا تو اب میں پہلا سوال آپ سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ

میرے اس منصوبے پر یا میری بادشاہت پر کسی کو اعتراض ہے۔“

ایک لمحے کے لئے تو خاموشی طاری رہی، پھر کسی سمت سے ایک بچائی آواز سنائی دی۔

”اس کا مطلب ہے مسٹر گارساں کہ تم مکمل طور پر پاگل ہو، اتنی اور دیوانہ ہو، ہم اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہیں، ہم نے تمہیں ایک کپتان کی حیثیت دی تھی کیونکہ تم جہاز چلانا جانتے ہو اور اس کے بعد ہم نے تم سے صرف اس لئے تعاون کیا کہ سمندری دستوں میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی تھی، لیکن تم نے جو بیوقوفی کا اعلان کیا ہے وہ تمہارے پاگل پن کی دلیل ہے، فضول باتوں سے گریز کرو اور اب جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کرو، اگر تم دیوانے ہو تو بے فکر رہو، ہم تمہاری دیوانگی کو درست کر دیں گے تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔“

تمام نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، بولنے والا کوئی پر جوش و جوان تھا، گارساں کے چہرے پر کسی قسم کا غصہ نمودار نہیں ہوا جبکہ لوگ سننے خیز لگے ہوں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے، تمام ہی دلوں میں تشویش کے آثار نمودار ہو گئے تھے، گارساں پر تو وہ بے حد بھروسہ کرنے لگے تھے اور اتنے دن کے قیام اور انتظامی امور کو انہوں نے ایک کپتان کی دانش مندی اور ضروری کارروائی ہی سمجھا تھا، لیکن گارساں کے ذہن میں واقعی کوئی دیوانگی ہی مل رہی ہے اس کا کسی کو احساس نہیں تھا، سبھی ابتدائی جھٹکے سے کتے کے عالم میں رہ گئے تھے، چند لمحات کے بعد گارساں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور بولا۔

”ہاں میں جانتا ہوں کہ جہاز کے مسافروں میں سے کوئی ایسا نہیں ہوگا جس نے زندگی میں کبھی کسی کی قلمرو میں آباد ہونے کے بارے میں سوچا ہوگا، آپ لوگوں کے گھر ہوں گے، عزیز و اقارب ہوں گے، زمینیں جائیدادیں ہوں گی، کاروبار ہوں گے، لیکن مارشل کا سمندری سفر آپ میں سے کسی نے میرے ایماء

پر میری کسی سازش کے تحت نہیں کیا تھا۔“

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ ایک اور گونے سے آواز آئی۔

”آپ سب سمندری طوفان کی نذر ہو گئے ہیں، آپ سب مر چکے ہیں، مارشل ٹاکارہ انجنوں والا لوہے اور لکڑی کا ایک گھر ہے جو سمندر پر کھیل رہا ہے۔ اس پر آہستہ آہستہ غذائی ذخیرے ختم ہو چکے ہیں، پانی موجود نہیں ہے، دھوپ اور نمی اسے زنگ آلود کر رہی ہے اور مسافر مرنے شروع ہو چکے ہیں۔ آپ ان کی لاشیں سمندر میں پھینک رہے ہیں اور پھر آپ بھی مر جاتے ہیں بتائیے آپ میں سے کوئی زندہ ہے؟“

”کیا تم یہ ہوش مندانہ باتیں کر رہے ہو؟“ یہ ساری جھپٹیں ہیں جو آپ کو تسلیم کر لینی چاہئے ہیں، یہ زندگی میں نے آپ کو دی ہے اور یہ سمندر کا قانون ہے، میں نے اس قانون کا تذکرہ پہلے ہی کر دیا تھا، سمندری جہاز جب تباہ شدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اسے بچانے والا اس کا مالک ہوتا ہے، میں آپ سب کا مالک ہوں، سمجھے آپ لوگ، میں آپ سب کا مالک ہوں، میں آپ کا آقا ہوں۔“

”یہ قانون انسانوں پر لاگو نہیں ہوتا۔“ کسی نے کہا۔

”لیکن اس کا ساز و سامان تو میرا ہے۔“ گارساں مسکرا کر بولا۔

”ہاں بے شک۔“

”اور یہ بحری قانون ہے۔“

”اس کا اعتراف کیا جا چکا ہے۔“

”تمہاری ہی ترمیم میں بھی تو کر سکتا ہوں، اس

قانون میں یہ اضافہ میں نے کر لیا ہے، میرے پاس آئندہ زندگی کا مکمل منصوبہ موجود ہے، ہمارے اعداد و شمار میں جہاز پر چھ سو چالیس مرد ہیں، جن میں پانچ سو اٹھارہ نوجوان ہیں، باقی بوڑھے چار سو تیس خواتین ہیں، جن لوگوں کی بیگمات ان کے ساتھ سفر کر رہی ہیں وہ ان کے سنڈیا فٹ شوہر ہیں، اس کے علاوہ کسی کا کوئی

رشتہ قبول نہیں، ہر بالغ لڑکی کسی سے منسوب کر دی جائے گی، اس طرح میری مملکت میں نسلوں کا اضافہ ہوگا، ہم اس جزیرے کو دنیا کی ہر برائی سے پاک ایک مثالی مملکت بنائیں گے، یہاں زندگی کی ہر آسائش میسر کی جائے گی آپ اور آپ کی نسلیں یہاں ایک حسین زندگی گزاریں گی۔“

”تم بالکل گدھے کے بچے ہوگا رساں۔“ ایک بوڑھے شخص نے شدید غصے سے کہا وہ اپنی چاروں جوان بیٹیوں کے ساتھ جہاز میں سفر کر رہا تھا۔

”آنے والے وقت میں، میں یہ ثابت کروں گا کہ میں کیا ہوں، مجھ سے تعاون کریں، دوستو! میرے پاس اس نئی مملکت کا مکمل منصوبہ موجود ہے۔ آپ لوگ یہاں اپنے گھروں میں رہیں گے، ہمارے پاس کھانا سمندر ہے جو چھپیلوں سے لبریز ہے، سمجھوروں کے شہر آباد ہیں اور یہ نہایت کارآمد شے ہے، بے شمار جنگلی پھل ہیں جن کی افزائش کی جا سکتی ہے، آپ خود سوچیں یہاں ہمیں کیسی حسین زندگی حاصل ہوگی ایک قلمی آئیڈیل جیسی زندگی۔“

”لعنت ہے تمہاری اس بکواس پر۔“

”پیارے دوستو! یہی تمہاری تقدیر ہے اسے قبول کرلو، اسی میں بہتری ہے یا پھر فرض کرو کہ تم لوگوں نے میری اس گزارش کو قبول نہ کر کے مجھے ہلاک کر دیا پھر کیا کرو گے؟“

”انتظار کریں گے ہم تقدیر کے فیصلے کا۔“

”تقدیر کا فیصلہ تو ہو چکا ہے، اب میں خصوصاً اپنے نوجوان دوستوں سے مخاطب ہوں، دوستو! کیا آپ کو یہ دلکش زندگی قبول نہیں ہے؟“

چاروں طرف سکوت طاری رہا تھا پھر مخالفت کرنے والوں نے کہا۔

”تمہاری اس بکواس کو کوئی بھی قبول نہیں کر سکتا۔“

”نہیں میرے بزرگو! نوجوانوں نے ابھی اس دلکش منصوبے پر غور نہیں کیا ہے، اچھا یوں کریں

جو میرے شدید مخالف ہیں وہ اس طرف آ کر جمع ہو جائیں اس طرف اس سیاہ چٹان کے سامنے میں جو مجھے سمجھانا چاہتا ہے وہ اس جگہ جہاں نمبر دو ہندسہ لکھا ہوا ہے، جو سوچنا چاہتے ہیں وہ اس تیسرے پوائنٹ پر اور جنہوں نے مجھ سے اتفاق کر لیا ہے وہ چوتھی جگہ، ہاں قلیل چاہتا ہوں میں اپنے ان الفاظ کی ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔“

کوئی تیس پینتیس آدمی شدید مخالفوں کے پوائنٹ پر جا کھڑے ہوئے، باقی سب اپنی جگہ کھڑے رہے تو گارساں نے پھر کھٹ لہجے میں کہا۔
”میں نے کہا تھا میں قلیل چاہتا ہوں۔“

اچانک ہی روشاق میرے پاس پہنچا اس نے میرا بازو پکڑا اور پوائنٹ نمبر چار پر ٹھیک کر لے گیا اور بھی بہت سے لوگ وہاں آ چکے تھے، جن میں عسکری، احمد جیدی سسر صوفی وغیرہ تھے۔ گارساں نے محبت بھری نگاہوں سے پوائنٹ نمبر چار پر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، پھر باقی لوگوں کو اس کے بعد ان لوگوں کی جانب متوجہ ہو گیا جو اس کے مخالفین کے طور پر کھڑے ہوئے تھے اور آپس میں چہ بگوئیاں کر رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور نرم لہجے میں بولا۔
”جو منصوبہ میں نے بنایا ہے دوستو، آپ لوگ یقین کریں کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے، اصل میں جو فاصلہ طے کر کے ہم یہاں پہنچے ہیں اول تو اس کی واپسی ہی ممکن نہیں ہے، بسکتے لیکن تو آپ میں سے ہر ایک شخص جانتا ہے کہ سمندر کی وسعتیں زمین سے تین گنا زیادہ ہیں، کتنے عرصے تک پہنچ سکتے ہیں ہم، کتنا خطرہ مول لے سکتے ہیں، آخر کار ایک دن بے کسی کی موت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے پاس راستوں کا تعین نہیں ہے۔ یہ وہ بات ہے جو ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں آپ کو اطمینان بنانے کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم سمندر میں ایک ایک کر کے بے کسی کی موت کا شکار ہو جائیں کیا میرا منصوبہ زیادہ موثر نہیں ہے، آپ لوگ مخالفت

برائے مخالفت کر رہے ہیں، ایسا نہ کریں میں آپ کے بے حد شکر گزار ہوں گا۔“

”گارساں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہارے بارے میں فرانسیسی افسر نے جو کچھ کہا تھا بالکل ٹھیک تھا، اس سفر میں تم نے بہتر اخلاق کا مظاہرہ کر کے ہمیں احمق بنایا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت بھی تمہارے ذہن میں دیوانگی پل رہی تھی۔ تم سمندری ڈاکو ہو، جان بوجھ کر تم نے ایسے ویران سمندروں کا رخ کیا جہاں زندگی نہ ہو، لیکن ہم تمہاری اس بے ایمانی کو قبول نہیں کرتے، کیا کر لو گے تم ہمارا، کتنے ہوش لوگ، اگر ہم سب تم پر یلغار کر دیں تو تم اور تمہارے ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے جائیں گے، ہمیں اس کے لئے مجبور نہ کرو، بس ایک بہتر جہاز ران کی حیثیت سے یہاں سے نکلنے کی منصوبہ بندی کرو۔“

”میرے بہت ہی پیارے بزرگو! میری دلی آرزو ہے کہ آپ ہمارے درمیان زندہ رہیں، آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اب ممکن نہیں رہا، اپنے ساتھیوں کو بھی سمجھا میں، میں یہاں زندگی چاہتا ہوں موت نہیں۔“

”اور اگر تم دو منٹ کے اندر اندر اپنے منصوبے کو ترک نہیں کرویتے تو پھر بات ہمارے ہاتھ سے بھی نکل جائے گی۔“

”دو منٹ ٹھیک ہے، معزز بزرگ کاش آپ اور آپ کے ساتھی مجھ سے تعاون کر لیتے مجھے دلی خوشی ہوتی، لیکن افسوس افسوس.....“ گارساں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کئے اور جزیرے کی خاموش فضا میں مشین گنوں کی آوازیں ابھریں اور اس کے ساتھ ہی بے شمار دلخراش چیخیں جو افراد پوائنٹ نمبر ایک پر کھڑے ہوئے تھے ان کے جسم مشین گنوں سے چھلنی ہو گئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ بے شمار چیخیں بلند ہوئیں اور لوگ دہشت سے کانپ اٹھے، بہت سے زمین پر گر پڑے، بہت سوں نے راہ فرار اختیار کی، لیکن مشین گنوں کی گرن

رچ رساں کی میگافون سے ابھرنے والی آواز حاوی ہوئی اس نے کہا۔

”نہیں جس نے راہ فرار اختیار کی وہ بھی گولیوں کا نشانہ بن جائے گا، ایک بھی فرد یہاں سے فرار نہ ہو، ایک بھی فرد یہاں سے آگے نہ بڑھے، مخالفین کو بغاوت کرنے والوں کو موت کی سزا سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے یہ سزا خود ہی اپنے لئے تجویز کی تھی، میرا قصور نہیں ہے۔“

دوڑنے والے رک گئے، چاروں طرف سے رونے پینے کی آوازیں ابھرنے لگیں، مخالفت کرنے والوں میں سے بہت سے عزیز و اقارب بھی شامل تھے، ایک شخص نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”حقیقت یہ ہے کہ میں بہت دلبرداشتہ تھا، بہت افسوس تھا مجھے کہ گارساں اپنی فطرت سے ہٹ گیا ہے سب نے میری مخالفت کی تھی سب نے اس کا ہاتھ دیا تھا، آہ اس وقت میں سب سے زیادہ خوش ہوں کہ ان لوگوں کو اپنے کئے کی سزا سنائی پڑی۔“ یہ الفاظ فرانسیسی افسر کے تھے، مرنے والے سرنگے ان کے جسم بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے، گارساں نے کہا۔

”میرے پیارے دوستو! میں چاہتا ہوں کہ اب وہ پوائنٹ نمبرون پر آ جائیں جنہیں اپنے ساتھیوں کی موت پر افسوس ہوا ہے اور وہ جوش و غضب میں ڈوب کر میرے خلاف عمل کرنا چاہتے ہیں، میں ان کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ آئیں اور مجھ سے اپنے ساتھیوں کا انتقام لیں۔ کیا خیال ہے آپ لوگوں کا مکمل میں جب میں نے مارشل کا نظام سنبھالا تھا تو سب سے پہلا عمل یہی کیا تھا کہ اسلحہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا، اسلحہ اگر مختلف ہاتھوں میں ہوتا تو مقابلہ کیا جاتا۔ پہلے تو میں نے اپنے ہر مقابل کو شکست دے دی، اس کے بعد میں نے دوسرے معاملات پر توجہ دی، میری جان فرانسیسی افسر اس وقت تمہیں سب سے زیادہ دیوانگی کا سامنا کرنا پڑا ہوگا تم اس بات کی توقع رکھتے

ہو گئے کہ میں کہیں غلطی کروں گا اور تم حالات کا پانسہ پلٹ دو گے، لیکن غلطیاں ایک دو ہی ہوا کرتی ہیں زندگی میں، میں کسی بھی ایسے شخص کو ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کروں گا جس سے میری ذاتی مخالفت ہو، لیکن اس نظام سے مخالفت کرنے والے کسی بھی شخص کو زندہ چھوڑنا میرے لئے کبھی ممکن نہیں ہوگا، ہر شخص کو میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ جب میری یہ جنت مکمل ہو جائے گی تو آپ لوگ دنیا کے محفوظ ترین انسان ہوں گے، کچھ عرصے کے بعد میں مارشل کے وجود کو مکمل طور پر فنا کروں گا اس کا لوہا اور لکڑی اور دیگر اشیاء ہمارے مستقبل کی تعمیر میں کام آئیں گی، میں ایک مکمل حکمران ہوں، اب آخری بات سنیں، کوئی سازش نہ کی جائے کوئی مخالفت نہ کی جائے، کوئی تنظیم نہ بنائی جائے، ورنہ آپ زندگی کھونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کریں گے، میں یہ کام مرحلے وار کروں گا، آپ لوگوں کو مطمئن کرنا میرا کام ہوگا ان لاشوں کو سمندر میں پھینک دیا جائے اور تمام نوجوان دوست یہ کام کریں اور سنیں، مناسب جگہ چٹانوں پر مشین گنیں دوڑیں گے ساتھ نصب ہیں، ہر شخص کو دور دور تک نشانہ بنایا جاسکتا ہے، بس اب آپ لوگ منتشر ہو سکتے ہیں۔“

لوگ بادل ناخواستہ منتشر ہو گئے۔ ہاں وہ لوگ جن کے عزیز و اقارب مارے گئے تھے اپنے عزیزوں کی لاشوں سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ روشاق نے آہستہ سے کہا۔

”آؤ بے بی۔ درندوں سے احتیاط رکھنا ضروری ہے۔“

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی میرے قدم لڑکھڑاہے تھے درندگی کا جو مظاہرہ میں دیکھ چکی تھی اس نے میرے اعصاب پر بہت برا اثر کیا تھا۔ ”اب کیا ہوگا سسر روشاق؟“ میرے منہ سے سسکی آواز نکلی۔

”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے

ہمارے لئے صرف ایک تماشے کی حیثیت رکھتا ہے تمہیں اس سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔“

”آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”اس سے قبل بھی بہت سی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں بے بی، بس تھوڑا سا وقت بہت تھوڑا سا۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

ہر طرف دلدوز مناظر بکھرے پڑے تھے۔ ہر شخص سہا ہوا تھا لوگ ٹولیاں بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر شخص ست اور سر زدہ تھا۔ رات کو معمول کے مطابق کھانا تقسیم ہوا پھر دوسرے دن گارساں کی تاجپوشی کا اہتمام ہوا ہر شخص کو حکم دیا کہ وہ نئے لباس پہنے انہیں ان کا سامان دے دیا گیا تھا چاروں طرف مصنوعی خوشیاں پھیل گئیں سب زندگی بچانے کا سامان کر رہے تھے۔

فرانسیسی افسر نے غلط نہیں کیا تھا گارساں کے چہرے سے خول اتر گیا تھا گارساں کے اس جریزے کو گارساں گنگ ڈم کا نام دیا گیا تھا اس شام مارشل کے تمام مسافروں کو وعدہ کھانا پیش کیا گیا تھا۔

اس رات جشن کا اہتمام کیا گیا اور ہر طرح کی بیہودگیوں کی اجازت دیدی گئی۔ نو جوان جوڑوں کو اپنی پسند سے ایک دوسرے سے منسلک ہونے کا اختیار دیدیا گیا تھا یہ مرحلہ نہایت تکلیف دہ تھا اور میرے لئے یہ اس وقت بے حد تکلیف وہ ہو گیا جب عسکری میرے پاس آیا۔

”سنو نشاء۔ میں تمہیں اپنانے کا خواہش مند ہوں۔“

”میں تمہاری آنکھوں میں انگلیاں چھو کر تمہیں اندھا کر دوں گی۔ میں نے شدید طیش کے عالم میں کہا۔

”پاگل پن مت کرو۔ تم اس کا اعلان سن چکی ہو۔ کوئی بھی تمہارے قرب کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ نشاء! غور کرو۔“

”میں تمہاری جگہ کسی خارش زدہ کتے کو قبول کر لوں گی۔ مجھے تمہارے وجود سے بے پناہ نفرت ہے عسکری۔“

”تمہیں بے بی بہم واقعی غلط بات کر رہی ہو۔“

چپچپے سے آواز سنائی دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ روشاق تھا۔ وہ پھر بولا۔ ”یہ شخص خارش زدہ کتے سے بہتر ہے۔ میرے خیال میں تم آدمی کا اظہار کر دو۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے خونی نظروں سے روشاق کو دیکھا پھر بولی۔

”میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ نہ ہی تم میرے لئے کوئی ایسی حیثیت رکھتے ہو کہ میں تمہاری بات مان لوں۔“

”لیکن یہ بے حد ضروری ہے بے بی، یہ شخص خود تمہارے پاس نہیں آیا بلکہ میں نے اسے بھیجا ہے۔“

”غالباً آپ اسے اس کی وفاداریوں کا صلہ دینا چاہتے ہوں گے۔ لیکن آپ ہوتے کون ہیں بتائیں گے۔“

”تم وعدہ خلافی کر رہی ہے۔“

”کیسی وعدہ خلافی۔“

”تم نے مجھ سے تعاون کا وعدہ کیا تھا۔“

”آپ اپنی..... میں نے کہا چاہا لیکن روشاق نے میری بات نہ پوری ہونے دی اور درمیان سے جملہ کاٹ کر بولا۔

”جمل سے کام لو۔ پوری بات سن لو۔ عسکری ٹھیک کہتا ہے کوئی بھی بے قابو نو جوان تمہیں حاصل کرنے کے لئے گارساں کی مدد لے سکتا ہے جبکہ عسکری کا ساتھ مصنوعی ہوگا۔“

”مصنوعی..... میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں۔ عسکری سے قربت بس تمہارے تحفظ کے لئے ہو گیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس طرح تم محفوظ ہو جاؤ گی۔“

میں نے عسکری کی طرف دیکھا تو وہ مضحک لہجے میں بولا۔ ”ہاں نشاء یہ عمل صرف تمہیں دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہوگا۔ میری ذات سے تمہیں کوئی الجھن کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

بات واقعی بڑی سنسنی خیز تھی اور سمجھ میں آ رہی

تھی۔ بدست اور بے لگام نو جوان چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ست لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے عسکری۔ لیکن خیال رکھنا میرے ساتھ آکر کوئی بدتمیزی ہوئی تو میں صرف خودکشی نہیں کروں گی بلکہ تمہیں بھی قتل کر دوں گی۔“

”میں تمہارے ساتھ کسی بدتمیزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا نشاء۔“ عسکری نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے اب تمہارے درمیان میرے رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔“ روشاق نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں خاموشی سے اسے جاتے دیکھتی رہی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عسکری بولا۔

”میں نے خود یہ جرأت نہیں کی تھی نشاء۔ بلکہ روشاق نے میرے پاس آکر کہا تھا کہ تمہارے لئے خطرہ ہے، میں تم سے تمہارے ساتھ رہنے کی فرمائش کروں، میں خود بھی تمہیں یہ تکلیف نہیں دیتا کیونکہ میں تم سے وعدہ کر چکا تھا۔“

”عسکری۔ میں نے مان لیا ہے۔“

”ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں۔ بولو۔“

”میرے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کرلو۔ ابھی یہ دہانے بھٹکتے پھر رہے ہیں کوئی بھی تمہارے لئے الجھن بن سکتا ہے۔“

میں خاموش رہی۔ پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔ ہر طرف کوئی نہ کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ نو جوان بے لگام ہو گئے تھے۔ ابھی کسی کپڑے والے وقت کا کوئی احساس نہیں عسکری سے میں نے اپنا رویہ تبدیل کر لیا تھا۔ یہ وقت کی ضرورت تھی اس لئے وہ زیادہ تر ڈاکٹر عارف کے ساتھ دیکھ جاتا تھا۔ وہ مجھے جب بھی دیکھتی اس کی آنکھوں میں نفرت ہوتی تھی میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

گارساں اپنی بادشاہی کے شوق پورے کر رہا تھا۔ نئے نئے احکامات صادر کرتا رہتا تھا۔ اس

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ واپسی جلدی نہیں ہوگی۔ بلکہ میرا دل تو چاہتا ہے کہ اب اس ماحول میں واپسی نہ ہو۔“

”بس دل چاہتا ہے کہ۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے تم پسند کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”تم؟“ میری آواز طرہ ہو گئی۔

”ہاں نشاء۔ میں..... اس نے آگے بھی کچھ کہا تھا لیکن میں نے قدم آگے بڑھا دیے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر میں اس وقت تک چلتی رہی جب تک بیروں نے ساتھ دیا۔ عسکری پامردی سے میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اچانک لہروں کے شور نے احساس دلایا کہ ہم ساحل تک آگئے ہیں کچھ اور آگے بڑھے تو سمندر نظر آ گیا۔ لیکن یہ جیسی ساحل تھا۔ یہاں انتہائی بلند و بالا بد صورت چٹانیں بیڑے تانے لکڑی تھیں جن کے درمیانی رخنوں سے پانی کی پھواریں فوارے کی شکل میں بلند ہو رہی تھیں اور اندرونی سمت جھیل بن گئی تھی اس کے کنارے بے شمار درخت بکھرے ہوئے تھے۔ ان سے پہلے نرم ریت سلی سلی۔

یہ بے حد دلکش جگہ تھی۔ میرے قدم ایک طرف بڑھ گئے۔ یہ جگہ کچھ اس طرح صحن کو بھائی کہ میں نرم ریت پر لیٹ گئی۔ عسکری مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ چٹانوں سے ٹکرانے والی موجوں کا شور اور پھر چٹانوں کی بلندی سے اڑتی ہوئی پانی کی پھواریں بڑی فرحت بخش لگ رہی تھیں۔

”یہ جیسی ساحل ہے۔“ اچانک عسکری کی آواز ابھری۔

”ہاں۔ اب تک یہاں کوئی نہیں آیا۔“

”اس طرف سے کہیں زیادہ یہ جگہ خوبصورت ہے۔ وہ لوگ جب اسے دیکھیں گے تو یہاں آباد ہونے کی کوشش کریں گے۔“

”ممکن ہے۔“

”کس قدر پر اسرار ماحول ہے۔“

”اس جزیرے کی وسعتیں کتنی ہوں گی عسکری۔“

”خدا جانے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں نشاء۔“

”وہی پرانی باتیں کرو گے تم، لیکن میں وہ دروازہ بند کر چکی ہوں۔“ کچھ اور کہنا چاہو تو کہو۔

”ہاں۔ کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا۔“

”میں روشاق کا غلام یا ملازم نہیں ہوں کہ اس کے ایما پر تمہاری رکھوالی کرتا رہوں۔ کون مجھے میری مرضی کے خلاف آمادہ کر سکتا ہے۔ میں نے صرف تحفظ کے خیال سے یہ عمل قبول کیا ہے۔ آخری بار۔ آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں نشاء۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں اپنا بنانا چاہتا ہوں محبت کی شدت کسی انسان کے قابو میں نہیں آتی۔ اگر تم متعل کے بارے میں کتنا ہو تو وہ صرف میرا فرض تھی جس کی تفصیل تم جانتی ہو۔ تم میری محبت ہو۔ فرض اور محبت میں فرق ہوتا ہے نشاء۔ میں اب بھی تمہاری محبت چاہتا ہوں۔“

”دھمکی دے رہے ہو مجھے۔“ میں نے زکرت لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں نشاء تمہاری جاہت میں در بدر ہوں۔ میری زندگی کس قدر بے مقصد ہو گئی ہے۔ بالکل بے معنی۔ زندگی کا پتہ ہے ناموت کا۔ مجھ میں نہیں آتا کیوں جی رہا ہوں۔ اس سے بہتر ہے خودکشی کر لوں۔“

میں ہنس پڑی، پھر میں نے کہا۔ ”تم خودکشی کر سکتے ہو۔“

”ہاں۔ جینا بے معنی ہو گیا ہے۔“

”تو خودکشی کر لو، طریقہ میں بتاؤں۔“ میں نے کہا اور وہ جنونی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

”بتاؤ۔“

”وہ سامنے والی چٹان دیکھ رہے ہو۔ اوپر پہنچا

مشکل نہیں ہوگا۔ وہاں سے ان پتھروں پر کود پڑو۔ مجھے پش پش ہو جائے گا۔ کھیل ختم۔“

”ہاں۔“

”ٹھیک..... خدا تمہیں خوش رکھے۔ لیکن۔“

خبر اس کے بعد۔ اوکے۔ نشاء تم اس قدر حسین اور پرکشش ہو کہ تم پر جان دی جاسکتی ہے۔ خوشی سے دی جاسکتی ہے اوکے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس چٹان کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے تھے کہ مجھے خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ جگہ ایسا نہ کر ڈالے۔ اس خدشے میں اس کی محبت کا کوئی احساس نہیں تھا، صرف یہ خوف تھا کہ میں تمہارے جاؤں گی۔ واپسی کا راستہ بھی بھول سکتی تھی اور دوسرے خدشے بھی تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک دلچسپ احساس بھی تھا۔ وہی عورت والا احساس۔ کہ وہ واقعی میرے لئے خوشی کرے گا۔ کیا واقعی کوئی کسی کے لئے مر سکتا ہے۔ وہ چٹان پر چڑھنے لگا۔ چڑھائی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ جوں جوں وہ اوپر جا رہا تھا میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اب کیا کروں اسے روکا تو سمجھ گا کہ میں اس کی محبت کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔

بڑی کشمکش میں پڑ گئی۔ وہ بلندی پر پہنچ گیا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اب وہ چٹان کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نیچے کودنے کے لئے تیار ہے۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ اس کا ارادہ سیکے کی سی کیفیت میں دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

دس سیکنڈ میں سیکنڈ پچاس سیکنڈ۔ میرا چڑھا ہوا سانس اعتدال پر آنے لگا۔ دفعتاً وہ میری طرف گھوما اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ وہ مجھے اوپر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اور میرے حلق سے بے اختیار قبضہ نکل گیا۔ ”زندگی بہت پیاری ہوتی ہے۔“

اوپر پہنچ کر اس کی ساری بہادری ہوا ہو گئی تھی۔ ”کیا مجھے بھی ساتھ لے کر مرنا چاہتے ہو۔“

میں نے تسخیرانہ انداز میں چیخ کر کہا۔ ”پتہ نہیں میری آواز اس تک پہنچی یا نہیں مگر وہ منہ سے کچھ بولے بغیر مسلسل مجھے اوپر آنے کے اشارے کر رہا تھا۔ اس کا انداز عجیب تھا۔ مجھے محسوس ہوا دیکھوں تو سیدھی دیکھنا چاہتا ہے۔ میں احتیاط سے چٹان پر پہنچ گئی۔“

”کیا بات ہے فرمائیے۔“

اس نے طنز یہ کہا۔ ”وہ وہ دیکھو نشاء وہ دیکھو وہ کیا ہے؟“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ واقعی حیران کن منظر تھا۔ وہ ایک اجنبی سمندری جہاز تھا جو عظیم الشان پہاڑی دیواروں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ اس جگہ سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ یہاں سے ہی اس کی بوسیدہ حال دیکھی جاسکتی تھی۔ بری طرح شکستہ ہو رہا تھا۔ ڈیک پر کابھی نظر آ رہی تھی ہر شے ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھی۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کسی خوفناک سمندری طوفان کا شکار ہو کر یہاں تک پہنچا تھا۔ سمندر کی سمت سے اس کی ڈائریکشن کچھ ایسی تھی کہ اسے کھلے سمندر سے نہیں دیکھا جاسکتا ایک طرح سے وہ پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔

”جہاں شہہ جہاز۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں بری طرح جہاز۔“

”کیا اس پر زندگی کا وجود ہوگا۔“

”مشکل ہے۔ پتہ نہیں کب سے یہاں پھنسا ہوا ہے۔“

”جزیرے پر اب تک کسی اجنبی کا وجود نہیں، اگر اس کا کوئی مسافر زندہ ہوتا تو کس نہ کسی شکل میں ضرور نظر آتا۔“

”ہاں یقیناً۔“ قریب سے دیکھو گی اسے۔؟

”ممکن ہوگا۔“ میں نے سوال کیا۔

”میرے خیال میں مشکل نہیں ہے۔“

”کیسے۔ کافی گہرے سمندر ہیں۔ میں سمندر میں نہیں تیر سکتی۔“

”ہم سمندری راستے سے وہاں نہیں
جائیں گے۔“
”تو.....“

آہستہ آہستہ جم رہی تھی۔ جو ہتیر پر رکھے گئے تھے۔ یقیناً اوپر جانے کا راستہ بنانے کے لئے رکھے گئے تھے۔ ان پر ابھی تک کاہی نہیں جی تھی اور ان پر قدم بنا کر جہاز پر پہنچا جاسکتا تھا۔

”نساء۔ جہاز پر چلیں۔“

”آپ کا اعزاز ٹھیک ہے۔“ ایک طرف سے
آواز آئی اور میرا دل اچھل کر قحط میں آ گیا۔ اٹھ افراد
ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیے زیادہ
خواب نہیں تھے۔ ان میں جو سب سے آگے تھا اس نے
دروازے میں کہا۔

کیا گیا تھا وہ انسانی عقل کا بے مثال مظاہرہ تھا۔ جہاز کے ٹیکنک کے اس خفیہ دروازے کو اس بلند بالا پہاڑ کے ایک غار میں کھولا گیا تھا یہ غار قدرتی تھا لیکن اسے زبردست قیام گاہ بنایا گیا تھا جہاز کے سامان کو اس وسیع ترین غار میں سجایا گیا تھا اور ہر شے یہاں منتقل کر دی گئی تھی۔ غار کے اندر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن سے روشنی اندر آتی تھی ایک طرف غار کا دوسرا دہانہ تھا جو سمندر کی طرف کھلتا تھا۔ اس کے اوپر جا کر ایک اور دہانہ کھلتا تھا جس کا رخ جزیرہ کی طرف کھلتا تھا اور یہاں سے جزیرے بہت دور تک نظر آتا تھا۔ اس جگہ کریاں بڑی ہوتی تھیں۔

”اس پر زیادہ لوگ نہیں تھے کیونکہ یہ کارگو شپ تھا۔“

”آپ کو کتنا عرصہ ہو گیا۔“

”ذریعہ سال کے قریب۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔

”اس وقت آپ کے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔“

”انیس افراد ہیں۔“

”جہاز کی کیا پوزیشن ہے۔“

”اب صرف لکڑی اور لوہے کا گھر ہے۔ اور کچھ نہیں ہے اس میں۔“

”آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔“

”آئرلینڈ سے۔ یہ بڑی نئی ٹیکنیشن کا شپ تھا۔ ہم لوگ ایک پرسکون سفر کرتے ہوئے مصر جا رہے تھے، لیکن۔ زنگریک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

”بہت طویل عرصے سے آپ یہاں زندگی گزار رہے ہیں۔“

”ہاں۔ مجبوری اور بے کسی کی زندگی۔ ہمارے پاس خوراک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ دوائیں ایک پائز ہو چکی ہیں۔ لباس نہ ہونے کے برابر ہیں بس سانس باقی ہیں جنہیں گزار رہے ہیں۔“

”لیکن یہ سب تو آپ نے بہت شاندار اور حیرت انگیز بنایا ہے۔“

”بس۔ زندگی ایسی ہی ظالم چیز ہے۔ انسان ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتا ہے۔ یہ سب زندگی کے لئے۔“

”ایک سوال کر سکتی ہوں مسٹر زنگر۔“

”جی۔ فرمائیے۔“ وہ بڑی تہذیب سے بولا۔

”میں نے کہا تھا کہ یہ کارگو شپ ہے لیکن اس کے باوجود جہاز پر میری بیٹی جو کچھ اور انسانی میلنا موجود ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ مصر جا رہی تھی وہاں اس کا شوہر ہے جو مصر میں ملازمت کرتا ہے۔“

”اور بھی خواتین ہیں یہاں۔“

”نہیں..... اور کوئی نہیں ہے۔“

”مارشل کو آپ نے کب دیکھا۔“

”وہ اس حصے سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میرے دل میں شدید خواہش تھی کہ کسی طرح مجھے آپ لوگوں کے بارے میں معلوم ہو سکے۔“

”آپ نے خود مارشل تک آنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“

”احتیاط بے بی، ہم بے بس ہیں کون جانے کون کیا ہو۔“

”یہ غار قدرتی ہے۔“

”سوفیصد، یہاں بہت کچھ ہے۔ اب تم لوگ مجھے مارشل کے بارے میں بتاؤ۔ زنگر نے کہا۔

”مارشل اپسین سے روانہ ہوا تھا۔ اسے الجوز، ماریطانیہ سے ہوتے ہوئے نہ جانے کہاں جانا تھا۔ سمندری طوفان نے اسے تباہ کر دیا۔“

”ہم نے زنگر کو سنا شروع کیا اور اسے گارساں کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اب وہ اس جزیرے کا بادشاہ ہے۔“ اومانی گاڑو کشتی عجیب کہانی ہے۔“

”وہ بے حد ظالم ہے۔ اس نے اپنے مخالفوں کو گولیوں سے بھون ڈالا ہے۔“

”زنگر سوچ میں ڈوب گیا۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”جہاز کے لوگ اس سے نفرت کرتے ہوں گے۔“

”ظاہر ہے۔“

”کچھ اس سے متفق بھی ہوں گے۔“

”سوفیصدی مجبوراً۔“

”ایک بات بتاؤ تم دونوں۔ کیا تم ایک ایسا گرو تیار کر سکتے ہو جو گارساں کے خلاف ایکشن کے لئے تیار ہو جائے۔“

”جہاز پر سفر کرنے والے عام لوگ ہیں جوڑائی بھڑائی سے واقف نہیں ہیں۔ اور پھر تمام ہتھیار گارساں کے قبضے میں ہیں ان کا ایکشن موت کے سوا کچھ نہیں

”ہے گا۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔“

”مارشل پر اندھن کتنا ہے۔“

”میرے خیال میں کافی ہے۔ مگر گارساں بہت جلد اسے تباہ کر دینے کا منصوبہ رکھتا ہے تاکہ اس کی رعایا کہیں جانے کا تصور بھی ختم کر دے۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں کسی بے یار و مددگار زندگی کے بارے میں کوئی ہم سے پوچھے۔

یہاں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ بہت جلد یہاں رہنے والا صرف موت کی آرزو کرے گا۔ صرف موت کی۔ بس تم سے اس مختصر وقت میں بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں تم

اس کی اجازت دو گی۔“

”جی مسٹر زنگر۔“

”تم دونوں۔ صرف تم دونوں یہاں سے نکلنے کی جدوجہد کرنا چاہتے ہو۔“

”زندگی کی قیمت پر بھی مسٹر زنگر۔“ عسکری نے کہا۔

”اگر تم کچھ دن عام لوگوں کے درمیان رہ کر گزار دو گی کوشہ تو نہیں ہوگا۔ خود گارساں کسی پر گہری نگاہ تو نہیں رکھتا۔“

”ہتھیار اس کے قبضے میں ہیں اس لئے وہ مطمئن ہے۔ اس کے علاوہ اسے آپ کے جہاز کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

”گڈ۔ تو بتاؤ۔ کیا میں تمہیں اپنا ساتھی بنا سکتا ہوں۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں۔ مسٹر زنگر۔“

”سنو۔ میں اپنے تباہ شدہ جہازوں کا کپتان تھا۔ تم زندگی کی یہاں سے نکل جانے کی آس کو بیٹھے

تھا۔ لیکن۔ دل میں جینے کی ایک کرن آج بھی روشن ہے کہ کاش ہمیں یہاں سے نکل جانے کا موقع مل جائے

آپ نے بتایا مسٹر عسکری کہ جہاز کے یعنی مارشل کے ہتھیار کپاس ٹوٹ چکے ہیں لیکن ہمارے اس تباہ شدہ

جہاز کے کپاس موجود ہیں۔“

”نکل گئی۔“ تو کیا۔“

”ہاں۔ زندگی کے لئے جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ کاش جہاز پر ہمارا قبضہ ہو جائے۔ اور ہم بے لے کر روانہ ہو سکیں۔ ہم کپاس اور بچا ہوا ایندھن مارشل کے سفر کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔

”یہ کیسے ممکن ہوگا مسٹر زنگر۔“

”جب زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے تو زندگی کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ ہمیں ہر خطرہ مول لینا پڑے گا۔“

”لیکن مسٹر زنگر۔“

”میرے ذہن میں کچھ ہے۔“

”کیا؟“

”تم نے مجھے پوری کہانی سنائی ہے۔ میں نے اس سے ہی سے ایک کردار منتخب کیا ہے جو ہمارے کام آ سکتا ہے۔“

”کون۔“

”وہ فرانسیسی افسر۔“ زنگر نے کہا اور ہم دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

صرف ہماری کہانی سن کر زنگر نے ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا تھا جو سب سے زیادہ گارساں سے نفرت کرتی تھی اور جو سب سے زیادہ کارآمد تھی۔ یعنی ایک چھوٹے

سے گروپ کے ساتھ اسلحہ چلانے کی ماہر۔

”عسکری نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”زبردست انتخاب۔“ مسٹر زنگر۔

”وہ مان بھی جائے گا کیونکہ ایک فرض شناس افسر ہے۔“

”سوفیصدی امکانات ہیں۔“

”مگر مجھے خوشی ہے کہ تم لوگ مجھ سے متفق ہو۔ اب تمہیں دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ فرانسیسی افسر کو یہاں

لے آؤ۔ میں اس سے ملاقات کر کے منصوبہ بندی کروں گا۔“

”اوپہام کی موت کتنی ناگہانی اور پراسرار تھی! میں اسے زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔“ کپتان غم زدہ لہجے میں بولا اور ضلّاء میں گھورتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں پھر یکایک سنبھل کر بیٹھ گیا اور جھرجھری لے کر بولا۔

”کیا آپ پہلام کی پراسرار موت کے متعلق تفصیل کے ساتھ کچھ سننا پسند کریں گے؟“

”کیوں نہیں؟ مجھے اسی لئے تو تمہارا انتظار تھا۔ تم جانتے ہو پہلام میرا اکلوتا بیٹا تھا، میں نے اس کے مستقبل کے متعلق کئی منصوبے بنائے تھے، مگر اس کی موت کے بعد میرے سارے خواب کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئے۔ اب صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اس کی موت کے صحیح اسباب معلوم ہو جائیں تاکہ یہ وہم نہ رہے کہ میرا لخت جگر کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔“

کپتان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”تو سنئے! سرجون ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔

کپتان گویا ہوا ”پہلام کی موت سے تین دن پہلے کا ذکر ہے کہ میں، پہلام اور ہمارے چند ساتھی جرمن سپاہیوں کا اندھا دھند تعاقب کرتے ہوئے اتحادی مورچوں سے بہت دور نکل گئے اور جب ہمیں اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو اس وقت شام ہو چکی تھی اور ہم ایک ایسے گھنے جنگل میں کھڑے تھے جہاں سرشام ہی اندھیرا پھیل چکا تھا اور درندوں کی پراسرار نقل و حرکت جاری تھی۔ فضا کچھ ایسی متعفن اور نم آلود تھی کہ سانس تک لینا محال تھا۔ ہم نے جنگل سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ راستے دشوار گزار ہونے کے علاوہ اتنے پر پیچ اور غیر مانوس تھے کہ ہمارے لئے ان پر چلنا بڑا دشوار تھا۔

رات ہوتے ہی درندوں کی نمودراجی میں اضافہ ہو گیا اور وہ مردم آزادی پر کمر بستہ ہو گئے۔ ہمیں مجبوراً کئی بار گولی چلانا پڑی۔ سب سے پہلی گولی کا نشانہ ایک بھیڑیانا جو جھاڑیوں کی آڑ میں نہ جانے کب سے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہمیں کئی بار خشک بھی ہوا کہ کوئی درندہ گھات لگائے ہمارے ساتھ ساتھ حرکت

کر رہا ہے، لیکن وہ ہر بار ہماری نظروں سے بچ نکلا۔ ایک بار میں اپنے ساتھیوں سے پھجڑ گیا۔ اس نے جھاڑیوں پر سے جست لگائی اور میری راہ میں حائل ہو کر غرائے لگا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اسے ابھی تک دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں نے اسے نازیوں کا جاسوس کہہ سمجھ کر گولی مار دی گولی لگتے ہی وہ سات آنکھوں سے اوپر اچھلا اور جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس اثناء میں میرے ساتھی مجھ سے آگے تھے، ہم نے مارچوں کی روشنی میں اسے دیکھا، تو لڑزہ کر رہ گئے۔ وہ سیاہ رنگ کا انتہائی خوشخواری بھرا تھا جس کی لمبائی چھ فٹ اور بلندی چار فٹ سے کسی طرح کم نہ تھی۔“

کپتان کا رن سانس لینے کے لئے رکا، تو سرجون نے عالم اشتقاق میں پوچھا۔

”بھیڑیئے کو دیکھ کر پہلام نے کیا کہا تھا؟“

”اس وقت خیال آرائی کی فرصت کے تھی؟ ہم تو جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لینا چاہتے تھے۔“

”اچھا، پھر کیا ہوا؟“

”اس واقعہ کے بعد ہم نے وہ راستہ چھوڑ دیا اور انہیں سست گھوم گئے۔ اب ہم نسبتاً چوڑے راستے پر چل رہے تھے۔ اس طرف جنگل کم گنجان اور بظاہر محفوظ نظر آتا تھا۔ ابھی ہم نے مشکل سے نصف میل کا سفر طے کیا ہوا کہ اچانک پہلام ٹھٹھا کا اور سانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ دیکھئے وہاں کوئی خطرہ ہے۔“

ہماری نگاہیں سانے کی طرف مرکّز ہو گئیں۔ ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر سرخ رنگ کے دو درخت نقطے دائیں بائیں حرکت کر رہے تھے۔ میں نے راتقل سیدی کی، لیکن فائر کرنے سے پہلے ہی وہ نقطے غائب ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ہی ہمارے بائیں جانب جھاڑیوں میں نامعلوم سی سرسراہٹ سنائی دی۔ ہم ادھر متوجہ ہوئے، تو پہلام تڑپ کر چیخے مڑا اور دوسرے اس کی راتقل کی آواز سے جنگل کو رخ اٹھا۔ ہم حیرت زدہ ہو کر بیٹھے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ

گئے کہ ہم سے چند قدم دور ایک خوفناک چپتا خاک دھن میں لوٹ رہا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کی طرح پکٹی ہوئی آنکھیں زندگی سے محروم ہوتی جا رہی تھیں۔“

سرجون نے عالم بخوت سے چوکتے ہوئے کہا۔

”مجھے پہلام سے یہی امید تھی۔“

”جی ہاں، آپ کا بیٹا واقعی ڈر، بہادر اور بے خوف نوجوان تھا۔“

”پھر کیا ہوا کپتان؟“

کپتان نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”رات گئے گئے ہمارے حوصلے جواب دے گئے اور ہم درختوں پر پناہ لینے کے بارے میں سوچنے لگے لیکن جیسے ہی ہم درختوں کی طرف بڑھے، اوپر بیٹھے ہوئے بندروں کی چیخ و پکار نے آسمان سر پر اٹھالیا اور ہم دہشت زدہ ہو کر جہاں تھے، وہیں رک گئے۔“

اچانک دو تین بندر درختوں پر سے گرے اور ٹوٹ پوٹ کر ختم ہو گئے۔ موت کی یہ ناگہانی صورت ہمارے لئے بالکل نئی اور غیر متوقع تھی۔ ہم نے گھبرا کر تارچیں روشن کر لیں۔ درختوں کے تنوں پر بندروں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان پر جگہ جگہ چھوٹے بڑے اڑدے مل کھارے تھے اور جو بھی کوئی بندر کسی اڑدے کی لپیٹ میں آ جاتا، بندر کی ہڈیاں جھج جاتی تھیں اور اڑدے کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ نیم جان ہو کر نیچے گر پڑتا۔ زندگی اور موت کا یہ عجیب کھیل اتنا روح فرسا اور خوف ناک تھا کہ ہم اس کی تاب نہ لاسکے اور ہم گڑ گئے کی طرف بڑھنے لگے۔

صبح کا ڈب کے وقت ہم جنگل کے وسط سے گزر رہے تھے کہ ہمیں ایک دو منزلہ مکان نظر آیا۔ ہم کچھ سوچے بغیر اس میں داخل ہو گئے۔ مکان بالکل خالی تھا۔ ہم سب جنگل منزل میں لیٹ گئے، کچھ دیر بعد پہلام اٹھا اور ایک خشکے میز کی طرف لیٹا اور دوسری منزل پر بیٹھ گیا۔ ہمیں اس کے چلنے پھرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تلاش کر رہا ہے، میں نے میز کی طرف

جا کر دیکھا، وہ بار بار دیا سلائی جلا رہا تھا، میں نے پوچھا۔ ”کیا ہے؟ پہلام؟“

”کچھ نہیں، صرف ایک پرانا صندوق ہے۔“

وہ یہ کہہ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور پھر خود بخود بولا۔ ”کپتان! صندوق میں ایک نہایت ہی

خوبصورت سانپ بند ہے، اگر دیکھنا چاہتے ہو، تو حاضر کروں۔“ سانپ کا نام سننے ہی میرا ماتھا ٹھکا اور میں نے ڈانٹ پلاتے ہوئے پہلام کو نیچے آنے کا حکم دیا، لیکن وہ بدستور ہنستا رہا اور میری پریشانی بڑھتی گئی۔

جب پہلام دروازے سے نمودار ہوا تو وہ بے حد سنجیدہ تھا اور اس کی کمرے کے گرد بھورے رنگ کا ایک چمکدار سانپ لیٹا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میری ہلکی بندھ گئی اور باقی تمام ساتھی میری آواز سن کر بیدار ہو گئے اور میز کی طرف آگئے پھر کسی نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”کپتان! ڈرا فور سے دیکھو۔“

میں نے فور سے دیکھا، وہ سانپ نہیں تھا، بلکہ چوڑے کی نہایت خوبصورت پٹیلی تھی۔ پہلام نے ہمیں یوں گھورتے دیکھ کر اپنے سر کو اپنے دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور درندے کی طرح غرا کر ہم پر کچھ ایسی نفرت انگیز اور پراسرار نظر ڈالی کہ ہم کانپ کر بیٹھے ہٹ گئے۔

”کیا اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی؟“ سرجون نے چونک کر پوچھا۔

”جی ہاں! غضب کی قہر آلود نظریں تھیں اس کی۔“ کپتان نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔

”ہوں.....! کپتان! کیا تم اس کی نقل اتار سکتے ہو۔؟“

”جی..... جی کیوں نہیں، دیکھئے۔“

کپتان لپک کر میز پر بیٹھ گیا اور اس نے اتنی خوفناک شکل بنا کر سرجون کو گھورا کہ سرجون کے سینے چھوٹ گئے، اس نے ڈرتے ڈرتے دیکھا، شدت جذبات سے کپتان کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کے لئے میز کے کنارے کو تھام رکھا تھا۔

کپتان نے میز سے اتر کر کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”بس یہی مجھے کچھ پشامی کی حالت اس دیوانے کتے کی سی تھی جو کسی چوملہ کرنے کے لئے تیار ہو، لیکن فطری کمزوری کے زیر اثر بل کھا کر رہ جائے۔“

”سمجھا..... دیوانے کتے کی مثال خوب رسی اچھا، پھر کیا ہوا؟“ سرجون نے پوچھا۔

اندرونی اندر بیٹھے لگے، میں نے پہلام پر آخری نظر ڈالی۔
اس کی جگہ آدرا نکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں، وہ جھج جھج
ورنگہ نظر آتا تھا۔ مجھ پر کچی طاری ہو گئی اور..... اور.....“
پھر کپتان کی آواز ڈھونڈی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے
منہ سے ہوتے ہی سر جون نے سوال کیا۔
”کپتان! اس پراسرار بیٹی کا کیا ہوا؟ کچھ اس
کے متعلق بھی تو بتاؤ۔“

سے اٹھاؤ اور وہاں چلتی کواکب ہی سرے سے اس طرح پکڑو کہ اس کا دوسرا سمتھارے بدن کے کسی حصے سے مس نہ ہو، ورنہ نتائج اتنے سنگین ہوں گے کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“



ہندو روح

ساجدہ راجہ - ہندواں سرگودھا

برفیلی پہاڑی پر سے اچانک بچے کا پاٹوں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا بڑی قیسی سے نشیب کی طرف اٹھ لگا مگر نیچے کھڑے نوجوان کی اس پر نظر پڑی تو وہ اڑتا ہوا بچے تک پہنچا اور بچے کو اس نے یوں پکڑا جیسے کہ وہ ایک کھلونا ہو۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ بعض روہیں بھی سالہا سال سرگرداں رہتی ہیں - ایک دلکش کہانی

گاڑی اونچے نیچے برفیلے راستوں پر آگے بڑھتی جا رہی تھی موسم کی پہلی برف باری ہو چکی تھی اور آئندہ بھی متوقع تھی لیکن فی الحال مطلع صاف تھا۔

سڑکوں سے برف صاف کر کے ٹریفک کو بحال کر دیا گیا تھا لیکن سڑکیں گیلی اور پھسلن اب بھی موجود تھیں اس لئے کاررومیاتی رفتار سے چلتی جا رہی تھی اس

کار میں میاں بیوی موجود تھے مائیکل اور روزی اور ان کے ساتھ ان کا پانچ سالہ بیٹا جسکی بھی تھا جو اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا لگتا تھا، اور بھی کبھی وہ ایسی ایسی باتیں کر جاتا تھا کہ مائیکل اور روزی دونوں حیران رہ جاتے تھے۔

اس وقت ان کی منزل آکس لینڈ نامی ایک قصبہ تھا جہاں روزی کے والدین رہائش پذیر تھے پہاڑی

کے گا۔

یہ سنتے ہی کپتان نے خوف زدہ نظروں سے مہ جون کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا جب سرجون نے بیٹی کو آتش دان کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا تھا۔

”فکرمات کرو میرے دوست! اب تو وہ بیٹی جل کر راکھ ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حکایت کا آخری حصہ صرف اس لئے وضع کیا گیا تھا کہ لوگ اس شیطانی چیز کو ضائع نہ کریں۔“

کپتان یہ سن کر آتش دان کے قریب جا کھڑا ہوا اور حیرانی سے بولا۔

”سرجون! ذرا ادھر آ کر دیکھیے..... بیٹی سے ابھی تک شعلے نکل رہے ہیں۔“

سرجون مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور کپتان کے قریب چلا گیا۔ آتش دان میں بیٹی کا بڑا حصہ جل چکا تھا۔ صرف اس کا ایک سر باقی تھا اور اس سے ہلکے نیلے رنگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ بیٹی سے اب تک آوازیں آرہی تھیں، لیکن اب ان آوازوں نے کسی عورت کی سسکیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عورت فوج کو حشر کر رہی ہے۔

”آخر میں نے اس منحوس بیٹی کا خاتمہ کر ہی دیا۔“ سرجون نے ہتھیار لگاتے ہوئے کہا۔ وہ بیچھے کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ بیٹی سے نکلنے ہوئے شعلوں میں سے ایک زبان سی نکلی اور سرجون کے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ خوف سے کپتان کا سارا جسم سن ہو گیا اور وہ چکر آ کر فرش پر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو سرجون کا بے چین جسم فرش پر پڑا تھا۔ اس نے آتش دان کے پاس جا کر دیکھا..... آگ سرد ہو چکی تھی۔ بیٹی جل چکی تھی اور اس کی راکھ دکھائی دے رہی تھی..... حکایت کا آخری حصہ بھی مکمل ہو چکا تھا۔



”چمٹا!“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، ہاں چمٹا، آتش گیر، سمجھے“ سرجون نے آتش زیر پاہوتے ہوئے کہا۔

جروس نے خوف زدہ نظروں سے کپتان کی طرف دیکھا چمٹا سامنے رکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چمٹا نے کس سرجون پرانی سی کرسی پر بیٹھا ایک ڈائری کی ورق گردانی کر رہا تھا پھر وہ نڈھال قدموں سے اٹھا اس نے بیٹی کو چمٹے سے پکڑا اور آتش دان میں ڈال دیا۔ شعلے یکدم بلند ہو گئے اور کمرہ عجیب و غریب آوازوں سے گونج اٹھا۔ پہلے کسی درندے کے غضب ناک ہو کر غرانے کی آواز آئی، پھر انسانی قہقہوں، اس کے بعد سسکیوں اور اذیت ناک شور پیدا ہوا، پھر آخر میں ایسی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں کہ کپتان نے ہڑ بڑا کر سرجون کی طرف دیکھا اور بولا۔

”خدا کیلئے صاف صاف بتائیے یہ کیا راز ہے؟“ سرجون نے ایک نظر سے رنگ بدلتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھا اور کرسی سے ٹپک لگاتے ہوئے بولا۔

”آج سے تیس سال قبل افریقہ کے دشوار گزار جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے میں نے ایک حکایت سنی تھی۔ اس وقت میں نے اسے ایک دیوانے کی بڑے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، لیکن آج معلوم ہوا کہ اس کا ایک لفظ صداقت پر مبنی تھا۔ میرے بوڑھے افریقی ملازم نے بتایا تھا کہ ”اس کی ہستی کے سردار کے پاس قدیم زمانے سے چوڑے کی ایک ایسی بیٹی ہے جسے چھوٹے ہی انسان خوفناک اور درندہ بن جاتا ہے۔“

بوڑھے کے بیان کے مطابق..... ”یہ بیٹی کئی نسلوں سے اس سردار کی ملکیت ہے اور اسے ایک بہت پرانے صندوق میں بند کر رکھا ہے۔“

”آخر اس سردار نے اس خطرناک بیٹی کو سنبھال کر کیوں رکھا ہوا تھا؟“ کپتان نے مضطرب ہو کر سوال کیا۔

”ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ جو شخص اس بیٹی کو ضائع کرنے کی کوشش کرے گا، وہ کبھی زندہ نہیں بچ

علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی ششہ علاقہ تھا اور سردیوں کے موسم میں ہونے والی برف باری سونے پہ سہاگہ.....

ایک طویل عرصہ پہلے قصبے کا نام آس لینڈ پڑ گیا تھا جو ایک سیاح نے رکھا جو اس جگہ سردیوں میں ہونے والی برف باری دیکھنے آیا تھا۔ وہ سردیوں سے کچھ پہلے اس علاقے میں آیا تھا، اس کا خیال تھا کہ ایک دو مہینے بعد برف باری رک گئی تو وہ واپس آ جائے گا لیکن مسلسل تین ماہ برف باری نے تمام راستے بلاک کر دیئے تھے جس کی وجہ سے اسے تین ماہ وہیں رکتا پڑا، اتنی بڑی مدت اس نے وہاں گزاری اس دوران جب بھی برف رکتی وہ علاقے کی گشت پہ نکل جاتا۔ وہ گرم علاقے کا رہنے والا تھا اس لئے اتنی بڑی برف کی وجہ سے اس نے اس قصبے کو آس لینڈ کہنا شروع کر دیا، اس کی دیکھا دیکھی تمام لوگوں نے بھی اس قصبے کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

حالانکہ پہلے اس قصبے کا نام کچھ اور تھا۔ روزی کے والدین شروع سے اس علاقے میں نہیں رہتے تھے بلکہ انہیں یہاں آئے چند سال ہی ہوئے تھے اس وقت روزی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ دوسری بار مائیکل کے ساتھ اس علاقے کا رخ کر رہی تھی پہلی بار جب جنکی دو سال کا تھا اور دوسری بار اب۔ مائیکل اس موسم میں ادھر آنے کا بالکل روادار نہ تھا ایک تو وہ اتنے ششہ علاقے میں رہنے کا عادی نہیں تھا دوسرا اس کا خیال تھا کہ جنکی بیمار نہ پڑ جائے اور انہیں راستے میں کوئی مشکل بھی پیش آ سکتی ہے لیکن روزی بھندھی کہ وہ اسی موسم میں ادھر جائے گی کیونکہ اسے برف باری دیکھنے کا بہت شوق تھا اور اپنے اسی شوق کی وجہ سے اس نے ادھر کا ارادہ کیا تھا۔

اس وقت سہ چہرے کوئی تین بجے ہوں گے جب آسمان پر بادل نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ سورج چھپ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ ٹھنڈی گھٹائیں آپس میں مل گئیں اور سہ چہرے میں ہی رات کا سماں پیدا ہو گیا

جلی کڑی، بادل گرے، سرد ہوائیں درختوں اور پہاڑوں سے ٹکرا کر عجیب بھانک سا شور پیدا کرنے لگیں تو مائیکل کے چہرے پر فکر و تردد کے سائے پھیل گئے جبکہ روزی بھی کم پریشان نہیں تھی۔ اگر بارش یا برف باری شروع ہو جاتی تو انہیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ انہیں بہت اچھی طرح تھا۔ شکر تھا کہ جنکی سورا تھا روزی جنکی کی کڑک اور بادلوں کی وحشت ناک گرج سے وہ کافی خوف زدہ ہو سکتا تھا۔

مائیکل کو وہ رہ کر روزی پر غصہ آ رہا تھا جس نے اس خطرناک موسم میں ادھر آنے کی ضد کی تھی۔ پہلے تو وہ چپ چاپ بیٹھا رہا لیکن جو بھی ہلکی ہلکی برف باری شروع ہوئی تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اور وہ روزی پر برس پڑا۔

”اب دیکھو! اپنی ضد کا نتیجہ؟ میں نے کتنی بار منع کیا تھا کہ اس موسم میں وہاں جانا بہت خطرناک ہو سکتا ہے لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔ اب برف باری بھی شروع ہو گئی ہے اور ابھی ایک گھنٹے کا سفر باقی ہے اگر گاڑی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا یا برف میں پھنس گئی تو ہمیں کتنی مشکل ہو سکتی ہے؟“

اس کی باتوں کے جواب میں روزی خاموش رہی لیکن اس کی کٹورا آنکھیں آنسوؤں سے لالاب بھر گئیں اور وہیں یہ آ کے مائیکل مات کھا جاتا تھا۔

”اوکے۔ اوکے۔ پلیز! اب رونا مت شروع کر دینا تم خود ہی دیکھو ہمارے موسم کی صورتحال؟ اگر برف باری اسی تیزی سے جاری رہی تو کیا ہم سفر جاری رکھ سکیں گے۔“ مائیکل نے باہر تیزی سے گرنے والی برف کی طرف اشارہ کیا جو پڑ پڑ ہواؤں کی وجہ سے اور بھی خطرناک لگ رہی تھی۔

”تو اس میں میرا کیا قصور؟ کیا میں نے برف کو کہا ہے کہ وہ ابھی گرے۔ یا موسم میرے تابع ہیں؟“ ساری باتوں کا الزام مجھے کیوں دے رہے ہو۔“ روزی الٹا اس پر برس پڑی اور جواباً مائیکل نے خاموشی اختیار کر لی کیونکہ وہ بات کو طویل نہیں

دینا چاہتا تھا۔ اس علاقے کی سب سے پرانی باسی ایک بوڑھی عورت کیٹ ہاٹن تھی جو اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی تھی پوری دنیا میں اس بیٹے کے علاوہ اس کا کوئی نہیں تھا۔ اس کی تمام امیدوں کا مرکز۔ بڑھاپے کا واحد سہارا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی اس کے شوہر کا کافی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور وہ خود بھی ستر کے لیے میں تھی لیکن اس عمر میں بھی وہ کافی چاق و چوبند اور قابل رشک صحت کی مالک تھی۔

اس کی زندگی کے ستر سالوں میں اس علاقے میں کافی دفعہ قدرتی آفات وغیرہ آئیں لیکن اس نے کبھی اس علاقے کو چھوڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ اس کے بیٹے کا نام رچرڈ تھا اور اس کی عمر تیس سال تھی وہ کافی خوبصورت ہونے کے علاوہ کافی بہادر اور دردمند دل رکھنے والا بھی تھا اور وہ اس کا ہر حکم ماننا خود پر فرض سمجھتا تھا۔

اس دن مطلع صاف تھا سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا سردیاں قریب تھیں اور سب لوگ اسی فکر میں تھے کہ برف باری شروع ہونے سے پہلے پہلے وہ لکڑیوں اور کھانے پینے کی اشیاء کا تازہ ذخیرہ کر لیں کہ انہیں سردیوں کے چند ماہ کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

رچرڈ بھی اسی سلسلے میں پہاڑوں پر آیا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ لکڑیاں کاٹ کے ذخیرہ کر سکے۔ وہ پہاڑ چوٹے بڑے درختوں سے بھرے بڑے تھے اس لئے انہیں لکڑیوں کے بارے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں تھی بس انہیں کاٹ کر کھانے میں منت لگتی تھی لیکن ایسے خطوں میں بسنے والے محنت کے عادی ہوتے ہیں، ایسے قصبے چونکہ شہروں سے کافی فاصلے پر ہوتے ہیں اس لئے حکومت ان پر اتنی زیادہ توجہ بھی نہیں دیتی۔ دوسرا پہاڑی علاقہ اور ٹھوس کے حساب سے بڑی برف.....

اس وجہ سے ان علاقوں میں گیس وغیرہ کی سہولت نہیں ملتی، لہذا کوآئے بھی چند سال ہوئے تھے اس لئے ان علاقوں کے کیمپوں کو اپنا بندوبست خود کرنا پڑا تھا سردی

سے بچنے کے لئے وہ لوگ لکڑی جلا کر گزارہ کرتے تھے۔ اس لئے برف باری کے موسم کے لئے ان کا سب سے اہم کام لکڑیوں کا حصول ہوتا تھا۔

رچرڈ کے ہاتھ میں کھڑی تھی چند چھوٹے چھوٹے درختوں کی شاخیں کاٹ کر اس نے ہنڈل بنا کر رکھا اور پھر بڑی لکڑیوں کے حصول کے لئے وہ پہاڑی کی ڈھلوان کے قریب آگے بڑے درخت پر چڑھ گیا چند شاخیں کاٹنے کے بعد اس نے ایک بڑی سی شاخ کا انتخاب کیا اور کھڑی کے پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے شاخ آہستہ آہستہ کتنی جارہی تھی۔

لیکن رچرڈ کی بد قسمتی کہ وہ جس شاخ کو کاٹ رہا تھا خود بھی اسی پر بیٹھا تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا جب اسے خبر ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی، شاخ مکمل طور پر ٹک چکی تھی اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود.....!

اس کی چیخیں پوری وادی میں پھیل گئیں اور وہ پہاڑی سے نیچے گرتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

موسم بہت زیادہ خطرناک ہو چکا تھا ان کی کارچوٹی کی رفتار سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ کیونکہ برف باری کی وجہ سے سڑک مکمل طور پر برف سے ڈھک چکی تھی اور مائیکل کو ڈرائیونگ میں شدید مشکل پیش آرہی تھی برف بہت تیزی سے گری رہی اور تیز ہوا کی وجہ سے کار کی ونڈا سکرین کے پار کافی دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ مائیکل کی کوشش تھی کہ جلد از جلد آگس لینڈ پہنچ جائے کیوں کہ اگر وہ رکتے یا برف یونی گرنی رہتی تو وہ یہاں پھنس سکتے تھے اور اس صورت میں انہیں رات اسی کار میں گزارنا پڑتی جو کسی صورت ممکن نہیں تھی، ابھی آدھے گھنٹے کا سفر باقی تھا جو انہیں نجانے کتنے گھنٹوں پر مشتمل لگ رہا تھا۔

”مائیکل میرا خیال ہے گاڑی لکڑی کر کے برف کے رکنے کا انتظار کرتے ہیں، ورنہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔“ روزی نے ششہ کے باہر دیکھتے ہوئے کہا

مشہور و معروف رائٹر اسلم راہی کی مفید کتابیں

40/-	ابراہیم لودھی
40/-	بہلول لودھی
40/-	ظہیر الدین بابر
40/-	ہمایوں
40/-	شیر شاہ سوری
40/-	جلال الدین اکبر
40/-	چاند بی بی
40/-	نور الدین جہانگیر
40/-	نور جہاں
40/-	شاہ جہاں
40/-	اورنگ زیب عالمگیر
40/-	بہادر شاہ ظفر
40/-	سلطان حیدر علی
40/-	ٹیپو سلطان
40/-	احمد شاہ ابدالی
40/-	حمورابی
40/-	سائرس اعظم
40/-	سکندر اعظم
40/-	بٹی بال
40/-	قلو پترہ
40/-	چنگیز خان
40/-	ہلاکو خان
40/-	ہیلن آف ٹرائے
40/-	نپولین بوناپارٹ
40/-	ہٹلر اعظم

شعبہ انجمنی اردو بازار کراچی

فون: 32773302

ذہنوں سے چل رہا تھا اور اس کے چہرے پر خراشیں بھی تھیں جن پر لگا ہوا خون جم کر اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ اسے یہ زخم لگنے کا کافی وقت گزر چکا ہے۔

اس کی ماں کیٹ کی آنکھوں میں تشویش پھیل گئی۔ وہ لپک کر چڑھ کے پاس آئی اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر فکر مند کچھ میں بولی۔

”کیا ہوا رچڑ میری جان..... کیوں اتنی دیر لگا دی؟“ کیٹ کیس سے انتظار کر رہی تھی۔ اور یہ تمہارے چہرے پر خراشیں کیسی.....؟“ لیکن رچڑ نے کسی بات کا جواب نہ دیا اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔

”تم جواب کیوں نہیں دے رہے۔ تم جانتے ہو جب تم گھر سے نکلتے ہو تو اس وقت سے میں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگنا شروع کر دیتی ہوں۔ میرا ایک ایک لمحہ بے چینی میں گزرتا ہے اور تم کچھ بول نہیں رہے۔“

”کچھ نہیں ہوا مام..... آپ فکر مند نہ ہوں۔“ جب وہ بولا تو اس کی آواز اتنی عجیب اور سپاٹ سی تھی کہ کیٹ کے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔

”کیسے فکر مند نہ ہوں میری جان۔ تم میں تو میری جان اگلی ہے۔ اگر تمہیں ذرا میری کچھ ہوا تو میں تو ایسے ہی مر جاؤں گی۔“ بوڑھی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اس لئے تو واپس آیا ہوں مام.....“ رچڑ نے یہ کہا اور کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے؟ جبکہ بوڑھی ماں حیرانگی سے رچڑ کی طرف دیکھنے لگی جو بہت عجیب سا ہوا تھا لیکن یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ کیٹ کچن کی طرف چل دی تاکہ رچڑ کے لئے دودھ گرم کر سکے اور ساتھ میں پانی بھی تاکہ اس کے زخم صاف کر سکے۔

ادھر مائیکل اور روزی نے فریش ہونے کے بعد کھانا کھایا اور پھر ٹی وی لاؤنج میں صوفوں پر بیٹھ گئے، روزی کے والدین جیسی کے ساتھ بہت خوش تھے اور جبکی بھی ان کے ساتھ بچوے نہیں سارہا تھا۔

روزی نے تفصیل سے اپنے گھر والوں کو اپنے

طرح خود پر قابو پایا اور جنگی سے باتیں کرنے لگی تاکہ وہ اس واقعہ کو ذہن پر سوار نہ کرے۔ لیکن وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا بات کو کھٹا پھرا کر وہیں لے آتا اس کے لئے یہ سب کسی ایڈوانچر فلم کے جیسا تھا جس سے وہ جی بھر کے انجوائے کر رہا تھا۔

آخر ان کے صبر کا امتحان ختم ہوا اور انہیں قہقہے کا موزنظر آ گیا تو ان کی جان میں آئی۔ روزی کو ایسا لگا جیسے وہ موت کے منہ سے واپس آئی ہو۔ قہقہے کو قریب دیکھ کر مائیکل کے تپے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے

اس نے باقاعدہ اونچی آواز میں شکر ادا کیا کہ وہ خبر خیر سے پہنچ گئے چونکہ وہ اپنے آنے کی اطلاع پہلے ہی روزی کے والدین کو دے چکے تھے اس لئے وہ بہت بے چینی سے ان کے منتظر تھے، انہوں نے برف باری کے دوران کئی بار موبائل پر ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس شدید موسم میں سیلولر سگنل بھی موصول نہیں ہو رہے تھے۔

وہ اور بھی پریشان ہو گئے اتنے شدید موسم کی مشکلات کا انہیں اچھی طرح اندازہ تھا لیکن جب انہیں باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔

☆.....☆.....☆

رچڑ نے آنکھیں کھولیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور بغیر کہیں دیکھ کر لکڑیوں کے اس بڈل کی طرف بڑھا جو اس نے کچھ وقت پہلے بنا کر رکھا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کے چہرے پر چند معمولی خراشیں ہی آئیں تھیں۔ وہ سیدھا لکڑیوں کے بڈل کے پاس پہنچا اور ایک ہی ہاتھ سے اٹھائے چل دیا حالانکہ وہ بڈل کافی وزنی تھا اور اگر اسے سر پہ بھی اٹھا یا جاتا تو کمر جھکا کر چلنا پڑا لیکن رچڑ اسے ایسے اٹھا کے چل رہا تھا جیسے وہ کوئی معمولی سے تنکوں کا بڈل ہو۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں کیٹ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی رچڑ کا چہرہ ہستا ہوا اور آنکھیں عجیب سے انداز میں کھلی ہوئی تھیں وہ بالکل سیدھا اور ست

اس کی بات سن کر مائیکل نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو روزی اس کی نظروں سے خائف سی ہو گئی اور گڑبڑا کر باہر دیکھنے لگی۔

مائیکل نے اس سے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کی۔ اس کا ارادہ جلد از جلد قہقہے میں پہنچنے کا تھا۔ کیونکہ کچھ ہی دیر بعد سڑک پر اتنی برف جمع ہو جاتی کہ گاڑی چلنا ناممکن نہ ہو، جنگی بھی اتنے میں بیدار ہو چکا تھا وہ بھی گاڑی سے باہر موسم دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

مائیکل اور روزی کا خیال تھا کہ جنگی ڈر جائے گا لیکن وہ اس وقت حیران رہ گئے جب وہ بہت پر جوش ہو کر باہر دیکھنے لگا، باہر روشنی تو نہیں تھی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا کہ کچھ نظر نہ آتا جنگی تیزی سے گرتی برف کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کیونکہ اس سے پہلے اس نے اس طرح کا منظر صرف کارٹون فلموں، وغیرہ میں دیکھا تھا اسے اس پریشانی کا اندازہ نہیں تھا جس میں اس کے والدین اس وقت مبتلا تھے۔

ابھی جنگی کو بیدار ہوئے کچھ وقت ہی ہوا تھا کہ ایک زوردار دھماکے کی آواز پیچھے سے سنائی دی ان کا دل دھک سے رہ گیا روزی اور جنگی نے یک بیک پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کی آنکھیں فرط خوف سے پھیل گئیں۔

جہاں سے وہ چند منٹ پہلے گزر کر آئے تھے اس جگہ ایک برفانی تودہ اپنی پوری ہیبت سے گزرتا تھا اگر انہیں وہاں سے گزرنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو یہ تودہ اس تودے کے نیچے دب جاتے یا پھر وہ تودہ ان کا راستہ ہلاک کر دیتا اور وہ بھٹک کر رہ جاتے۔

مائیکل نے صرف ایک نظر مڑ کر دیکھا اور دوبارہ توجہ سے ڈرائیونگ کرنے لگا کیونکہ ایک لمحہ کی چوک انہیں کسی بڑے نقصان سے دوچار کر سکتی تھی۔

روزی بہت خوف مدہ ہو گئی اسے رہ رہ کر چپچپتا ہوا ہوا تھا کہ وہ کیوں اس موسم میں ادھر آئی۔

مائیکل نے اسے حوصلہ دیا کہ خود پر قابو کر کے رن نہ جنگی بھی ڈر جائے گا۔ اس وجہ سے روزی نے کسی نہ کسی

ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا تو وہ بھی غرور مند ہو گئے۔

”ہم نے تو روزی کو خود منع بھی کیا تھا کہ اس موسم کا کوئی بھروسہ نہیں لیکن ہماری سستی کب ہے؟“

”خیر خداوند کالا کھلا کھ شکر کرتے لوگ خیریت سے پہنچ آئے ورنہ ہماری تو سانس سولی پر لگی ہوئی تھی۔“ روزی کی ماں نے مائیکل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو جواباً مائیکل نے اس کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔

”نانو پتہ ہے راستے میں کیا ہوا تھا؟“ جسکی جو پہلے توٹی وی کی طرف متوجہ تھا پھر اچانک اپنی نانو کی طرف متوجہ ہو گیا اور نانو سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلادیا تو جواباً بہت جوش سے بولا۔

”نانو جب ہماری کار سڑک سے گزر رہی تھی تو پیچھے سے اتنی زیادہ برف گری کہ مجھی بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئیں جبکہ میں تو ڈرا بھی نہیں۔“

”نانو مجھی تو مجھ سے بڑی ہیں پھر یہ کیوں ڈر گئیں؟“ جسکی نے اپنی معصوم زبان میں نانو سے پوچھا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور روزی جھینپ کر اپنے ڈیڑھ کی طرف دیکھنے لگی جو بہت اونچی آواز میں ہنس رہے تھے۔

”ڈیڈ آپ تو یوں نہ بنیں۔ آپ کو تو پتہ ہے میں بچپن سے ہی اس طرح کی چیزوں سے ڈرتی ہوں۔“ روزی نے لاڈ سے منہ پھلاتے ہوئے اپنے ڈیڈ سے کہی تو وہ مسکرا کر تصدیق انداز میں گردن ہلانے آگئے۔

☆.....☆.....☆

رجہ ڈاپنی ماں کے ساتھ شروع سے ہی اس قصبے میں رہتا تھا۔ اس قصبے میں بہت بار قدرتی آفات آئیں۔ تقریباً بڑھ صدی پہلے چھنے والے آتش فشاں نے آدھے قصبے کو لٹک لیا تھا اس علاقے میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور اوتکا واقعہ تھا۔ جو زندہ بچ گئے تھے انہوں نے پھر بھی اس قصبے کو چھوڑنا گوارہ نہ کیا۔ زندگی آہستہ آہستہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آتی گئی لوگ اس سانحہ کو بھولے تو نہیں تھے لیکن اس کی سفاکیت کسی حد تک معدوم ہو گئی

تھی پھر دوسری نسل آئی چونکہ انہوں نے وہ سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا صرف اپنے بڑوں کی زبان سے سنا تھا اس لئے وہ اس کی ہولناکیت سے واقف نہیں تھے ہاں اتنا ضرور تھا کہ انہوں نے اس کے نشان ضرور دیکھے تھے اس لئے وہ سوچ سکتے تھے کہ وہ واقعہ کتنا ہولناک ہوگا جب چنگھاڑتا ہوا لاداپہاڑوں سے بہتا ہوا قصبے کی طرف آتا ہوگا تو خوف و ہراس سے لوگ یقیناً پتھر کے ہو گئے ہوں گے انہیں بھاگنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا۔ وہ بہت خوش قسمت تصور ہوئے جو بچ گئے تھے۔

پھر تقریباً سو سال بعد ایسا ہولناک واقعہ ہوا جس نے سنسنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا، اس قصبے میں پھر ایک ایسی آفت آئی جس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اس دن لوگ معمول کے مطابق کاموں میں مصروف تھے ایک دن پہلے ہونے والی برف باری نے سردی کی شدت میں خاصہ اضافہ کر دیا تھا لیکن ان علاقوں میں رہنے والے لوگ ایسے موسم کے عادی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھے۔ آسمان پر چھائے کالے گھنگھور بادل اس بات کی نشان دہی کر رہے تھے کہ آج پھر برف باری ہوگی۔

اچانک لوگوں کو محسوس ہوا کہ سردی کی شدت میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا ہے ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائے تھے کہ سردی کی اتنی شدید لہر آئی کہ وہ وہیں جم جادے ہو گئے۔ چلتے پھرتے انسان اچانک برف کے ٹخموں میں تبدیل ہو گئے مکانات اور درختوں کے چوں تک بلکہ ہر چیز برف ہو گئی۔

کیٹ ہاشن کی عمر اس وقت تیس سال تھی اور اس کی کچھ عرصہ پہلے ہی شادی ہوئی تھی اس دن اس کا شوہر گھر سے کسی کام کے سلسلے میں نکلا کیٹ بہت زیادہ امید تھی کہ اس کا شوہر جلد واپس آ جائے گا اور اسے اپنے شوہر کے آنے سے پہلے تمام کام نپٹائے تھے کیونکہ اس کے آنے کے بعد وہ اسے اپنے پاس بٹھائے رکھتا تھا۔ دنیا جہاں کی باتیں کرتا تھا۔ نیچے تہہ خانے میں خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔

اس وقت بجلی نہیں پہنچی تھی ان علاقوں میں اس لئے لوگ روشنی کے لئے روایتی طریقوں پر عمل کرتے تھے۔ تہہ خانے میں چونکہ دن کے وقت بھی اندھیرا چھا رہا تھا اس لئے کیٹ نے لائٹن اٹھایا اور تہہ خانے کی طرف چل دی تاکہ خشک لکڑیوں کو حسب ضرورت اوپر لے آئے۔

ابھی اس نے تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گر گئی لائٹن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر لکڑیوں کے ڈھیر کے پاس جا گری مٹی کا تیل نیچے بہنے لگا اور لائٹن کا شیش ٹوٹنے کی وجہ سے آگ نے لکڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا چونکہ بہنے والے تیل کا رخ بھی لکڑیوں کی طرف تھا اس لئے آگ کو پھیلنے میں ڈرا دیر نہ لگی۔

کیٹ آنکھیں پھاڑے دھڑا دھڑا چلتی لکڑیوں کو دیکھنے لگی۔ اس کو اس بات کا بھی خیال نہ رہا کہ وہ اٹھ کر آگ کو بجھا دے۔ ان علاقوں میں رہنے والوں کے لئے زندگی کا دار و مدار انہیں لکڑیوں پر ہوتا ہے اس لئے وہ ان لکڑیوں کو جلتے دیکھ کر سکت ہوئی انہیں سکے بھاری تھی۔ لکڑیوں کے جلنے کی وجہ سے تہہ خانے میں بہت گرمی ہو گئی۔ ایسا لگنے لگا جیسے موسم گرما چکا ہو، جب گرمی برداشت سے باہر ہوئی تو وہ نیچے اور اس دل کے ساتھ اوپر آ گئی تاکہ مزید آگ کو پھیلنے سے بچایا جاسکے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پانی بھر بھر کر آگ کو بجھائے گی اس لئے وہ مال کی ٹوٹی کے پاس بالٹی نیچے رکھ کر ٹوٹی کھول دی لیکن یہ کیا.....

ٹوٹی میں سے کچھ بھی نہ نکلا وہ حیران رہ گئی کہ ابھی تو پانی کا اتنا ذخیرہ موجود تھا اور اب پانی کیوں نہیں آ رہا؟ اس علاقے میں چونکہ بجلی نہیں تھی اس لئے وہ لوگ قریبی چشمے سے پانی بھر کر ٹنکی قل کر لیتے تھے تاکہ مکھنوں آرام سے گزر سکیں۔

اس لئے ان کے پاس جو ٹنکیاں تھیں وہ کافی بڑے سائز کی تھیں تاکہ زیادہ سے زیادہ پانی ذخیرہ ہو سکے اور انہیں روز روز چشمے پر جانے کی مشقت نہ کرنی

پڑے۔ وہ چشمہ ایسا تھا کہ سارا سال جاری رہتا تھا چاہے جتنا بھی ٹھنڈا موسم ہو وہ نہیں جمتا تھا اس لئے لوگوں کو پانی کے حصول کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ جب ٹوٹی سے پانی نہ نکلا تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ چھت پر جا کر دیکھے ہے کہ پانی کیوں نہیں آ رہا..... وہ جلدی جلدی چھت پر پہنچی اور ٹنکی میں دیکھا تو اس کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔ سارا پانی برف بن چکا تھا اور تو اور ٹنکی کی بیرونی سطح بھی برف سے ڈھک چکی تھی۔

کیٹ کو کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوا اس نے جلدی سے گردن گھما کر آس پاس دیکھا اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں اور گردن تاحہ نگاہ برف ہی برف تھی ہر چیز برف سے ڈھک چکی تھی درخت گھر سمیت ہر چیز حتیٰ کہ انسان بھی! جیتے جاگتے برف کے ٹخموں میں تبدیل ہو گئے تھے؟

وہ وہیں ساکت کھڑی کھلی آنکھوں سے آس پاس دیکھتی رہی لیکن ابھی بھی زندگی کی چہل پہل دکھائی نہ دی۔ مسایلوں کا کتا جو ہر وقت بھونک بھونک کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا رہتا تھا وہ بھی خاموش تھا۔ پھر جیسے اسے ہوش آیا اسے اپنے شوہر کا خیال آیا تو وہ تیزی سے نیچے اتاری اور سڑک کی طرف چل پڑی تاکہ اپنے شوہر کا پتہ کر سکے۔ اس کے ساتھ وہ ہر گھر میں داخل ہو کر دیکھتی کہ شاید کہیں کوئی زندہ انسان موجود ہو لیکن ہر طرف سے اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مسایلوں کا کتا بھی اپنی جگہ ساکت برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ لوگ جہاں جیسے تھے وہیں ہی برف کے ٹخمے میں تبدیل ہو گئے ابھی تک زندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

صرف اس کے تہہ خانے میں جانے کی دیر ہی کہ باہر کا منظر ہی بدل گیا۔ ہنسا کر اتنا علاقہ..... زندگی سے بھرپور۔ ایک ہی پل میں موت کی آغوش میں جا چکا تھا۔ وہ صرف اس وجہ سے بچ گئی کیونکہ وہ آگ کے نزدیک تھی اس کا جسم حرارت سے پر تھا اس وجہ سے سردی کی شدید لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا

ورد شدہ بھی اس وقت برف کا ایک مجسمہ ہوتی۔

لیکن اپنی زندگی بچ جانے پر اسے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی بھلا وہ اکیلی خوش رہ بھی کیسے سکتی تھی اس نے اپنے شوہر کو مردہ حالت میں دیکھ لیا تھا پورا علاقہ قبرستان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایسے میں وہ اکیلی زندہ رہ کر کیا کرتی؟ لیکن وہ خود کو موت کے حوالے کیسے کر سکتی تھی اسے کسی نہ کسی طرح جینا ہی تھا۔ سو وہ جیتی رہی مردوں سے بھی بدتر اس سانحہ نے پورے قصبے کو ہلا کر رکھ دیا تھا، لیکن وہ ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی لیکن وہ احساسات پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے جب بھار چڑھاس کی گولش آیا۔

ہوا کچھ یوں کر دو میاں بیوی اپنے چھوٹے سے بیٹے کے ساتھ اس علاقے کی سیر کے لئے آئے۔ ایک حادثے میں وہ تو ہلاک ہو گئے لیکن وہ ننھا سا بچہ بچہ جزانہ طور پر بچ گیا جسے کیٹ نے اپنا بیٹا بنا لیا۔

رچرڈ کے آتے ہی وہ مصروف رہنے لگی اور اس کے ہرے زخم مندمل ہونے لگے۔ جب وہ اپنی مصہوم زبان میں اسے مام کہہ کر پکارا تو جیسے اس میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس نے بہت اچھے طریقے سے اس کا پرورش کی۔ ان سالوں میں وہ علاقہ کافی حد تک پھر آباد ہو چکا تھا اس لئے کیٹ نے بھی اس علاقے کو چھوڑنے کے بارے نہیں سوچا۔ اور اب تو رچرڈ جوان ہو چکا تھا اس کے بڑھاپے کا سہارا۔ اس کے غموں کا درماں۔ زندگی بہت خوشگوار گزرنے لگی کبھی کیٹ کو بیٹے دنوں کی یاد تازہ تو وہ رچرڈ سے کہہ کر اپنا غم غلط کرتی۔

وہ کچھ دنوں سے رچرڈ کا بدلا ہوا رویہ دیکھ رہی تھی لیکن اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا وجہ ہے؟ پہلے تو وہ بالکل نارمل تھا لیکن جب سے وہ پہاڑی سے لکڑیاں کاٹ کر لایا تھا اور زخمی حالت میں آیا تھا وہ بالکل چپ ہو گیا تھا ہر وقت نہ جانے خلاء میں کیا کرتا رہتا اور کیٹ کا دل ہولا تار رہتا۔ اس نے کئی بار اس سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ جواباً خاموش رہتا کبھی کبھی ضرورتاً بات کرتا ورنہ اپنی دنیا میں گمن۔

☆.....☆.....☆

مائیکل، روزی اور جیکی اس دن سیر کے لئے گھر سے نکلے، روزی کے والدین نے منع کرتی کہ وہ اتنی سردی برداشت نہیں کر سکتے اس لئے وہ ان کے ساتھ نہیں جاسکتے۔

موسم صاف تو ہرگز نہیں تھا لیکن اتنا تھا کہ وہ اس خدشے کے بغیر سڑ کر سکتے تھے کہ یقیناً برف باری نہیں ہوگی لیکن قدرت کے کاموں کا کسے پتہ ہوتا ہے وہ گھر سے کافی دور آ گئے جب بادل گھر گھر کرتے آئے۔ لگے انہوں نے توشیح سے دیکھا آسمان کو دیکھا اور پھر جلدی واپسی کا ارادہ کر لیا لیکن ابھی وہ گھر سے کافی دور تھے جب برف باری شروع ہو گئی تیز ہواؤں کے جھکڑوں کے ہمارے تھے۔

روزی کا خوف سے برا حال تھا جیکی کو مائیکل نے اٹھا رکھا تھا اور وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ سردی کی شدت میں خاصہ اضافہ ہو گیا تھا وہ چونکہ مکمل طور پر گرم لباس میں ملبوس تھے اس لئے سردی کا اتنا احساس تو نہیں تھا لیکن بہر حال موسم اتنا خطرناک ہو گیا تھا کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے کیونکہ راستہ مکمل طور پر برف سے ڈھک چکا تھا اونچے نیچے ہر فلے راستے بہت دشوار گزار تھے ذرا سا پاؤں پھسلا اور وہ کسی ان دیکھی کھائی میں گر جاتے۔ جہاں کسی کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

انہیں سب سے زیادہ جیکی کی پریشانی تھی کیونکہ وہ بچہ تھا اور اس ماحول سے خوف زدہ ہو سکتا تھا لیکن جیکی کے چہرے پر پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ تو دل چاہی سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول چکے ہیں یہ احساس اتنا جان لیوا تھا کہ انہیں خون اپنی رگوں میں دوڑتا ہوا خون اب جمنا ہوا محسوس ہوا راستہ بھولنے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور وہ ابھی مرنا نہیں چاہتے تھے۔

بہت کوشش کے بعد بھی وہ راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

دن آہستہ آہستہ ڈھلتا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ نہیں

کر رہے تھے اونچے پتھر کیے دشوار گزار راستوں پر جب وہ چلتے چلتے تھک گئے تو ایک گھنے درخت کے نیچے سنانے کے لئے بیٹھ گئے۔

یہاں کسی حد تک برف باری اور ہواؤں کی شدت میں کمی تھی کبھی تیز ہوا کا جھونکا اپنے ساتھ برف کو بھی اڑا کر لے آتا تو ایک لمحے کے لئے ان کے ہنسون میں کچھ کمی دور جانی وہ تینوں بہت خاموش تھے اب الگ رہا تھا جیسے ان کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا ہو۔

ہوا کی تیزی میں شدت آتی جا رہی تھی اگر وہ وہیں بیٹھ رہے تو پھر وہ شاید کبھی گھر نہ پہنچ پاتے اس لئے کچھ دیر سنانے کے بعد انہوں نے پھر اٹھنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ کسی ایسی طرح راستہ تلاش کر کے گھر پہنچ سکیں۔

سب سے زیادہ ان دونوں کو جیکی کی فکر تھی جواب بہت خاموش نظر آ رہا تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد مائیکل بہت تھک گیا اس نے جیکی کو نیچے اتارا اور احتیاط سے اس کی انگلی پکڑ کر اپنے لگا روزی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی اس کے ہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں لیکن وہ اپنے خوف کو اپنے اندر چھپائے ہوئے تھی وہ جس جگہ سے چلے جا رہے تھے وہ ایک اونچی چٹان تھی جو مکمل طور پر برف سے ڈھکی ہوئی تھی وجہ سے بہت خطرناک ہو چکی تھی اچانک ہوا کی شدت اور بھی بڑھ گئی وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رہے تھے لیکن ہوا کی شدت مزید بڑھتی جا رہی تھی اور وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے لیکن وہ یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں اور بھی مشکل ہو سکتی تھی اسی دوران روزی کا پاؤں لڑکھڑا گیا، اس سے پہلے کہ وہ مائیکل نے جلدی سے اسے تھام لیا لیکن اس کے نتیجے میں جیکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے بھٹ کر گیا اور وہ چیختا ہوا پہاڑی سے نیچے جانے لگا۔

مائیکل اور روزی کی آنکھیں فرط ہمت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ انہیں چیخنا بھی یاد نہ رہا۔ جیکی مسلسل چیختا ہوا نیچے جا رہا تھا اچانک کسی نریمان کے ہاتھوں نے اسے تھام لیا لیکن اس وقت تک

وہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔

ادھر گھر میں رچرڈ اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا وہ متنب کر کے اسے دو پہر کا کھانا کھلا رہی تھی وہ ہمیشہ یونہی کھانے میں نخرے کرتا تھا اور ماں حیران تھی کہ وہ تو کھانے پینے کا بہت شوقین تھا وقت سے پہلے ہی اسے بھوک لگ جاتی تھی لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا رچرڈ کا رویہ۔

تمام معمولات..... کام تو وہ پہلے کی طرح کرتا تھا اور ماں کی خدمت بھی، لیکن کچھ تھا جو معمول کے خلاف تھا جس کی ماں کو کچھ نہیں آ رہی تھی وہ خاموش رہنے لگی اور اس کے معمولات پر غور کرنے لگی۔

کھانا کھاتے کھاتے اچانک رچرڈ نے ہاتھ روک لیا ہر شدت کا طوفان آیا ہوا تھا برف باری مسلسل جاری تھی۔ کیٹ نے حیران ہو کر رچرڈ کی طرف دیکھا اور کھانا روکنے کی وجہ پوچھی لیکن رچرڈ نے اور کچھ نہ بتایا صرف اتنا کہا۔

”وہ مصیبت میں ہیں مجھے ابھی جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ماں حیرانگی سے اس کے پیچھے دیکھنے لگی اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کون مصیبت میں ہیں؟ وہ اس طوفانی موسم میں باہر بھی نہیں جاسکتی تھی اس لئے رچرڈ کی خبریت کی دعا کرنے لگی۔

رچرڈ جلدی سے چلتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اس شدت کے موسم کی کوئی پروا نہیں۔ اور یہ حقیقت تھی اتنا سخت اور سرد موسم اس پر کوئی اثر نہیں کر رہا تھا وہ یوں جا رہا تھا جیسے نارمل موسم میں چلا جاتا ہے۔

وہ ایک چٹان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک ناقابل یقین منظر سامنے آیا۔ اس چٹان سے ایک بچہ لڑھکتا بیٹھا نیچے آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سخت چٹریلی زمین سے ٹکرا کر موت کے منہ میں چلا جاتا اس نے آرام سے آگے بڑھ کر اسے یوں پکڑ لیا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا کھلونا ہو پھر وہ اسے لئے ہوئے واپس مڑ گیا۔

چلتے چلتے وہ روزی کے والدین کے گھر پہنچ



موت کی سختی

غلام نبی نوری - کھڈیاں خاص

اندھیری قبر میں نوجوان کی آنکھ کھلی کہ اتنے میں دو لحیم شحیم عجیب الخلقت شکل کے شخص ہاتھ میں گرز لئے نمودار ہوئے، چند سوالوں کے بعد انہوں نے نوجوان پر گرز اتنے زور سے مارا کہ وہ نوجوان زمیں میں دھنستا چلا گیا اور اچانک.....

انگشت بدندان اور جسم و جال پر خوف و لرزہ طاری کرتی سبق آموز اور حقیقی روداد

طبع کے لئے پوری فیملی کے ساتھ قلم دیکھ کر ہوتا۔ جب بھی گھر میں کوئی مہمان آتا تو میں بڑے فخر سے اپنی چھوٹی بیٹی کو آواز دیتا جو کہ چار سال کی تھی بیٹی! ذرا اٹھل اور آتنی کو ڈانس کر کے تو دل خلاؤ۔ دوسرے بچے بھی مختلف فلموں کے کرداروں کی نقلیں اتارنے میں بہت ماہر تھے۔ مختلف قسم کے ڈانسیاگ ان کو خوب حفظ تھے جھوم جھوم کر گانے سناتے۔ خوب جشن ہوتا۔ میں ان

میرا بچپن نادانوں میں گزر گیا جب سے ہوش سنبالا ہوں دولت میں سرگرد رہا مجھے غرض صرف دولت سے تھی اس سے کچھ غرض نہ تھا کہ دولت حلال طریقے سے آ رہی ہے یا حرام، ہر قسم کا نیافیشن ہمارے گھر میں آتا، حیانا نام کی کوئی چیز سرے سے ہی موجود نہ تھی کیٹی وی، وی آر، ڈی وی ڈی، ڈش غرض ایسی کوئی نعمت نہ تھی جو میرے گھر میں موجود نہ تھی، رات کو تفریح

”مجھے معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن آپ ضرور اس بارے میں بات کریں گی۔ میری کوشش تو بہت تھی کہ ابھی آپ کو کچھ پتہ نہ چلے کہ کم از کم اس وقت تک جب تک آپ اس دنیا میں ہیں کیونکہ آپ کو دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگے گا لیکن میری مجبوری ہے کہ جب بھی کسی کو میرے بارے میں شک ہوا مجھے ظاہر ہوتا پڑے گا اب آپ کو چونکہ مجھ پر شک ہو گیا ہے تو میں آپ کو تمام حقیقت بتاتا ہوں۔

”میں درحقیقت آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ آپ کا بیٹا رچرڈ تو اسی دن مر گیا تھا جس دن وہ پہاڑی پر لنگڑیاں کانٹے گیا تھا، اسے اندرونی طور پر اتنی جوش آئی تھی کہ وہ چند لمحے بھی زندہ نہ رہ سکا وہ رخت سے گرا بھی اتنی شدت سے تھا کہ اس کا پچتا محال تھا۔ میری روح اس وقت ادھر ہی منڈلا رہی تھی میں اسے بچا تو نہیں سکا تھا لیکن اتنا ضرور کر سکتا تھا کہ اس کے جسم میں داخل ہو جاؤں اور آپ اسے زندہ سمجھیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کے مرنے کا ن کر آپ بھی زندہ نہیں رہ سکیں گی اس لئے میں اس کے جسم میں سا گیا، میری مجبوری تھی کہ جیسے ہی کسی کو میرے بارے میں شک ہو مجھے اس دنیا سے جانا پڑتا اب چونکہ آپ کو شک ہو گیا ہے تو مجھے ہر حال میں جانا ہے۔

مجھے دکھ ہے کہ اب آپ کو تمام حقیقت بہت دکھ دے گی لیکن میں اب کچھ نہیں کر سکتا میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے میں جو بھی ہوں اس بارے میں سوچ کر خود کو پریشان مت کریں اور اس تلخ حقیقت کو جو طے سے برداشت کریں کہ آپ کا بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا۔ میں جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر رچرڈ کے جسم سے ہلکا سا دھواں نکلا اور آسمان کی طرف بڑھ گیا اور رچرڈ کا بے جان وجود ایک طرف لڑھک گیا، ماں کی آنکھیں غم کی شدت سے پٹی ہوئی تھیں اس نے زور سے چیخ ماری اور رچرڈ کے بے جان وجود کے قریب گرتی چلی گئی۔

گیا۔ انہوں نے جب جیکو کو بے ہوش رچرڈ کی ہانپوں میں دیکھا تو جلدی سے اسے لینے کے لئے آگے بڑھے، وہ پہلے سے بہت پریشان تھے موسم بہت خطرناک ہو گیا تھا لیکن روزی، مائیکل اور جیکو ابھی تک واپس نہیں لوٹے تھے اب جیکو تو آ گیا تھا وہ بھی بے ہوش لیکن روزی اور مائیکل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

انہوں نے رچرڈ سے بھی استفسار کیا لیکن وہ کچھ نہ بولا اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ انہوں نے جیکو کو بستر پر لٹایا اور اس کی دیکھ بھال میں لگ گئے لیکن اس خدشے نے انہیں بہت فکر مند کر دیا تھا کہ پتہ نہیں روزی اور مائیکل کہاں تھے اور جیکو کیوں بے ہوش ہے؟ آخر ان کی دعائیں رنگ لائیں اور کچھ دیر بعد روزی اور مائیکل رچرڈ کے ساتھ آتے دکھائی دیئے ان کی حالت خاصی مختوش تھی روزی اندر آتے ہی ماں کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور روتے روتے ”جیکو..... جیکو“ پکارنے لگی۔

اس کی ماں نے اسے حوصلہ دیا اور جیکو کے متعلق بتایا کہ وہ اندر آرام سے سو رہا ہے تو وہ مسرت سے اندر کی طرف بھاگی، مائیکل نے بھی سکون کا سانس لیا پھر وہ انہیں اپنے ساتھ بیٹنے والے حالات کے متعلق بتانے لگا اور پھر رچرڈ کی آمد کے متعلق بھی کہہ کیسے انہیں گھر لے آیا ان سب نے رچرڈ کا شکر یہ ادا کیا کہ اس نے اس مصیبت کے وقت ان کی مدد کی۔ جبکہ رچرڈ خاموشی سے ان کی باتیں سننے کے بعد واپس چلا گیا۔

رچرڈ کی ماں کیٹ بہت حیران تھی رچرڈ کے بارے میں لیکن اسے کچھ مجھ نہ آئی پھر اس دن کھانے سے اچانک اٹھ جانا کہ کوئی مصیبت میں ہے۔ اسے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہا تھا پھر جب بعد میں اسے پتہ چلا کہ اس دن کس طرح روزی لوگوں کی زندگیاں اس نے خطرے سے نکالیں تو وہ اور بھی فکر مند ہو گئی کہ آخر رچرڈ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ خطرے میں ہیں؟ اور وہ بھی اچانک جب اس نے رچرڈ سے استفسار کیا تو وہ پھٹکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

کی پرفارمنس کے لحاظ سے انہیں انعام بھی دیتا تھا۔

گھر کے دروازے پر خوبصورت اور بہت ہی قیمتی پتھر پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ ”ہدائن فضل ربی۔“

اکثر میرے ذہن میں آتا کہ شیطان میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا کہ دولت انھیں کرنے کے سارے گر سکھادیے اور ارہ مستقیم سے بھٹکا دیا۔ کوئی میرے کاروبار کے متعلق پوچھتا تو کہہ دیتا کہ ”اللہ کا بڑا فضل ہے۔“ صرف میں ہی نہیں میری طرح کے اکثر لوگ یہی کہتے ہیں۔

اگر دولت ہی اللہ کا فضل ہوتی ہے تو فرعون اور قارون پر خدا خوش تھا کیا؟ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا فضل اس پر ہے جس کو خدا دین کی سمجھ دے لیکن صراط مستقیم پر تو انسان اس وقت چلتا ہے جب وہ چاہے توور نہ۔ میرے کاروبار میں ہر طرح سے فراوانی تھی جھوٹی قسم کھا کر مال پہنچا بیچ بات کر کے کر جانا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا، انتظامیہ سے ٹھیک ٹھاک مراہم ہونے کی وجہ سے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شاید یہ کوئی ایسا شعبہ ہو جہاں میری چٹ کام نہ آتی ہو، میرا شمار شہر کے چند ایک شرفاء میں سے ہوتا تھا۔

اتنی دولت ہونے کے باوجود ساری عمر ج کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ لیکن اکثر لوگ مجھے حاجی صاحب کہہ کر بلاتے۔ میرے ہاں اکثر مجمع سا لگا رہتا۔ چٹلی، غیبت، بہتان بازی، پھوٹ ڈالنا اور توڑ جوڑ ہماری مجلس کے پسندیدہ مشاغل تھے، اوچی اوچی آواز میں ایک دوسرے کو غلیظ قسم کی گالیاں دینا تو بات تھی اس شور شرابے سے پورا محلہ تنگ تھا۔ مگر کسی کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ محلے کی مجلس میرا آنا جانا صرف عید کے دن ہوتا تھا۔

دنیاوی باتیں کرتے ہوئے میں تھکتا نہیں تھا۔ میری زبان چٹنی کی طرح چلتی تھی مگر بد قسمتی سے میری زبان ذکر الہی کے معاملے میں گوئی تھی۔ کبھی کسی نیک آدمی کے سامنے جاتا تو پتا نہیں کیوں میری طبیعت مچلنے

لگی۔ میں خوب مزے لے لے کر مصلے دار طریقے سے سوال کرتا اور اس کی دینداری کو نشانہ بناتا کہ وہ بے چارہ پسائی پر مجبور ہو جاتا اگر کوئی یار دوست نماز کے لئے کہتا تو میں جواب دیتا۔ ”یہ تو فارغ لوگوں کا کام ہے ویسے بھی ابھی ساری عمر بڑی ہے، جب گھنٹے کام کرنا چھوڑ جائیں گے تو پھر بیچ اور مسجد ہی تو رہ جائیں گے۔“ روزے کے ذکر میں کہتا ”روزے تو غریب رکھتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا، زکوٰۃ کے متعلق میری رائے کچھ اس طرح ہوتی۔“ یہ تو گیس کی ایک قسم ہے وہ ہم حکومت کو دے رہے ہیں۔“

کوئی میرے گھر کی طرف اشارہ کر کے پردے کا ذکر کرتا تو میں جواب دیتا۔ ”پردہ تو دل کا ہوتا ہے تمہاری اپنی نیت میں فتور ہے۔ شرم تو آنکھوں میں ہونی چاہئے۔“ بہار کے بارے میں تو میں سنتے ہوئے کہہ دیتا۔ ”وہاں کسی نے دیکھا ہے! اگر ایسا کوئی چکر بھڑکے تو چونکہ میں یہاں بھی بہت کچھ ملا ہے! آگے جا کر بھی ہمارے پاس بہت کچھ ہوگا ویسے بھی ہم نجی بخشائی امت ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑو! جس طرح ہن بڑے عیاشی کے ساتھ دن گزارو۔“

بہر حال وقت زرتنا چلا گیا لا پرواہی عروج پر تھی۔ ایک دن مجھے محسوس ہوا جیسے میرا وجود ساتھ چھوڑ رہا ہے یک لخت ایسی حالت ہو گئی کہ مجھے پانی مانگنے کے لئے پوری قوت صرف کرنا پڑی، میں اگلے ہی لمحے اسپتال میں تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک پوری فوج میرے گرد موجود تھی میرے کالوں میں آواز پڑی۔ ”دل کا شدید دورہ ہے بہت مشکل ہے دعا کیجیے۔“ یہ سنتے ہی مجھ پر کیا نئی یہ میں ہی جانتا ہوں یا میرا خدا اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ میں کتنی بے گناہ تھا، جب میں کہا کرتا تھا کہ موسیقی روح کی غذا ہے اور گانے بجنے سے روح کو سکون ملتا ہے۔ ”آج تو مجھے اس سکون کی سخت ضرورت تھی، آج میرا دل گانا سننے کو کیوں نہیں چاہ رہا تھا۔“

پھر مجھے اسپتال کے ایک کمرے میں لاکر لٹا دیا گیا، میں بستر مرگ پر پڑا حجت کو گھور رہا تھا

جہان کی بات ہے کہ اس وقت حجت پر ایک بہت بڑی سکرین تھی اور اس پر میری زندگی کی گھناؤنی فلم چل رہی تھی اس میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے گناہ بہت صاف نظر آ رہے تھے۔

کیسی عجیب فلم تھی وہ؟ میں گناہ کرتا تو دروازہ بند کر لیتا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے لیکن انفس کو یہ نہ سوچا تھا کہ ایک ذات میری ہر حرکت کو دیکھ رہی ہے، میری بختی کے مجھے تو فرش والوں سے تو شرم آتی رہی تھی مگر عرش والے سے مجھے ذرا بھی شرم نہ آتی۔

آہ! کتابت شرم تھا میں، اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ”یہ بد بخت انسان! اللہ کی ذات کس قدر صابر ہے کہ تیری مسلسل بد اعمالیوں اور سیاہ کاریوں پر اس نے کس قدر صبر کیا اور تو کیسا ظالم کہ اس کی طرف سے اتنی مہلت ہونے کے باوجود تو اپنی جان پر پیرے ظلم کرتا رہا۔“

میں اپنی اس بھیاں کفلم میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے گرد ”لا الہ الا اللہ“ کا دور دورہ رہا ہے، ایک عورت کی حیف سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”لکھا ہے آج بھی پتھر اگنی ہیں۔“ پھر کلے کے درویش تیری آگئی۔

حیرت ہے کہ احب میں گانے سنتا تو ساتھ ساتھ میری زبان بھی حرکت کرتی تھی ساتھ ہی ساتھ میں بھی گنگنا رہا تھا مگر آج میرے چاروں طرف ایک ہی جتنے کا دور دورہ رہا تھا مگر بڑی کوشش کے باوجود بھی ایک لفظ تک میری زبان سے جاری نہیں ہو پا رہا تھا۔

بیک لخت مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے جسم میں ہوتی ہوئی آری کے سامنے ڈال دیا گیا ہو، جیسے مجھے آگ ہوئی ویگ میں ڈال دیا گیا ہو، جیسے میرے جسم کو کوار سے ہزاروں ٹکڑے کر دیئے گئے ہوں جیسے زندہ لکڑی کی کھال اتاری جا رہی ہو۔ جیسے بیلنے میں گنے کے ساتھ مجھے بھی ڈال دیا گیا ہو۔ جیسے ریل کی پٹری پر بھرا ہوا کراپر سے ٹرین گزاردی جائے۔

جیسے زندہ چڑیا کو آج پر بھوتا جا رہا ہو، جیسے میرے جسم کے ہر حصے پر ڈرل مشین سے سوراخ کئے جا رہے

انتقام کا جذبہ.....!

انتقام میں اپنے ہی مزاج کا زہر یلا مادہ اپنے اوپر اثر کرتا ہے۔ اگر تم انتقام نہیں لے سکتے تو فی الحال تم اس تکلیف میں مبتلا رہو گے اور اگر بدلہ لے سکتے ہو تو آئندہ خود سخت ترین رنج اٹھاؤ گے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ انتقام کا جذبہ کیونکر پیدا ہوتا ہے؟ صرف ذاتی مفاد کی مخالفت پر یہ جذبہ ابھرتا ہے، خواہ یہ مفاد مال سے تعلق رکھتا ہو، آبرو سے یا پھر جان سے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو مالی نقصان پہنچائے یا اس کی توہین کرے یا اس کے جسمانی آزار کا باعث ہو تو فوراً انتقام کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔ جب انتقام کی آگ بھڑکتی ہے اور کوئی شخص بدلہ لینے کیلئے آمادہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اپنی تو قوت کا جائزہ لیتا اور دیکھتا ہے کہ اس کے اندر کون سی ایسی طاقت موجود ہے، جسے وہ اپنے حریف کے خلاف کا سامانی سے استعمال کر سکتا ہے۔ پس انسان وہ خاص طاقت استعمال کر کے اپنے حریف کو نقصان پہنچاتا ہے اور اپنے طور پر انتقام کے جذبہ کو تسکین دیتا ہے۔

(ایس امتیاز احمد - کراچی)

ہوں، جیسے ایک زبردست خارا در انہی کو میرے جسم میں داخل کر کے یک دم باہر کھینچا جائے۔

میں بہت چلا یا بہت وا دیا کیا۔ خدا کا واسطہ دیا کہ مجھے چھوڑ دو، ایک بار مہلت دے دو، میں بہت نیک ہو جاؤں گا، کبھی گناہ کے قریب بھی نہ پہنچوں گا، مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے، ہائے میں مر گیا ادھ! میرے اللہ! ہائے میری ماں دیکھ میں کس قدر اذیت میں ہوں، کاش میں مٹی ہوتا، کہاں گئے میرے کارندے! کہاں گئی میری سفارشیں کہاں گئی میری پرچی۔

اور پھر اچانک ملک الموت کی دہشت ناک

آواز میرے کانوں میں پڑی مجھے لگا جیسے اس آواز سے میرے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے آواز سنائی دی ”نکل اے غیث روح اپنے غیث جسم سے، آج تو قابلِ خدمت ہے، بھولنے پانی و پیپ، رقوم اور طرح طرح کے عذابوں کی تجھے خوشخبری ہو۔“

اوہ! خدایا! کیا ہر بدکاری ایسے ہی روح نکلتی ہے، میرا سارا بدن تار تار ہو گیا، پہلے میرے پاؤں ٹھنڈے، پھر پنڈلیاں اور آہستہ آہستہ میرا پورا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

”اور میں مر گیا۔“

میری روح سرگرداں رہی، میرے مرنے کے بعد جامع مسجد کے بڑے بڑے اہلکاروں سے میرے جنازے کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ مسجد جس کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں اب تک کی زندگی میں صرف چند مرتبہ ہی مسجد میں جا سکا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں آج لیے چوڑے القابات کے ساتھ میرے جنازے کا بار بار اعلان ہو رہا تھا۔ ہر بار مجھے حاجی صاحب کہہ کر پکارا جا رہا تھا۔ زندگی میں جب کسی جنازے کا اعلان سنا تو ہنسنے ہونے کہتا۔ ”کوئی آج ایک اور کا پتہ کٹ گیا۔“ لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایک روز میرا بھی پتا کٹے گا۔ یعنی میرے جنازے کا بھی اعلان ہوگا۔

میری روح بے چینی کے عالم میں یک ٹک دیکھے جا رہی تھی، میری آنکھیں بند کر دی گئیں، میرے جڑوں کو باندھ دیا گیا، میری بدقسمتی! کہ روتے روتے کچھ نہ ماتم شروع کر دیا، کچھ نہ ہال نوچنے شروع کر دیے، اسی دوران عصر کی اذان ہوئی گھر میں عورتوں کا ہجوم، باہر مردوں کا ہجوم لیکن شاید ہی کسی نے نماز پڑھی ہو، میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ”غافلوا! میں تو اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوں تم اپنی فکر کرو نماز کا وقت جا رہا ہے۔“ مگر اتنے شور شرابے میں میری کون سن رہا تھا۔

میری لاش کے گرد میرے گھر والوں اور رشتہ داروں کا ہجوم تھا۔ میرا ایک ہاتھ چھوٹی بیٹی نے اور دوسرا بڑی نے اپنے کانوں پر لگا رکھا تھا۔ پاؤں کو میرے بیٹوں

نے اپنے ہاتھ سے جکڑا ہوا تھا، میری ماں میرے چہرے پر بار بار ہاتھ پھیر رہی تھی۔ آخری بار میری ماں نے میرے ماتھے کو چومنا پھر ایک دم گہما گہما سی ہو گئی ہر طرف ایک کھرام سا بچ گیا۔ کوئی کفن خریدنے کا کہہ رہا ہے تو کوئی قبر کھودنے کا تو کوئی لائٹ کا بندوبست کرنے اور کوئی غسل دینے والے کو بلانے کے لئے جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے تختہ میت پر لٹا کر غسل دینا شروع کر دیا گیا۔ میرے اوپر پانی ڈالا جا رہا تھا کفن کے بعد مجھ بد نصیب پر الکحل والے اسپرے کا بھرپور چھڑکاؤ کیا گیا، ان غسل کے اندھوں کو کیا پتا کہ ابھی ابھی میرے ساتھ کیا ہوتی ہے اگر میں انہیں بتانے کے قابل ہوتا کہ فرشتوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو خدا کی قسم! وہ سب میری میت کو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ اور اپنی اپنی فکر میں لگ جاتے۔

اسی دوران میری تربیت یافتہ اولاد میں سے ایک بھاگ کر فوٹو گرافر لے آیا، فوٹو گرافر اپنے پیسے بنانے کے لئے دھڑا دھڑ میری تصویریں بنانے لگا پھر ویڈیو ہولے ہولے آئے ویڈیو والوں کو دیکھ کر میری سمجھ میں بات آ گئی۔

لوگ اپنی فلم بنوانے کے لئے انداز بدل بدل کر میری چار پائی کے گرد گھوم رہے تھے۔ پروگرام کے مطابق میرے جنازے کا وقت ہو گیا۔ آوازیں آئی شروع ہو گئیں کہ ”دیر ہو رہی ہے جی۔“ اس وقت مجھے شعر یاد آیا۔

ذرا سنبھل کر کسی کو حساب دینا ہے زندگی کے لمحے کہاں کہاں گزرے جنازہ اٹھنے کی دیر تھی کہ عورتوں کی چیخیں نکل گئیں جس سے سارا محلہ دہل گیا، میرے بچے چار پائی سے لپٹ گئے، بڑی مشکل سے میرے بے جان وجود کو نکالا گیا۔ چار آدمیوں نے چار پائی کو کندھوں پر اٹھایا، سڑک پر پہنچے تو سارے دکاندار کھڑے ہو کر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔ لوگوں کی قدموں کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ میرے جنازہ میں زیادہ لوگوں کا ہجوم ہے

افسوس کہ کسی تبلیغی پرہیزگار عبادت گزار غریب کا جنازہ ہوتا تو سو آدمی اکٹھے نہ ہوتے۔

قصہ مختصر جنازہ گاہ میں عجب منظر تھا، ہمارے وہاں جانے سے پہلے کچھ لوگ موجود تھے جو کاروباری اور سیاسی کہیں ہانک رہے تھے۔ خیر مصفیٰ درست کی گئیں، اتنے میں میرے بڑے بیٹے نے نہایت مری ہوئی آواز میں کہا کہ! بھائیو! اگر میرے باپ پر اگر کسی کا قرض ہو تو جنازہ کے بعد رابطہ کر سکتا ہے۔

امام صاحب نے جنازہ شروع کیا افسوس کہ اتنے بڑے بچے میں شاید ہی چند لوگ ہوں گے جنہیں مکمل نماز جنازہ آتی ہو۔ ورنہ سب ہی اس معاملے میں میرے برائی نظر آتے تھے۔ اور مارے شرم کے دائیں بائیں نظریں کھما رہے تھے، کچھ سامنے گھور رہے تھے، بکسیر کے بعد سلام پھیرا کیا تو ان بھائیوں کی جان میں جان آئی، قدرت کا انصاف دیکھو کہ میں بھی اکثر مرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتا تھا، آج میرے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہو رہا تھا۔

پھر مجھے قبر میں منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا، بعض محلے خیر خواہ میرے اوپر دوسری قبروں کی مٹی کھرچ کھرچ کر ڈال رہے تھے اس طرح مجھے منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے میں جوتیوں کی آوازیں سن رہا تھا، میں سمجھا کہ جتنی سزا مجھے ملنی تھی وہ مل چکی ہے اب یہاں آرام سے پڑا رہوں گا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اب میرا واسطہ ایک مستقل مناسبت سے پڑنے والا ہے۔ ایسا دردناک عذاب کہ دشمن انسان کی ہوا بھی نہ لگے۔ میری قبر کے باہر گلاب کی دھندلتی خوشبو اور گیلی مٹی کی ایک مہک تھی۔ لیکن اندھ میرا لٹی گھبرانے لگا۔ اتنا سخت اندھیرا اور میں تنہا تھا۔

قبر نے عجب طریقے سے میرے ساتھ شکوہ کیا۔ ”اے غافل انسان! تو دنیا میں مکن تھا مگر کوئی انسان نہیں گزرا کہ جس دن میں نے تجھے آواز نہ دی ہو کہ میں وحشت کا گھر ہوں۔ میں دہشت کا گھر ہوں، میں تنہائی کا گھر ہوں، میں خاک کا

گھر ہوں۔ میں کڑوں کا گھر ہوں، جتنے لوگ میری پشت پر چلتے تھے میرے نزدیک ان میں سے سب سے زیادہ تو قابلِ نفرت تھا، اب میں تجھ پر حاوی کر دی گئی ہوں، تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کیا برا سلوک کرتی ہوں۔“

”آٹا ٹافا سیاہ رنگ کے دو فرشتے قبر کی دیواروں کو چیرتے ہوئے اندر آ گئے۔ (نہ پوچھو اس وقت میری کیا حالت تھی، میں تھر تھر کانپ رہا تھا) وہ آتے ہی انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنی بولی میں بولے جسے میں نہ سمجھ سکا، انہوں نے غضب ناک طریقے سے مجھے گھورا پھر بولے۔ ”تیرا رب کون ہے؟“

مجھے نہیں معلوم میں نہیں جانتا“ میں نے جواب دیا اس کے بعد انہوں نے مزید سختی سے سوال کیا۔ ”تمہارا دین کیا ہے؟“ دوبارہ میں نے انکار کیا تو وہ انتہائی سخت گردار اور بھٹی آواز میں بولے۔ ”تو اس برحق آدمی کے بارے میں کیا کہا کرتا تھا۔“ قسمت کھوئی اس بار بھی میں نے انکار کیا، زندگی میں قلمی ستاروں کے بارے میں تو بڑے وثوق سے جانتا تھا لیکن ہمیشہ کلمی والے کے ذکر سے دور رہتا تھا۔ آج اس بے اعتنائی کا نتیجہ میرے سامنے تھا۔

میرا یہ جواب سننا تھا کہ کرحمت آواز سنائی دی۔ ”اس کے لئے آگ کا پھجھوٹا بجھاؤ، اس کو آگ کا لباس پہناؤ۔“ یہ آواز آنے کی دیر بھی کہ اسی وقت میری قبر میں ناقابلِ برداشت گرمی آئی شروع ہو گئی پھر میری قبر تک ہو گئی اتنی تک کہ میری پسلیاں ایک دوسرے میں گھس گئیں۔

ایک فرشتہ میری قبر میں مسلط کر دیا گیا جس کے ہاتھ میں لوہے کا گرز تھا۔ اس نے اس گرز سے مجھے مارنا شروع کر دیا۔

بھائیو! اور بھئیو! مجھے اس وقت کس قدر تکلیف ہو رہی تھی اگر آپ لوگوں کو پتا چل جائے تو آپ لوگ اپنے مردے دفنانا چھوڑ دیں۔

بھائیو! اور بھئیو، جو کچھ مجھ پر گزر رہی تھی وہ بیان



قبر

احسان سحر - میا ثوالی

رات کے دو بجے قبرستان میں ہولناک تاریکی چھاٹی ہوئی تھی کہ اچانک ایک دل دھلا دینے والی خوفناک جسم و جاں پر لرزہ طاری کرتی چیخ سنائی دی اور پھر ساتھ ہی ایک الو کریہہ آواز نکالتے ہوئے سامنے آیا۔۔۔۔۔

دل و دماغ پر دہشت اور وحشت طاری کرتی اپنی نوعیت کی ایک خوفناک اور ڈراؤنی کہانی

حسام اور یوسف بچپن ہی سے گہرے دوست تھے اور ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ان کا حلق ایک متوسط گھرانے سے تھا جبکہ یوسف نے سب انیسویں صدی کا کورس کر کے پڑھائی کو خیر آباد کہہ دیا تھا۔ اسات کے دو بچے وہ سینما سے فلم دیکھ کر واپس آ رہے تھے۔ رکشہ والا انہیں کلمہ چوک پر اتار کر واپس چا چکا تھا اب وہ بچوں میں سے گزر رہے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے انکے دانت بچ رہے تھے اس وقت وہ قبرستان کے راستے پر تھے کیونکہ قبرستان کے دوسری طرف انکا گھر تھا۔ ”کیا تم دوسری طرف سے نہیں جا سکتے تھے؟“ یوسف نے تقریباً ڈرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ قبرستان دیکھتے ہی اسے ہول آنے لگتے تھے وہ تو دن کے وقت بھی اس طرف نہیں آتا تھا لیکن حسام تو اسے رات کے دو بجے یہاں لے آیا تھا۔ ”کیوں نہیں جاسکتا تھا۔“

اب تو امید کی ایک ہی کرن نظر آتی ہے کہ کوئی رحم دل بچے دل سے خدا کی بارگاہ میں میرے لئے دعائے مغفرت کر دے تو اس کی بدولت میری قبر تا حدنگاہ تک وسیع ہو جائے گی اور میری قبر نشانی کر دی جائے گی۔

اتنے میں ایک خوف ناک بھیا تک سانپ بچپن پھیلانے میرے سامنے کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھوں اور منہ سے شعلے کی تپش نکلنے لگی، وہ پھنکارتا ہوا مجھ پر چھپا اور میرے ماتھے پر اپنے زہریلے دانت سے ڈس لیا، تکلیف اچانک برداشت سے باہر ہو گئی۔ ”یا اللہ۔۔۔۔۔ یا اللہ۔۔۔۔۔ مجھے بچالے، یا اللہ مجھے معاف کر دے۔۔۔۔۔ یا اللہ میں توبہ کرتا ہوں، یا اللہ مجھ پر رحم فرما۔۔۔۔۔“

مجھے زور زور سے جھنجھوڑا جا رہا تھا، میری آنکھیں بند تھیں، پھر جھنجھوڑنے والے نے مجھے پوری قوت سے جھنجھوڑنے لگا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی، صبح کا سپیدہ جمیل رہا تھا، میرے گھر کے سارے افراد میرے قریب کھڑے تھے، میرے سارے پڑے پینے سے شراہور تھے، میں سب کو یک ٹک دیکھتے ہوئے سوتے سے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا، گھر والوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ کیا ہوا، کیا بات ہے؟ آپ کیوں جی رہے تھے؟ کچھ تو بتائیں؟“

میں نے سب کو ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم لوگ فوراً میرے قریب سے چلے جاؤ اور پھر میں نے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا، میری زبان بالکل گنگ تھی، مجھ میں بولنے کی سکت بالکل نہیں تھی۔ بیوی سے شہنا پانی منگوایا اور غنا غٹ تین گلاس پانی پی گیا۔

اس رات کے بعد میری دنیا بدل گئی، صوم و صلوة کا پابند ہو گیا، دنیاوی خرافاتیں ختم ہو گئیں، گھر والوں کو بھی نرمی اور سختی سے راہ راست کا پابند کیا اور اب یا دالہی میں شب و روز گزار رہا ہوں۔

سے باہر بہت تکلیف دہ ہے مگر میرا خدا اس بات کا گواہ ہے کہ جو چیز مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی وہ یہ ہے کہ ”اے اللہ قیامت کے دن، اپنا یہ ذلیل اور مکروہ چہرہ لے کر کس طرح تیری بارگاہ میں حاضری دوں گا، اپنے جرائم کا تجھے کیا جواب دوں گا، قبر میں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ مگر میدان حشر میں تو ساری امتیں ہوں گی، سارے نبی کرام خصوصاً سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی موجود ہونگے کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟“

کاش! کوئی بہن یا بھائی میرا یہ پیغام میری اولاد کو بھی پہنچا دے کہ آؤ اپنے بدنصیب باپ کی سرخ انگاروں بھری قبر کو دیکھو۔

میرے بچو! میری قبر کو بے شمار سانپ اور پھوڑوں نے گھیر رکھا ہے جو سارا سارا دن میرا بدن نوچتے رہتے ہیں۔

میرے بچو! خدا کے واسطے ایک مرتبہ ہی میری قبر پر آ جاؤ۔ اگر آنے کی فرصت نہیں تو کم از کم میرے چھوڑے ہوئے مال سے میرے نام پر کچھ صدقہ خیرات ہی کر دو۔“

آتے وقت تم نے میرے تمام کیش بک، کپڑے یہاں تک کہ گھڑی تک بھی اتار لی تھی۔ میں دن رات یہاں نیکیوں کو ترستا ہوں، میری اولاد ہونے کی حیثیت سے کم از کم ایک مرتبہ ہی میری قبر پر آ کر دعا کر دو، اگر یہ بھی نہیں تو ایک شریف پڑوسی کی حیثیت ہی دے دو اور کچھ صدقہ خیرات میرے لئے کر دو۔“

بس آخری بات! میرے زخمی ہاتھ دیکھو۔ یہ لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میرے اس انجام سے عبرت پکڑو بڑھاپا آنے سے پہلے جوانی میں کچھ کرلو۔ مصروفیت آنے سے پہلے فرصت میں کچھ کرلو اور موت آنے سے پہلے زندگی میں کچھ کرلو، ورنہ میری طرح چھپتا دے بہت چھپتاؤ گے۔

حسام نے کہا۔

”تو پھر یہاں کیوں آ مرا ہے۔“ یوسف کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”یاد تو جانتا ہے وہاں سے کتنا لبا سفر ہے“ اور اس سے پہلے کہ حسام اپنی بات مکمل کرتا اچانک انہیں اپنے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی تو وہ تیزی سے پیچھے کی جانب مڑے لیکن عقب میں کسی بھی وجود کا نام و نشان تک نہیں تھا یوسف کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ شدید سردی کے باوجود بھی اسکے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ ”حسام تھ تو نے کوئی آواز سنی؟“ یوسف نے حسام کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کوئی آواز! میں نے تو کوئی آواز نہیں سنی“ حسام نے اوپر سے مضبوط لہجے میں کہا حالانکہ آواز اس نے بھی سنی تھی اندر ہی اندر اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ”اے تیز چل کیوں گدھے کی طرح چل رہا ہے؟“ یوسف نے حسام کو آگے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

”حسام تم میری بات سنو گے ناں؟“ نسوانی آواز پھر سے سنائی دی۔ اب اچھلنے کی باری حسام کی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن دور تک کسی لڑکی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

لیکھت یوسف کو جھکا لگا تو وہ منہ کے بل زمین پر آگر۔ احسان نے یوسف کو دیکھا تو مارے حیرت کے اس کے دیدے پھیل گئے۔ اس نے دیکھا کہ لیکھت یوسف کے قریب والی قبر چٹنی اور اس سے ایک انتہائی ہاتھ باہر نکلا جس نے یوسف کو پاؤں سے پکڑ کر کھینچا جس سے یوسف نیچے گرا۔ شدید خوف کی وجہ سے اس کی آواز بند ہو چکی تھی۔ لیکھت حسام نے پاس پڑی ہوئی اینٹ اٹھائی اور پوری قوت سے اس ہاتھ پر مارا جس سے اس ہاتھ نے یوسف کو چھوڑ دیا۔

حسام نے تیزی سے یوسف کو اٹھایا اور دونوں نے آگے کی طرف دوڑ لگا دی پسینہ ان کے مساموں سے پھوٹ رہا تھا۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا اب ہر طرف اندھیرے کی سبز چادر پھیل گئی تھی، حسام نے

یوسف کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اب انہیں ہر طرف سے خوفناک آوازیں سنائی دیں کہ اچانک حسام کا پاؤں کسی شکستہ قبر سے ٹکرایا اور اس کا سر زور سے ابھری ہوئی پکی قبر سے جا ٹکرایا اور اس کا دماغ جھنجھٹا اٹھا اس کے دماغ میں رنگ برنگے تارے ناچنے لگے، اندھیرا اس کے حواس پر چھانے لگا، اس نے اپنا سر بائیں جانب گھومایا تو اچانک اس کی ناک سے ایک نامانوس بو لگائی، اس کا ذہن اندھیرے کی تاریک انتہا گہرائیوں میں ڈوبنا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

آج بھولا پہلوان بہت خوش تھا خوشی سے اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ دھیم آواز میں گھسی رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ٹوٹوں کو بھی گن رہا تھا، کیونکہ آج کے دن گل کا وہ ہیر تھا اور اس نے اپنے روایتی حریف کو جا رول نشانہ چت کر دیا تھا۔ ویسے نام تو اس کا عبدالرشید تھا لیکن چہرے کی مصحوبیت کی وجہ سے لوگ اسے بھولا کہتے تھے۔ وہ ایک لمبے قد اور خاصی ڈیل ڈول والا آدمی تھا۔ اتنی سردی کے باوجود بھی وہ ایک دھوتی اور کرتے میں بلبوس تھا۔ رات کے بارہ بجے تک دنگل جاری رہا، اب ایک بج چکا تھا۔ اس لیے اب وہ شارٹ کٹ راتے سے گھر کی جانب رواں دواں تھا اس وقت قبرستان میں موت کا سناٹا تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے مردے بھی قبر کے اندر دبکے ہوئے تھے لیکن وہاں کی خوف و خطر ہلکی سی دھن میں گاتا بھی جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ٹوٹ بھی گن رہا تھا۔

اچانک اسے دائیں طرف ہلکی سی کڑکڑاہٹ کا احساس ہوا۔ اس سنائے میں اسے یہ آواز واضح سنائی دی۔ اسے دور جھانپائی ہوتی محسوس ہوئی اس نے ٹوٹوں کو جیب میں ٹھونسا اور بڑی آہستگی سے اس طرف چل پڑا، خوف کی بجائے اسکے چہرے پر تجسس تھا۔ وہ گھپ اندھیرے میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چل رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں بھی اس لئے وہ بھی غائب تھا اور ہر طرف اندھیرے کی دیز چادر تھی ہوئی تھی۔ اچانک وہ جھاڑیوں کی روٹ میں ایک پکی قبر پر بیٹھ گیا۔

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو رشید اس پر فاتحہ پڑھ لیتا لیکن اس وقت اس کی اوپر تو جہ اس ہولے پر مرکوز تھی جو فضا میں ہاتھ پھیلائے کی انچوکی طرح کھڑا تھا۔ بھولا جہان تھا کدات ڈبڑھ بچے یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ کافی دیر جب اس ہولے نے حرکت نہ کی تو اس نے آہستگی سے اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ جب وہ گزیر کے واسطے پہنچتا تو دیکھا کہ ایک شخص تھا جس نے سبز رنگ کا لبادہ اوڑھ کر رکھا تھا۔ ”اے کون ہے تو؟“ اس کی آواز میں ہلکا سا ڈھکا تھا۔

لیکن ہولے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”میں پھر باہوں کون ہے تو؟ اور اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہا ہے؟“ بھولا شیر کی طرح دھاڑا۔ اس کی آواز خاموش فضا کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔

لیکن وہ شخص کسی بت کی طرح کھڑا رہا۔ لیکن ہولے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے وہیں سے چڑا جھکا لگائی اور اس شخص کے اوپر آگرا، وہ شخص دھپ سے نیچے آگرا اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی جب اس کا پیکل ایک طرف ہوا تو بھولے کو اپنا زہن گھومتا ہوا محسوس ہوا حالانکہ وہ بہادر پہلوان تھا، لیکن اس وقت اس کی حالت دیکھنے والی تھی کیونکہ سیاہ لبادے میں ایک ڈھانچہ لپٹا ہوا تھا جسے دیکھ کر بے اختیار اس کا دل دھڑکنے لگا اس سے پہلے کہ بھولا خوف سے گھٹا اچانک اس کی ناک سے ایک نامانوس سی بو لگائی تو اس کا ذہن پھر کی طرح گھوما اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

اس وقت پورے قبرستان میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کس کس کو کی جتنی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی پھر ہوش چھاپائی تھی۔ اس تاریکی اور سردرات میں، جھاڑیوں کی اوٹ میں دو ہولے ایک جال، قالب بنے بیٹھے تھے۔ وہ دنیا کی فکر کو چھوڑ کر راز و نیاز میں مصروف تھے۔ ”شانستہ تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو؟“ ایک ہلکی سی لڑائی آواز سنائی دی۔

”احسان میں مرتے دم تک تمہارا ساتھ نبھائوں گی تمہارے بغیر تو میں ایک بل بھی نہیں رہ سکتی۔“ اسی

لڑکی کی شانستہ نے آہستگی سے کہا۔

شانستہ اور احسان ایک دوسرے کو حد سے زیادہ ٹوٹ کے چاہتے تھے۔ احسان ایک امیر باپ کا بیٹا تھا لیکن اس کے مقابلے میں شانستہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، لیکن محبت، امارت اور غربت کو نہیں دیکھتی۔

احسان نے شانستہ کو پہلی بار چھت پر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے سانولے سلونے رنگ میں بے پناہ کشش تھی۔ جو احسان کو اپنی طرف کھینچتی چلی گئی۔ انہوں نے ملاقات کیلئے اسی قبرستان کو ترجیح دی تھی، کیونکہ یہ ان کے گھر کے قریب تھا۔ لوگ تو دن کے وقت بھی اس طرف آنے سے گھبراتے تھے رات کو ان کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ دنیا سے بے خبر راز و نیاز میں مصروف تھے کہ اچانک انہیں ہلکے سے شور کی آواز سنائی دی۔ شانستہ تڑپ کر احسان سے الگ ہو گئی۔ اس کا دل انجانے سے خوف سے بری طرح دھڑکنے لگا۔ احسان کی حالت بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس نے شانستہ کو دلاسا دیا لیکن شانستہ کی حالت دیکھنے والی تھی۔ شدید خوف سے اس کے چہرے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ احسان جھاڑی کی اوٹ سے تھوڑا سا اوپر ہوا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا کیونکہ بہت سے لوگ دوڑتے ہوئے ان کی جانب آرہے تھے۔

اچانک پھر ہی سے احسان نے شانستہ کا ہاتھ پکڑا اور دائیں طرف دوڑ پڑا۔ وہ چھپتے چھپاتے اس جگہ سے کافی آگے نکل آئے اور قریب کی اوٹ میں ہو گئے۔ اب شور واضح ہوا تو لوگ پکڑو، پکڑو چور چور، کے نعرے لگاتے رہے تھے۔

”احسان میرا دل گھبرا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ میں گھر جا رہی ہوں۔۔۔۔۔۔“ شانستہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں اٹھو۔۔۔۔۔۔“ احسان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اس سے پہلے کہ احسان کھڑا ہوتا اچانک اس کا ذہن ٹوٹ کر طرح گھوما اور ایک نامانوس سی بو اس کی ناک

دیر بعد نہ لوئی تو مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور گلی کے آخری کٹڑ پر میرے دوست اقبال کی دکان ہے۔ میں نے جب اس سے زریہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”اس نے زریہ کو قبرستان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ یہاں تک پہنچ کر وہ رگہ گیا۔ اب اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

”مائی باپ میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا محلو والوں سے پوچھا لیکن پتہ نہیں وہ کہاں چلی گئی۔“

اس شخص نے روٹا کھائی لہجے میں کہا، ایک مرتبہ اس کے لہجے میں دنیا جہاں کا درد سمٹ آیا تھا۔ ”میرا آپ نے اپنا نام نہیں بتایا اور آپ رہتے کہاں ہیں؟“ میں نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔

”جناب میرا نام رحمت علی ہے اور میں مراد آباد کالونی میں رہتا ہوں؟“ اس نے کہا اس کا لہجہ کافی سنبھل چکا تھا۔

ٹھیک ہے تم باہر نکلو میں آ رہا ہوں۔ میں نے کہا میرا ذہن تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ میں زریہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے آخری وقت قبرستان میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا تو کیا..... اسے بھی..... اغوار کر لیا گیا تھا.....؟ لیکن کون ہے جو لوگوں کو اغواء کر رہا ہے.....؟ اور اس کے اغواء کرنے کا مقصد کیا ہے.....؟ کیونکہ میں بھی زریہ کو اس سلسلے کی کڑی سمجھ رہا تھا۔ اگر زریہ کے بارے میں تھوڑا سا بھی کلیئر ہو جائے تو پھر باقی اغواء کنندگان کا بھی پتہ چل جاتا۔ میں نے تیزی سے یونیفارم پہنا اور سردی سے بچنے کے لئے منظر بھی ساتھ لے لیا۔ رحمت علی کو لے کر میں ساتھ والے کواڑ کی طرف چل پڑا وہاں سے میں نے کاشیمل فیصل کو بیدار کیا کاشیمل فیصل کو میرا لائٹ پینڈ سمجھا جاتا تھا، کیونکہ وہ خاصا ذہین تھا فیصل آنکھیں ملتا ہوا ہمارے ساتھ چل پڑا۔

وہ مکمل یونیفارم میں تھا اس کے ایک ہاتھ میں

اب پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ تین دنوں میں پانچ انسان جنوں کی طرح غائب تھے۔ لوگوں نے دس بجے کے بعد گھروں سے نکلتا چھوڑ دیا۔ اگلے تین دنوں میں چار بندے اور غائب ہو گئے۔ پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع ہو گئی۔ چوک چوک پر دھڑا لگا دیے گئے تھے۔ اس وقت میں اپنے آفس میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ مانا کہ میں ذہین انسپکٹر تھا لیکن اس وقت چوہین مختلف قسمی میں دو دنوں سے مجرموں کا سراغ لگا رہا تھا۔ لیکن کوئی کلیو ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میں نے کالونی والوں کو کہہ رکھا تھا کوئی نئی واردات ہو تو مجھے ضرور اطلاع دی جائے۔ ویسے میں نے دو خبروں کو کالونی میں چھوڑ رکھا تھا لیکن انہوں نے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں دی تھی کیونکہ زیادہ تر افراد ہیں سے غائب ہوئے تھے۔

نہ جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا کہ میرے دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ ایک ہی دستک پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے لائٹ کو جلایا اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ دوسری بار متوش انداز میں دستک دی گئی۔

ایسا محسوس ہوتا جیسے دستک دینے والے کے پیچھے ڈاکو لگے ہوئے ہوں۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ سردی کی ایک تیز لہر میرے چہرے سے ٹکرائی جو میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

اچانک میرے پیروں سے کوئی چیز ٹکرائی تو میں تڑپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ”انسپکٹر صاحب..... انسپکٹر صاحب.....“ میری بچی..... کو بچائیں..... پتہ نہیں کہاں گئی وہ..... انسپکٹر صاحب.....“ ایک شخص نے میرے پیروں کی طرف پڑے ہوئے کہا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر چار پائی پر بٹھایا۔ وہ پاگلوں کی طرح کہہ رہا تھا کہ میری بچی..... کو بچائیں۔“

کافی تسلیاں دینے کے بعد اس کی حالت سنبھل تو اس نے کہنا شروع کیا۔ ”انسپکٹر صاحب میری بچی

ٹارچ اور دوسرے میں رائل تھی میں نے موٹر سائیکل نکالی اور ہم رحمت علی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ہم مراد آباد کالونی میں داخل ہو چکے تھے کیونکہ تھانہ کالونی کے ساتھ ہی تھا اس وقت گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ ”رحمت علی تمہارے دوست اقبال کی دکان کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ جی ٹکڑ میں جو دروازہ آپ کو نظر آ رہا ہے وہ اقبال کی دکان ہے۔“ رحمت علی نے مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہم نے موٹر سائیکل کو رحمت علی کے گھر میں کھڑی کی اور اقبال کی دکان کی طرف چل پڑے۔ ہم اقبال کی دکان پر پہنچے تھے تو اقبال کی دکان سے سوتقدم کے فاصلے پر جنوب میں قبرستان تھا اور اقبال نے آخری پار زریہ کو قبرستان میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

ہم نے رحمت علی کو گھر بھیج دیا۔ ”فیصل تمہارے خیال میں لڑکی کہاں ہوگی؟“ میں نے فیصل سے پوچھا۔ سر میرے خیال میں زربینہ کو اغواء کیا گیا ہے۔

اگر عشق و شوق کا چکر ہوتا تو وہ اب تک واپس آ چکی ہوتی۔
فیصل نے اپنے تئیں تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویری
گڈ! فیصل میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔

اب ہم قبرستان میں داخل ہو چکے تھے۔
 ”فیصل تم مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آنا کیونکہ
 کوئی بھی ناخوش گوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔“ میں نے
 کہا تو فیصل نے کچھ کہنے کی بجائے اثبات میں سر ہلا
 دیا۔ میں جو کئے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس وقت

میری تمام حسین بیدار ہو چکی تھیں۔ شدید سردی کی وجہ سے میرا ٹارچ والا ہاتھ ٹھنڈا چکا تھا۔ کاشیبل فیصل مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آ رہا تھا۔ ایکلخت مجھے ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز سنانی دی میں تیزی سے مڑا لیکن دور تک کوئی نہیں تھا۔ فیصل بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن مجھے قوی امید تھی کہ وہ یہی کہیں ہوگا۔ دھند کی وجہ سے مجھے اگر گرد دیکھنے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔ ایکلخت میرے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ اس وقت میری ٹارچ کی روشنی اس فیروزہ رنگ کے دو بڑے بڑے

تھی جو ایک جھاڑی میں اٹکا ہوا تھا میں محتاط انداز میں
ہلکے ہلکے قدم بڑھاتا ہوا اس جھاڑی کی طرف چل پڑا۔
دوپٹہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا میں نے گرد و پیش کا
باریک بینی سے جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ اس جگہ رنگ
برنگی چوڑیاں بھی ٹوٹی ہوئی پڑی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اور مجھے جب ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا
کمرہ تھا جو آفس کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ سامنے ٹیبل پر
ترجیب سے فون رکھے ہوئے تھے۔ ٹیبل کے پیچھے ایک
مختص بیٹھا ہوا تھا۔ ایک فائل کے مطالعے میں مصروف تھا
کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی تو اس کے چہرے پر
ناگواری کے تاثرات چھا گئے.....

”میں زمان اسپیکنگ ریسیور کان سے لگا کر اس
نے سخت لمحے میں کہا۔

”ایس زمان اسپیکنگ رسیورکان سے لگا رہا
نے سخت لہجے میں کہا۔

”ہٹری بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے خلاف توقع نرم لہجے میں کہا
 "نہیں سر..... حکم سر..... اس وقت اس کا لہجہ بھکا
 یوں جیسا ہو گیا۔ "زمانہ مای تیار ہے؟" ہنری نے نرم
 میں کہا شاید اس کا لہجہ قدرتی طور پر نرم تھا۔

”یہ سرگتنا مال چاہئے؟“ زمان نے جوش
 سے بھرے لہجے میں کہا۔
 اکیس بیس کی ایرجنی ضرورت ہے۔ ہنری نے

”ٹھیک ہے سر آپ میرے اکاؤنٹ میں دس کھروپے جمع کرا دیں ٹھیک چار دن بعد مال پہنچ جائے گا۔“ زبان خان نے کہا۔

”نہیں زمان خان ایک دن کے اندر اندر مال
بچاؤ میں تمہیں اس کے پندرہ لاکھ دیوں گا۔“ ہنری نے
کہا۔

خداوند میں تمہیں اس کے پندرہ لاکھ دوں گا۔“ ہنری نے کہا۔

”لیکن سر یہاں پولیس الٹ ہو چکی ہے ہر طرف ناکہ بندیاں ہیں، ہر حال میں دو دن میں پہنچانے کی کوشش کروں گا۔“ زمان خان نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

زمان خان نے ریسیور کمریوں پر رکھا۔ اس کا دل بیوں اچھل رہا تھا کیونکہ اس کی زندگی میں اتنا بڑا اور عجیب واقعہ آیا تھا چودہ لاکھ اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے تھے۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس نے یہاں اپنی پوری گینت تیار کر لی تھی۔ اس کی تنظیم کے ارکان پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں کہیں انہیں موقع ملتا وہ لوگوں کو اغواء کر لیتے اور ان کے اڈے تک پہنچا دیتے۔ قبرستان کے باہر ان کے پرائیویٹ کلینک کھول رکھا تھا اور غریبوں کا مفت علاج کرتا تھا لیکن دوسری طرف وہ مکر وہ دھوکا دے رہا تھا، جو جی اس کے آدمی کسی کو اغواء کر کے لے جاتا تو وہ اس کی آنکھوں کو نکال دیتے اور ان کی آنکھوں

تو وہ اس کی آنکھوں کو نکال دیتے اور ان کی آنکھوں

نچے سیر حیاں جاری تھیں وہ تیزی سے سیر حیاں پھیلا لگتا چلا گیا۔ سیر حیاں کے اختتام پر دو گن مٹن کھڑے ہوئے تھے، جنہوں نے اسے جھک کر سلام کیا لیکن زمان خان کو کسی بھی چیز کا ہوش نہیں تھا اس کے چہرے پر بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔

وہ تیزی سے دائیں طرف مڑ گیا دائیں طرف دروازے کے دونوں جانب گن مٹن کھڑے ہوئے تھے۔ جونہی وہ اندر داخل ہوا۔ ایک شخص تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ”باس آپ ادھر آئیں“۔ زمان خان نے ماتھے کا پینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بات ہی ایسی ہے جس نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔“ منیر نے کہا۔

”منیر زمان خان کو ہاتھ سے پکڑے تیزی سے ایک مشین کی طرف لے گیا جس کی اسکرین آف تھی۔ اس نے اسکرین کو آن کیا تو اسکرین ایک جھماکے سے روشن ہو گئی۔ ”باس میں آپ کو ایک فلم دیکھاتا ہوں آپ اس غور سے دیکھیں۔“ منیر نے زمان خان سے کہا تو زمان خان کی آنکھیں اسکرین سے ایسے چپک گئی جیسے مقناطیس لوہے سے چپکا ہے۔

اسکرین پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور ساتھ بالکی، بالکی دھند بھی تھی لیکن اسکرین پر قبرستان کا منظر واضح نظر آ رہا تھا ایک شخص جو پولیس کی وردی میں لمبوس تھا بڑے چوکے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں پستل اور دوسرے ہاتھ میں نارنج تھی۔

اچانک اس نے جھاڑیوں میں انکا ہواؤ پینڈا اٹھا یا اور غور سے زمین کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا جوں، جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے، ویسے زمان خان کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی، کہ پھر وہ شخص بائیں طرف گیا اور کچھ قدم چلنے کے بعد ایک قبر پر جا کر رک گیا تو زمان کا دل اچھل کر قلع میں آ گیا۔ ”منیر یہ شخص مخصوص جگہ پر کیسے پہنچ گیا.....؟“ زمان خان کسی ہم کی طرح پھٹ پڑا تو ہال میں یکدم سکوت چھا گیا۔ ”باس آرام سے آپ آگے تو

دیکھیں۔ چندا کہی گئیے کام نہیں کرتا۔“ منیر نے نرم لہجے میں کہا تو زمان خان کی آنکھیں ایک پار پھرا سکرین سے چپک گئے۔ پولیس والا تھوڑی دیر وہاں رکا اور اس نے وہاں نشان لگایا اور جونہی وہاں سے اوارے سے مڑا تو دھڑام سے زمین پر آگرا۔ ”منیر یہ کیا ہو گیا، یہ تو دھماکا جا رہا تھا اسے واپس جانے دیتے۔“ زمان خان ایک بار پھر منیر پر برس پڑا۔

”ایسا لگتا ہے آپ نے فلم کو غور سے نہیں دیکھا۔ اس نے قبر کے ساتھ نشان لگایا ہے جس سے لگتا ہے کہ وہ صبح آکر اس کو ضرور کھوے گا اور ہمارا راز فاش ہو جائے گا اس لئے میں نے بے ہوشی والا اسپرے کر کے اسے بے ہوش کر دیا اور اس وقت وہ ڈارک روم میں ہے۔“ منیر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو زمان خان کا مڑھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اسکرین کی طرف دیکھا جہاں وہ پولیس والا بے ہوش پڑا تھا۔ اچانک وہ قبر بغیر کسی آواز کے ایک طرف ہٹی اور اس سے دو نقاب پوش جو کہ سیاہ لباس میں لمبوس تھے تیزی سے باہر کی طرف لپکے، میرے بے ہوش وجود کو اٹھا یا اور تیزی سے قبر کے اندر آئے۔ قبر کے اندر سیر حیاں آ رہی تھیں۔ باہر اتری تاریکی کے باوجود اندرون کا سامان تھا ہر جگہ ہی روشن تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے سیر حیاں کے ساتھ والے پٹن کو دایا تو قبر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی اور وہ دونوں مجھے اٹھائے آگے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے۔ دونوں اس سرگ سے چلتے، چلتے دائیں طرف مڑ گئے۔ دائیں طرف مڑنے کے بعد ایک دروازے پر جا پھرے اور ایک مٹن کو دایا تو دروازہ کھل گیا اندر گھپ اندھیرا تھا انہوں نے مجھ کو اندر کی جانب دھکیل دیا تو منیر نے اسکرین کو آف کر دیا۔

”باس آپ اس سے پوچھ گچھ ابھی کریں گے؟“ منیر نے پوچھا تو زمان خان نے اپنی کھڑکی کی طرف دیکھا سوا چار بج رہے تھے۔

”منیر میں صبح آکر اس سے پوچھ گچھ کروں گا۔ ابھی میں گھر جا رہا ہوں یہاں مکمل گہرائی رکھنا۔ زمان

خان منیر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”او کے پاس۔ آپ بے فکر ہیں میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔“ منیر نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا لیکن زمان خان کو منیر کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا اس لئے وہ بے فکر ہو کر گھر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

کانشیل فیصل بڑے چوکے انداز میں مناسب مصلحت کر کے اس پر اچھا کر رہا تھا شاید میری کی وجہ سے اس کے ہاتھ بے ہوش ہو چکے تھے۔ بالکی دھند کی وجہ سے اس کے دماغ میں وقت محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر مناسب فاصلہ رکھ کر وہ انسپکٹر کا پچھا کر رہا تھا۔ اچانک فیصل جھاڑیوں کی طرف ہٹ گیا تو وہ کسی کی نظر میں نہ آجائے تو وہ بھی کسی کے ہوئے پھل کی طرح ان کی جھولی میں گر نہ پڑے اس لئے وہ چھپ چھپ کر پچھا کر رہا تھا۔ قبرستان میں اس وقت موت کا سانسنا تھا پورا قبرستان اندھیرے کی دینچ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ لیکن کانشیل فیصل ایک جگہ رک گیا کیونکہ اس نے انسپکٹر کو ایک دو پینڈا اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس نے دیکھا کہ انسپکٹر دائیں طرف لپکا اور کچھ قدم چلنے کے بعد ایک جگہ پر رک گیا۔ اس کی تاریکی کی لائٹ ایک قبر پر پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کیلئے انسپکٹر جھک گیا۔ جونہی وہ واپسی کیلئے مڑا تو اس کے دونوں ہاتھ فضا میں لہرا گئے۔ پستل اور نارنج اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے تھے۔ وہ جھومتا ہوا زمین پر جا کر اچانک کانشیل کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ وہ تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا تا کہ انسپکٹر کی مدد کو پہنچ سکے پھر اس نے دیکھا کہ قبر ایک طرف تیزی سے ہٹ گئی ہے اور اس سے دو نقاب پوش نکلے۔ ان کا وہ باہر نکلے اس نے راقفل ان کی طرف تان لی تاکہ انہیں یہاں بیٹھنے والے لیکن یہ سوچ کر راقفل کا منہ نیچے کی طرف کر لیا کہ کہیں ان کے ساتھی چھپے ہوئے نہ ہوں اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ان نقاب پوشوں نے انسپکٹر وارث کو اٹھا یا اور تیزی سے قبر میں اترتے چلے گئے اور قبر بغیر کسی آواز کے دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئی۔ کانشیل

فیصل کا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔ یہ نہیں وہ لوگ انسپکٹر وارث کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اسے جو بھی کرنا تھا بہت جلدی کرنا تھا۔

وہ تیزی سے واپسی کے لئے دوڑا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا ایک منٹ کے اندر اندر وہ حویلی کی چادر یواری پھیلا گئی۔ اس کا رخ رحمت علی کے گھر کی طرف تھا تھوڑی دیر بعد وہ موٹر سائیکل پر چڑھا اور آندھی اور طوفان کی طرح تھانے کی طرف رواں دواں تھا۔

☆.....☆.....☆

جب مجھے ہوش آیا تو رودی کی ایک تیز لہر میرے جسم میں دوڑ گئی اور میں کھڑا ہوا جوش میں آ گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کا منظر کسی فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھومتے لگا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی قبر میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے اپنے دائیں بازو میں بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی انجکشن لگایا گیا ہو۔ اچانک بدبو کا ایک جھونکا میری ناک سے کھرایا تو میرا ذہن چمکنا لگا میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا ایک قدم میں نے آگے کی طرف بڑھایا تو فضا میں کھڑکھڑاہٹ کی آواز گونجی میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے پاؤں کے نیچے آنے والی چیز کو ہاتھ لگایا تو مجھے اپنا ذہن گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرا دل ابھی پسیلوں کے پیچھے کو توڑتا ہوا باہر نکل آئے گا کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک انسانی کھوپڑی تھی۔

کھوپڑی کے تصور ہی سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا جب میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہاں کا منظر دیکھ کر مجھے پورا کرہ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا کیونکہ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواروں سے نحوست چمک رہی تھی اور کمرے کے فرش پر جاجا ہڈیوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور خون کے نشانات بھی تھے جو اب سوکھ چکے تھے۔ ان کی غلاطی کی وجہ سے کمرہ بدبو سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے مذبح خانے میں ڈال دیا گیا ہے۔ موت میری آنکھوں کے سامنے رقص کر



آخری دعا

کے راجپوت - کراچی

زندہ دل قوموں کے دل و دماغ میں وطن سے محبت اٹھ ہوتی ہے، وطن کی حفاظت کے لئے اگر لہو کے آخری قطرے کی بھی ضرورت پڑتی ہے تو وہ لہو بھی کیا اپنی جان تک وطن پر نہجاہور کر دیتی ہیں اور پھر.....

رونگئے کھڑے کرتی..... رگ و پے میں سنسنی پھیلاتی جسم پر لرزہ طاری کرتی کہانی

زندہ قومیں جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہوتی ہیں ایک امریکی جاسوس کی روداد جس پر ظلم و ستم کے خلاف لڑنے کے لیکن اس نے افسانہ کی اور نہ ہی دشمن جاننے والوں کے سامنے اپنی زبان کھولی، وہ اپنی ہنگامہ بازی زندگی کے واقعات کچھ اس طرح بیان کرتی ہے کہ جب 1942ء میں امریکی فوجیں واپس باتان آنے لگیں تو میں اور میری بیٹی ڈاکٹی بھی ان فوجیوں کے ساتھ ساتھ باتان چل دیے، میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے شوہر کے قریب رہ سکوں، جو امریکی فوج میں تھا، جاپانیوں کے خوف سے ہم پہاڑیوں میں جا چھپے، اور جانوروں کی سی زندگی گزارنے لگے، ڈاکٹی پر بخار کا شدید حملہ ہوا تو میں ڈاکٹی کو بروی مشکل سے سے چھپتے چھپاتے نکال کر نیلا پتھی، جہاں مجھے اور ڈاکٹی کو ایک بچہ روک ساس نے پناہ دی، یہ میرے شوہر کے دور کے عزیز تھے۔

منیر تھا کیونکہ شیدا نے اسکا یہی حلیا بتایا تھا۔ میں نے کاشفیل فیصل کو دوسرے ساتھیوں کے ساتھ لٹا دیا! ”خان ان سب کو کس کر باندھ دو اور انہیں ہوش میں لے آؤ۔“ منیر نے اس نقاب پوش سے کہا جو سب سے آگے تھا۔

خان ایک الماری کی طرف گیا اور وہاں سے ایک رسی لے آیا اور سب کو کس کر باندھ دیا اور دوبارہ اس الماری کی طرف گیا تھوڑی دیر بعد ایک شیشی اور آنکشن لے آیا۔ سب سے پہلے اسے ہوش میں لے آؤ۔ لگتا ہے یہی انکا لیڈر ہے منیر نے فیصل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

خان نے فیصل کو وردی کے اوپر سے آنکشن لگا دیا۔ پانچ منٹ گزرنے کے بعد کاشفیل فیصل نے کسمسا شروع کر دیا شاید وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ میں اس وقت ان سب سے پیچھے کھڑا تھا۔

اس وقت ہال میں تقریباً بارہ آدمی تھے جن کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں اور ان سب کی توجہ فیصل کی طرف تھی۔ جواب تک ہوش میں آچکا تھا۔ اس سے پہلے کہ منیر کوئی بات کرتا چا تک ہال گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور چیخوں سے گونج اٹھا۔ سب ہی جو فیصل کی طرف متوجہ تھے بے اختیار اچھل پڑے اور دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے چمکتی چلی گئی کیونکہ اس کے بارہ ساتھیوں کی لاشیں پھچکی کی طرح تڑپ رہی تھیں اور ان کے جسم سے خون کے فوارے سے بھی تیزی سے نکل رہا تھا۔

”نن..... شیدا..... یہ تو نے..... کک..... کیا کر دیا۔؟“

حیرت کے مارے منیر کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

”شیدا تو منکر نکیر کو جواب بھی دے چکا ہوگا۔ مسز منیر“ میں نے اپنا نقاب کھینچتے ہوئے کہا تو منیر بے اختیار اچھل پڑا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو کیونکہ اس کے سامنے شیدا انہیں بلکہ میں کھڑا تھا۔ جب کہ وہ مجھے اپنے ذہن سے بھی جھوکر چکا تھا مجھے زندہ دیکھ کر فیصل کا مہر جھایا ہوا چہرہ بے اختیار کھل اٹھا۔

”میں ان کو آنکشن لگاتا ہوں۔“ میں نے فیصل سے کہا تو تھوڑی دیر میں تمام ساتھی ہوش میں آچکے تھے۔ ”فیصل تم منیر کا خیال رکھنا میں ذرا اس جگہ کی تلاشی لے لوں۔“ میں نے فیصل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا میں سیدھا منیر کی خواہگاہ میں گیا اور وہاں جامع تلاشی لی۔ آخر کار مجھے غیر سیف سے وہ کاغذات مل گئے جن کو عدالت میں پیش کر کے زمان خان اور منیر کو سخت سزا دلا سکا تھا۔ کامیابی سے میرا چہرہ جگمگا اٹھا اور اللہ پاک کا شکر ادا کیا۔ دوسرے دن تمام اخباروں میں یہ خبر نمایاں تھی کہ.....؟

”غیر ملکی ایجنٹ زمان خان جو کئی سالوں سے حکومت کو مطلوب تھا اچانک پکڑا گیا ہے، اس کو پکڑنے میں نمایاں ہاتھ انکیٹر وارث اور اس کا رشتہ چٹنگا کاشفیل فیصل کا ہے۔“

اس لئے حکومت نے انکیٹر وارث کو پروموشن دے کر ڈی ایس بی اور کاشفیل فیصل کو پروموشن دے کر انکیٹر بنادیا ہے اور امید ہے کہ مستقبل میں بھی یہی طرح انسانیت کی مدد کرتے رہیں گے اور کامیابی کی برقرار رکھیں گے۔



مجھے جاپانیوں سے سخت نفرت ہو گئی تھی، میں نے جب جج روک ساس کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا کہ میں جاپانیوں کے خلاف جاسوسی کروں گی اور ملکی ساحلی علاقہ میں ایک نائنٹ کلب کھول کر جاپانی جہازوں کی آمد و رفت دیکھوں گی اور جاپانی گاڑیوں سے معلومات حاصل کر کے امریکی فوجیوں کو نوڈوں کی توجہ روک ساس نے مجھے بہت ہتھیایا کہ ”میں ایسی حرکت نہ کروں، کیونکہ جاسوسوں کو کبھی نہ کبھی پکڑ لیا جاتا ہے اور پھر ایسے لوگوں کا انجام بہت ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔“

میں کچھ عرصہ قبل مادام ڈوٹ کے نام سے جو میرا فرضی نام تھا ”ایٹانی“ کے شانہ کلب میں جاپانیوں کی ناک کے نیچے دو ماہ تک گلوکارہ کا کام سرانجام دے چکی تھی اور کسی کو کچھ پر شبہ بھی نہیں ہوا تھا، میں نے اپنی گلوکاری کے دوران جاپانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، خوش قسمتی سے میری جلد کی رنگت زیتونی اور بال سیاہ تھے اسی لئے مجھ پر امریکی ہونے کا شبہ نہیں کیا گیا، نائنٹ کلب کے حوالے سے میں نے اپنی کوششیں شروع کر دیں دو ماہ تک میں نے فیلا کے شانہ کلبوں کے ساتھ ہی جاپانیوں کے کردار کو بخوبی دیکھا اور بغور اس کا جائزہ لیا، میں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میں نائنٹ کلب کو سنبھال سکتی ہوں دیگر یہ کہ اپنے کلب کی اہمیت جتانے کے لئے میں عام شانہ کلبوں سے زیادہ قیمت وصول کروں اس کے ساتھ ساتھ کلب صرف جاپانیوں کے لئے وقت ہو دیگر افراد کیلئے کلب میں آنے پر پابندی ہو، چونکہ قیمت زیادہ ہوگی تو عام آدمی وہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا اور میری میرا مقصد تھا اور اگر میں اپنی اس سوچ پر عمل کرتی تو اپنے ذریعہ مقصد میں کامیابی حاصل کر سکتی تھی۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اپنی ہیرے کی انگلی اور کلائی کی گولڈن گھڑی رہن رکھ دی، اس سے مجھے اچھی خاصی رقم مل گئی اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ”اریدکا“ کے ساحلی علاقے میں میں نے ایسی جگہ تلاش کر لی، جہاں سے میں بندرگاہ میں جہازوں کی آمد و رفت کو باسانی دیکھ سکتی تھی، مقبول جگہ کے حصول

میں کامیابی کے بعد ہمیں میں نے اپنا کلب کھول کر کلب کا نام جاپانی طرز پر ”زوبا کی کلب“ رکھا۔ زوبا کی جاپانی زبان میں ایسی چیز کہتے ہیں جو نازک اور ہلکی ہو اور ناممکن الحصول بھی، میں نے ایک لڑکی ”کوکورا“ کو لڑکیوں پر مشق کی حیثیت سے ملازم رکھا، اس لڑکی کو میرے ارادوں کا علم تھا، اور کئی مرتبہ میری جان بچا چکی تھی، وہ ایک اچھی ملازمہ کے ساتھ ساتھ میری با اعتماد ساتھی بھی تھی۔“

15 اکتوبر 1942ء کو ہمارے شانہ کلب کا افتتاح تھا، میں دو روزے میں تیار ہو کر کھڑی ہو گئی، کوئی جاپانی افسر آتا تو میں تعلیمات جیک کراسے ”کومبارہ“ (شام کا سلام) عرض کرتی اور اس کو میرے کلب لے جاتی، جہاں وہ ایک میزبان لڑکی اپنے لئے چن لیتا، اس زمانے میں خطا کے بہت شانہ کلب بنتے میں صرف شو کرتے تھے، جبکہ میرے کلب میں اس قسم کے شور و زائد ہوتے تھے۔ فلی کوکارا، جاپان کے رومانی گیت گاتی اور دوسرے فلمی لڑکے اور لڑکیاں مقامی رقص کرتے۔“

ابتدائی ایام میں ہمیں چند مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا، شروع میں جاپانی مجھے اور دوسری لڑکیوں کو اپنے مخصوص آوارہ انداز میں رکھتے تھے ان کو بہت ہی مشکل سے سمجھانا پڑا کہ یہ جگہ اس قسم کی نہیں ہے لیکن ہمت و دم جاپانیوں کو خفصہ جاتا، اس کے لئے بعض دفعہ ہمیں جاپانی افسروں کے طمانچے بھی کھانے پڑے لیکن میں نے اپنا سخت طرز عمل جاری رکھا، یہ صرف شانہ کلب تھا، فاشی کا اڈا نہیں، آہستہ آہستہ یہ مشکل ختم ہو گئی لیکن دوسری مشکل ابھی باقی تھی، گا ہک کلب کو بہت مہنگا سمجھتے تھے میں نے ان لوگوں کو سمجھایا کہ ہمارا کلب بہترین انداز میں تفریح پیش کرتا ہے اس پر اخراجات بھی دیے ہی آتے ہیں میرے سمجھانے نے پراثر کار کا ہک مطمئن ہونے لگے اور کلب کی رنگینیاں عروج پر نظر آنے لگیں۔ عموماً جو خیر افسران میرے پینے کے بعد بول کوفٹ پر چکنا چور کر دیتے اور بغیر رقم دئے کلب سے چلے جاتے تھے ایک مرتبہ تو خواہش کی حد ہوئی ایک ظالم افسر نے

میر کی حالی بول ایک میزبان لڑکی کے سر پر دے ماری اور بچھا ہوا کلب سے چلا گیا۔ چونکہ میزبان لڑکی کے سر سے خون بہنے لگا تھا اس لئے اسے فوری طور پر فرسٹ لیڈ کی گئی اور اسے آرام کرنے کے لئے کمرے میں ایک پیڈ پر لیٹا دیا، اگرچہ جاپانیوں کی طرف سے حکم تھا کہ افسروں کی بد اخلاقی اور ان سے جو نقصان کلب کو ہوتا ہے اس کی نورا اطلاع دی جائے مگر میں ارادہ ان کی شکایت کرنے سے چشم پوشی کرتی، کیونکہ میں ان کا مکمل اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اور دشمنی کے بجائے مصالحت سے کام لیتی، جاپانیوں نے دوران جنگ رقص پر قطعی پابندی عائد کی ہوئی تھی، کیونکہ ان کے نزدیک رقص فوجی کردار کے مذاق اڑانے کے مترادف تھا، مگر اکثر جاپانی افسر میزبان لڑکیوں کو رقص کے لئے مجبور کر دیتے تھے۔ ایک رات جاپانی فوجی پولیس کا ایک آدمی کلب میں آیا اور ایک کینپن کے جو اس وقت ایک میزبان لڑکی کے ساتھ موجود تھا زور سے تھپن مار دیا کینپن کا چہرہ اپنی تھپک اور غصے سے سرخ ہو گیا لیکن کینپن نے بغیر کچھ کے اپنا رقص ختم کر دیا، مجھے اس واقعہ کو دیکھ کر بہت غصہ ہوا، کہ اب جاپانی میرا کلب بند کر دویں گے اور جس مقصد کے لئے میں نے اسے پاپڑ بیٹے ہیں وہ ختم ہو جائے گا، فلی کوکارا نے میری ہمت بندھائی ”بولی۔“ آپ گھبرا نہیں، یہ سب کام مجھ پر چھوڑیں، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی اور یہ بدترکی ختم ہو جائے گا۔“

فلی کوکارا اور ایک میجر نے اس جاپانی فوجی پولیس کو مشکل سے سمجھایا کہ ہم نے خود کینپن کے رقص کو ختم کر دیا تھا، لیکن ہمیں مجبوراً کینپن کی مرضی سے اس کی خاموش رہنا پڑا، میجر نے پولیس کو کچھ رشوت دی کہ جب تک ہمیں اس نے وہ شکایت نامہ بھجوا دیا جو وہ پہلے سے چکا تھا اس واقعہ کے بعد سے مجھ پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ جاپانی افسروں کا راتوں کو تانہ بندھا رہتا تھا، ان کی حالت میں خوب اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اور اصل کام کا یہ کیا موقع تھا، میں نے کپتان جان بون سے

جو امریکی گوریلا فوج کا بانیان میں کامیاب تھا، رابطہ پیدا کیا میرا خفیہ نام ”ہانی پائکس“ تجویز کیا گیا، میں کھانے پینے کی چیزوں کے ناموں کو اپنی اطلاع کی ترسیل کے لئے استعمال کرتی تھی، اگر میری فراہم کردہ اطلاعات بہت اہم ہوتیں تو کپتان جان بون جواباً ”پھلیاں بہت مزیدار تھیں“ لکھتا اور اطلاعات کے غیر اہم یا ناقابل عمل ہونے پر لکھتا۔ ”سبزی آتے آتے خراب اور ہاسی ہو گئی۔“

آخر کار وہی ہوا جو ایسے کاموں میں ہوتا ہے، ہمارا سب سے پہلا پیغام پکڑا گیا۔ اور اسے معلومات حاصل کرنے کے بعد گولی مار دی گئی، دوسرا پیغام محفوظ رہا، اس کے جوتے دوہرے تلے کے تھے، ہم اپنے پیغامات اس کے جوتوں کے کلوں میں چھپا کر بھجواتے یا کبھی کبھی ہم کیلوں کے کچھے میں سے ایک کیلے کی چھال اتار کر پرچہ اس کے اندر رکھ دیتے اور کیلے کی چھال کو برادر کر دیتے، مینے میں ایک دفعہ میں اپنی فراہم کردہ اطلاعات ادویات اور غذاؤں کے پیکٹوں کے ساتھ بھیجتی، اگر کوئی بہت اہم بات ہوتی تو میں ایک فلمینی خدمت گار کو اطلاع کے ساتھ فوراً کپتان جان بون کے پاس روانہ کر دیتی، میں جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت کے بارے میں اور ان کی منزل مقصود کی خبریں پہلی فرصت میں جان بون تک پہنچانے کی کوشش کرتی، میری یہ جلد بازی کی کوشش خطرناک بھی ہو سکتی تھی مگر میں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی اور اپنے عمل کو جاری رکھا۔

ایک رات میں اپنے شانہ کلب میں ایک جاپانی افسر سے جو گفتگو کی کہ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا ”میں نے آپ کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟“ میں نے سوچا کہ اس نے پہلے مجھے ”ایٹانی“ کلب میں دیکھا ہوگا، میں نے اس سے پوچھا۔ ”پہلے کب؟“ جواب میں ایک زبردست گھونٹ میرے چہرے پر پڑا۔ اور میں لڑکھڑاکر فرش پر گر گئی۔ وہ انتہائی غصے سے دھاڑا، ”تم لوگ ہمیشہ جاپانیوں کے آنے سے پہلے زمانے کی باتیں کرتے ہو، یہ بات تمہیں یاد رکھنی چاہئے کہ ذیل امریکن ہمیشہ کے لئے چاچکے ہیں

اور اب یہاں جاپانیوں کی حکمرانی ہے۔“

ان سب مشکلات کے باوجود میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ کبھی کبھی اپنی محنتوں کا علم ہو جاتا تھا۔ ایک طیارہ بردار بحری جہاز (ایئر کرافٹ کیئر) کا کپتان فلی کوکارا کے گانے پر بری طرح فریفتہ تھا، اس افسر کی الوداعی پارٹی کے موقع پر فلی کوکارا نے اس سے نہایت مکاری سے کہا۔ ”اب آپ چارہ ہیں، میں آپ کو کس پتے پر خط لکھوں؟“ کپتان نے بتایا کہ وہ پہلے سنگاپور اور پھر رابول جائے گا۔ میں نے یہ اطلاع فلی سے حاصل کر کے فوراً کپتان جان بون کے پاس پہنچادی اس کے کچھ ماہ بعد ایک جاپانی افسر نے فلی کو بتایا۔ ”تمہارے ایئر کرافٹ کیئر کے کپتان اور اس کے پورے عملے کو امریکیوں نے تباہ کر دیا تھا۔“ میں نے اور فلی نے نہایت مکاری سے اپنے افسروں کا اظہار کیا۔ ایک رات جبکہ کلب کی رویتیں حسب معمول اپنے عروج پر تھیں، ایک جاپانی آبدوز بیڑے کا کمانڈر میرے کلب میں آیا، کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ پر بہت مہربان نظر آنے لگا، میرا خیال تھا کہ سان فرانسسکو میں اس نے میرا پنکھا قفس دیکھا ہوگا، یہ قفس بالکل برہنہ ہو کر کیا جاتا ہے اس نے مجھ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں پنکھا قفس پیش کروں، میں نے اسے دوسری رات آنے کی دعوت دی، ہم نے ہانوں کی کچھچوں اور عمدہ کاغذ سے دوپٹے بنائے، فلی نے میرے جسم کی رنگت سے ہم آہنگ ایک چشت اور چپکا ہوا لباس تیار کیا، ہال میں ہم نے تمام روشنیاں بند کر کے سرخ روشنی پھیلا دی، وہ افسر اپنے چالیس ساتھیوں کے ساتھ آیا، ان لوگوں نے نظریں گاڑ کر دیکھا، میں واقعی برہنگی، وہ دوسری رات بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آیا اس نے کہا۔ ”آج رات تم اور پنکھا قفس کرو، کیونکہ کل ہم سلومن جا رہے ہیں، اس اطلاع پر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ دوسری رات میں نے پنکھا قفس نہایت عمدگی اور کامیابی سے پیش کیا، اپنے جملہ امور سے فارغ ہو کر جاپانی آبدوز بیڑے کی روانگی اور منزل کی اطلاع کپتان

جان بون کے پاس پہنچا دیوں میں مجھوادی، چند مہینوں کے بعد ایک جاپانی افسر آیا، اور اس نے بتایا کہ آبدوز کا وہ بیڑہ بالکل تباہ کر دیا گیا ہے اور چند بچنے والے خوش قسمتوں میں سے وہ ہے۔

میرا شوہر کپتان کا نام کیمپ میں قید تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی تھی، میری خواہش تھی کہ اپنے شوہر کی کچھ مدد کروں، میں نے بہت کوششوں کے بعد اس قیدی کیمپ میں اپنا کچھ اثر پیدا کیا، مگر مجھے یہ معلوم کر کے از حد افسوس ہوا کہ میرا شوہر دوپٹے قبل مر چکا تھا، جو جاپانی یہ کہتے تھے کہ اس کی موت طیرا سے ہوئی ہے لیکن وہ دراصل فالتھ کشی سے مر اٹھا۔ رابرٹ ٹیلر اور ٹی بی ٹی دو پادری تھے یہ دونوں ایک جاپانی قیدیوں کے جہاز پر دوسرے سولہ سوا دیہوں کے ساتھ تھے، اور جہاز جاپان جا رہا تھا اس جہاز کو تار پیڑو کے ذریعے ختم کر دیا گیا تھا ان پادریوں نے مجھے امریکی قیدیوں کی مشکلات اور ان کی ضروریات کے بارے میں لکھا، میں قیدیوں کی مدد کرنے کی خاطر ”یوگروپ“ میں شامل ہو گئی، تاکہ میں قیدیوں کے لئے پیٹار۔ پچھو، غذا، نمک اور ادویات بھجوا سکوں، ہم لوگ قیدیوں کی چادروں کی ٹھکن درست کرتے اور ان کے موزوں کی مرمت کرتے، ہم قیدیوں کے لئے دو ٹیم بھی خود بناتے، قیدیوں میں حیاتیں ”ج“ کی کمی کی وجہ سے میری پیری اور سکروی کی پیاریاں عام تھیں، ہم مقامی ناہنگیوں کا رس پکا کر اس میں شکر ملا کر اور جگلوں میں بھر کر قیدیوں کے کیمپ میں بھجوا دیتے، قیدیوں تک سامان پہنچانے کی خاطر چوکیداروں کو کھڑکیوں، کیمروں اور قلم کے نذرانے دینے پڑتے۔

ایک ہی وقت میں مخصوص رقم اور سیکورڈوں پیٹا مات کیمپ میں پہنچا دینے جاتے قیدیوں کا مدد کرنا میری جانی کا پیش خیمہ ثابت ہوا، 23 مئی 1944ء کی صبح میں بہت بے چین اور تنہا ناٹھے کی میز پر بیٹھی تھی، میری افسردگی کی وجہ یہ تھی کہ میں جتنی خوشخبری طور پر کیمپ میں بہت سی چیزیں لے جاتا تھا وہ بکڑیا گیا تھا۔

اچانک جاپانی فوجی پولیس کے چار افسر دھناتے ہوئے کلب میں داخل ہوئے، میں گھبرا کر اچھل پڑی، دو افسروں نے ریوالور کی نالیاں میری پیلیوں میں گاڑ دیں۔ ”تمہارے سب کاغذات کہاں ہیں، جلدی پور ذلیل عورت؟“ ایک افسر چلایا، میرا دل دوڑنے لگا، خلق میں کانٹے سے جھپٹنے لگے، مجھے معلوم تھا کہ پاسوں کو یا تو گولی مار دی جاتی ہے یا ان کا سر قلم کر دیا جاتا تھا، انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور مجھے گاڑ روم لے گئے، آنکھوں پر پٹی بندھے مجھے ان کے سوالات کے جواب دینے پڑے۔

ایک آواز گونجی۔ ”ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے اب کچھ چھپانا بیکار ہے، ہائی پانکس! ہائی پانکس!“ یعنی اپنا خفیہ نام سن کر مجھ پر سکتہ ساطاری ہو گیا، اب معلوم ہوتا تھا کہ جاپانیوں کو میرا کوئی خفیہ خط مل گیا ہے، مگر میرا کون سا خط انہوں نے پکڑ لیا؟ اگر کپتان جان بون کے نام میرا کوئی خط پکڑا گیا تو میرا خاتمہ یقینی ہے، جب انہوں نے میرا وہ خط پڑھنا شروع کیا جو میں نے پادری کے نام لکھا تھا تب مجھے پتہ چلا کہ میرا پیٹا میر پکڑا چکا ہے۔

انہوں نے پوچھا۔ ”کال کون ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ کلمے میں من مقامی نارنگی کے نام کا مخفف ہے، اس خط میں پادری کو میں نے لکھا تھا کہ میرے پاس جگلوں کی کمی ہے اور جتنے جگ آپ کے پاس ہوں فوراً بھجوائیں۔“

لیکن جاپانیوں کو میری باتوں پر یقین نہ آیا، انہوں نے مجھے پھڑپھڑوں، لالٹوں اور گھونٹوں سے خوب دباؤ مارا جاتے اور پوچھتے جاتے، ”یہ کال کون ہے اور جگ سے کیا مراد ہے، ہم بے وقوف نہیں ہیں کال ایک خفیہ لفظ ہے اور جگ ایک امریکی نام ہے۔“ مارے پھٹے چند ہاتھوں نے مجھے پکڑ لیا پھر مجھے زبردستی لٹا کر ایک میسرے ہاتھوں، پیروں اور سر کوٹنے سے باندھ دیا گیا، اس کے بعد پانی کا پائپ میرے منہ اور ناک میں بھنسا دیا گیا، جب اس میں پانی چھوڑا گیا تو مجھے ایسا

محسوس ہوا کہ جیسے میں پانی میں ڈوب رہی ہوں پھر میں نے ہوش ہو گئی، بے ہوشی کے دوران تکلیف کی شدت اتنی تھی کہ میں خوف سے جینتی ہوئی ہوش میں آئے ہوش میں آتے ہی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی، جاپانی میرے جسم کے مستور حصوں کو قطی ہوئی سگریٹوں سے جلا رہے تھے۔ ”مسٹر ڈی جی جون کون ہیں، اور کال کیا ہے؟ سوائے جیننے چلانے کے اور کچھ نہ کہہ سکتا، جب میرے منہ میں وہ دوبارہ پائپ پھنسانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ ”ڈی جی جون کے متقی کسی انگریزی جاپانی لغت میں دیکھیں، انہوں نے پائپ میرے منہ میں پھنسا دیا، اور پھر وہی عمل دہرایا، میری قوت برداشت چونکہ ختم ہوئی جا رہی تھی اس لئے مجھے بے ہوش ہونے میں دیر لگی۔

ایک مرتبہ پھر بے ہوشی کا سلسلہ ٹوٹا، میں جب دوبارہ ہوش میں آئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھ کچھ بند کر دی، ہر جاپانی افسر کی جیب میں ایک چھوٹی انگریزی جاپانی لغت ہوتی تھی، انہوں نے اس لغت میں ڈی جی جون کے متقی دیکھ لئے تھے، وہ لوگ باہر چلے گئے اور میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔

پھر مجھے تین ہفتے تک ایک کمرے میں بالکل تنہا رکھا گیا، مجھے روزانہ تین پیالے پانی اور ایک پیالہ ابلے ہوئے چاول بطور غذا ملتے تھے، میری ذہنی اور جسمانی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی، ایک دن میں نے چند جاپانیوں کو جو میرے کمرے کے پاس کھڑے تھے اشاروں سے بتا دیا کہ مجھے اپنے گندے کپڑے دھونے کے لئے کچھ پانی کی ضرورت ہے، ایک جاپانی نے گندکی ہالٹی میرے اوپر اٹھل دی، میرے پال چیکٹ ہو رہے تھے، جسم پر گرد اور میل کی تہیں جم چکی تھیں سر کے بالوں میں جوڑوں کا راج تھا، میں بھتی کی شکل میں پہروں فرش پر بیٹھی رہتی، کوئی بولنے اور سننے والا نہ تھا، کبھی کبھار خود سے باتیں کرنے لگتی تو جاپانی سمجھتے کہ میں بالکل ہونگی ہوں یا ڈرامہ کر رہی ہوں۔

چوبیس گھنٹوں میں ایک پیالہ ابلے ہوئے چاولوں کی اہمیت ہی کی تھی، میں غذا کی کمی کی وجہ سے کمزور ہونے

گلی تھی، جسم کا گوشت آہستہ آہستہ گھلنے لگا تھا، مگر بیٹوں سے جلا ہوا حصہ علاج نہ ہونے کی وجہ سے پکنے لگا تھا، جسم پر جلنے کے ایسے نشانات پڑ چکے تھے جن کی بدفانی ختم نہیں ہو سکتی تھی میں ان تمام نشانوں سمیت قبر میں جانے کی سوچتی تھی، رہی کبھی کسرتجائی نے پوری کردی تھی اکیلے پان کا شدید احساس ہوتا تھا، کبھی کبھی میں خود بڑبڑانے لگتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں، جاپانی مجھے دیکھتے بہتے اور پھر سب ل کر قہقہہ لگاتے، میں خاموشی سے صرف انہیں دیکھتی رہتی۔

تین ہفتے گزرنے کے بعد حالات نے معمولی سی کروٹ لی، مجھے ”سانتا گو“ کے قید خانے میں بھیج دیا گیا، جہاں مجھے دیگر گیارہ عورتوں کے ساتھ اسی فٹ لمبے اور بیس فٹ چوڑے کمرے میں بند کر دیا گیا اگرچہ قید خانہ تو بہر حال سزا کیلئے ہی ہوتا ہے یہاں بھی قابل ذکر کوئی تبدیلی نہ آئی لیکن تنہائی کے عمل سے بہر حال جان چھوٹی تھی اس قید خانے میں بھی تین مہینے کا عرصہ گزر گیا، ندرات کا احساس ہوتا تھا، نہ دن کی خبر، مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا کہ میں اسی قید خانے میں پیدا ہوئی تھی اور میری سابقہ زندگی محض ایک خواب تھی۔

وہ شبانہ کلب کی سرشام رونقیں اور دولت کی بے تحاشہ آمد سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا تھا اور میں بھگتی کی مانند اس قید خانے میں پڑی تھی۔

آخر کار ایک دن ایک جاپانی افسر جس کو میں پہلے اپنے کلب میں دیکھ چکی تھی، میری کھڑکی کے قریب سے گزرا، میں نے اسے بلایا، اور اس سے کہا۔ ”کہ میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں، میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ میرے معاملے کو دوبارہ افسروں کے سامنے پیش کرے، تاکہ مجھے اس قید تنہائی اور جہنم سے نجات مل سکے، دو بجے سہ پہر میں پھر باز پرس کے لئے لے جانی گئی جاپانی ہمیشہ گہری نیند میں سے قیدیوں کو اس لئے اٹھاتے ہیں کہ اس طرح قیدی شاید نرم پڑ جائیں اور اصل حقیقت اگل دیں، دوران تفتیش مجھے بتایا گیا کہ ایک خاص خط جو میرے معاملے میں بہت اہمیت رکھتا تھا وہ ہمیں کم ہو گیا

ہوئی انگریزی میں کہا۔ ”اے بہادر عورت، ہمیں امید تھی کہ تم اس مرحلہ پر کچھ نہ چھپا سکو گی اور وہ سب کچھ ہمیں بتا دیں گی جس کی ہمیں ضرورت ہے مگر تم اس مرحلے پر بھی خاموش رہی ہو یقیناً تم مجرم نہیں ہو، اس لئے ہم یقین کرتے ہیں کہ تم بے قصور ہو۔“ وہ بولے جا رہا تھا اور مجھ پر ٹیٹھاری ہوئی جا رہی تھی، اس کی تقریر کا آخری حصہ میں اس لئے نہ سن سکی کہ میں بے ہوش ہو کر آگے کی جانب ڈھلک چکی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو خود کو ایک کمرے نما کوٹھری میں پایا، ابھی میں کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک جاپانی ہال داخل ہوا اور مجھے دھکیلا ہوا ایک ہال نما کمرے میں لے گیا، جہاں اور بھی جاپانی موجود تھے وہ مجھ پر کوٹ مارشل کا مقدمہ چلانا چاہتے تھے، میں نے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک زوردار گھونہ میرے منہ پر پڑا، گھونسا اتنا شدید تھا کہ اس سے میرا ایک دانت اڑ گیا، ایک آواز نے مجھے ڈانٹا۔

”تم سے صرف یہ توقع کی جاتی ہے کہ تم صرف یہ جہاد، جہنم، جہنم ہو کہ نہیں، اس کے علاوہ کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔“ کو پہلے میں بہت خوف زدہ تھی، مگر دانت ٹوٹنے کے بعد پتہ نہیں کیوں مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا، شاید میں اذیت سہنے کی عادی ہو گئی تھی، مجھے یہ سن کر بہت تعجب اور حیرت ہوئی کہ مجھ پر ایک اور مقدمہ چلنے والا ہے اور وہ یہ کہ میں نے جاپان کی شاہی حکومت کے خلاف کام کیا ہے، جب مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ اس سلسلے میں میں کیا کہنا چاہتی ہوں تو میں نے بے ساختہ اس جرم کا اقرار کر لیا، میری گزشتہ حالت ایسی تھی کہ مجھے زندگی سے موت بدر جہاں بہتر نظر آتی تھی، میرے عترف جرم کے بعد مجھے تین سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔

اگلے دن مجھے اس کوٹھری سے عورتوں کی جیل بٹھایا گیا اگرچہ یہ جگہ بھی بہت اچھی نہ تھی مگر دوسرے کچھوں اور کوٹھری کی تنہائی کے مقابلے میں عورتوں کی یہ جیل جنت معلوم ہوتی تھی چونکہ جاپانی جیل کی عورتوں کو کھانے کے لئے پرانے نام غذا دیتے تھے عموماً ابلے

ہوئے چاول یا آلو اور وہ بھی اتنی کم مقدار میں کہ ایک بچے کا بھی پیٹ نہ بھرے، پھر یہ کہ بے انتہائی کم غذا بھی چوتیس گھنٹے میں ایک دفعہ دی جاتی تھی اس لئے قیدی عورتیں کبھی فاقہ کشی کرتیں اور کبھی کیلے کے تے اہال کر پیٹ کا جہنم بھر تیں، ہم پر ایک فلمی عورت گراں تھی اور ہم عورتیں کبھی باڑی اور باغبانی کا کام سرانجام دیتی تھیں یہ گراں عورت بہت ہمدرد اور مہربان تھی اور صرف یہ چاہتی تھی کہ جس دن جاپانی افسر معائنہ کے لئے آئیں تو اس دن باغ کو خوب اچھی طرح سنوار دیا جائے میں نے باغ سے مختلف قسم کے پھولوں کا رس اپنے زخموں پر لگایا تو وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے لگے، اب دماغ بھی کچھ سکون پایا جا رہا تھا جیل میں کسی قسم کی اذیت اور پریشانی نہیں تھی ہم تمام عورتیں سارا دن باغبانی کرتے اور رات کو پاؤں پھیلا کر زمین پر آرام سے سو جاتے زندگی کا کارواں یونہی رواں دواں تھا، ہم دن اور رات کو بھول چکے تھے بس صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ ہماری زندگی اور دنیا بیکار تھی۔

لیکن وقت کبھی یکساں نہیں رہتا، ہر رات کے بعد صبح ضرور طلوع ہوتی ہے، ہماری زندگی میں بھی بالآخر صبح طلوع ہو گئی وہ 10 اپریل 1945ء کا دن تھا، جب اتحادی فوجوں نے ہمیں اس قید خانے سے نجات دلائی۔ میں پریشان حال شگے بیروں ہی بھاگ کھڑی ہوئی، آزادی کے تصور نے مجھے دیوانہ سا بنا دیا تھا، یہ خیال کہ میں اب اپنے شبانہ کلب جا سکوں گی، اپنی بیٹی ڈانٹی سے مل سکوں گی اپنے ملک کی آزاد فضا میں سکھ کا سانس لے سکوں گی پرست اور خوشگوار خیالوں کی یلغار تھی جس نے مجھے خوشی سے پاگل کر دیا تھا۔

آج میں اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی حصوں پر جاپانی افسروں کے جلنے ہوئے مسگریوں کے داغ لئے پرست زندگی گزار رہی ہوں، مجھے فخر ہے کہ میں نے اپنی قوم کی آزادی کے لئے حب الوطنی کے جذبے کا بھرپور مظاہرہ کیا۔



دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بھاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

جس اور سکنس سے بھر پور واقعات جو پڑھنے والوں کو رطزہ حیرت میں ڈال دیں گے

پھر اس نے فوراً ہی لپک کر کٹا ہوا سر اٹھالیا۔ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”تم نے کتنے غرے دکھائے..... میرے قابو میں آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں..... لیکن میں نے تمہیں کتنی آسانی سے بے بس کر دیا..... تم نے میرے چہرے پر تھوکا..... اپنے لیے بے ناخوتوں سے پہلے تو میری آنکھیں پھوڑنے کی کوشش کی..... جب آنکھیں نہ پھوڑ سکیں تو نہ صرف میرے چہرے بلکہ جسم پر بھی خراشیں ڈال دیں..... کیا فائدہ ہوا..... آخر میں نے تمہاری عزت پامال کر دی..... اپنی عزت جسے بچانے کے لئے تم نے نہ جانے..... کیا کیا جتن نہیں کئے..... لیکن ناکام رہیں..... آخر جیت میری ہوئی.....“

پھر وہ توقف کر کے اس کے زرخرے سے رستا ٹپکتا لہو پینے اور زبان سے چاٹنے لگا..... پھر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا.....

پھر اس نے دیوار میں نصب گھٹی کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے آہٹیں سنیں..... دو آدمی آئے جو چہرے مہرے اور منہ قطع سے پیشہ ور قاتل لگ رہے تھے۔ جب وہ کمرے میں گئے تو اس نے کہا۔

”یہ لاش لے جاؤ..... اس کی کھال اتار کر لے آؤ..... اس کا سر کٹوے کٹوے کر کے کتوں کو کھلا دینا.....“ پھر وہ دونوں بد معاش اس لڑکی کا سر اور لاش لے گئے۔ وہ لڑکی بمشکل سولہ برس کی ہوگی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں بہت خوب صورت اور اس کا جسم بھی بہت دلکش تھا۔ میں اس جگہ سے نکل کر اس لئے جا نہیں سکتا تھا مجھے اس کمرے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ دروازہ نہ صرف کھلا ہوا تھا بلکہ وہ بے پستی سے کسی وحشی بھوکے درندے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ اس کے بشرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھوک سے بے تاب ہو رہا ہو..... اس لڑکی کا خون پینے سے جیسے اس کی بھوک کھل اُٹھی ہو۔ کئی دتوں کا بھوکا ہو۔

”کیا یہ ڈر نکولا ہے.....؟ میں نے دہشت زدہ ہو کر سوچا۔ میں نے اس کی فلم اور دو تین ناولیں پڑھی تھیں۔ جو انسانی خون پی جاتا تھا۔ وہ تو قصہ کہانی تھی..... شاید اس کا وجود بھی تھا یا ہوگا..... میں نے اس کی تمام کہانیوں کو فرضی کہا تھا۔ اس لئے کہ صرف چڑیلیں تھیں جو انسانی خون کی پیاسی ہوتی تھیں اور وہ خون پی جاتی تھیں۔

مجھے یہ یقین کرنا اور تسلیم کرنا پڑا کہ..... ڈر نکولا کا وجود تھا..... وہ کوئی بدروح تھا۔

لیکن یہ کوئی بدروح نہ تھا۔۔۔۔۔ بدروح ہوتا تو ظاہر ہو جاتا۔۔۔۔۔ میں نے اس کا عکس آئینے میں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک مہذب انسان نظر آتا تھا۔۔۔۔۔ نہ تو اس کے دانت نوکیلے اور خون خوار تھے۔ عام آدمیوں کی طرح تھے۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر بعد وہ لڑکی کی لاش لائے اور اس کمرے میں ایک کھونٹی سے لٹکادیا اور چلے گئے۔ مجھے وہ جانور یاد آگئے جنہیں ذبح کرنے کے بعد لٹکادیا جاتا تھا کہ کھال اتاری جائے۔ اس وقت لڑکی کی لاش بغیر کھال کے تھی۔ اس کا گلایا گلابی چہرہ ترو تازہ تھا۔۔۔۔۔ لاش کی کھال بڑی نفاسٹ طریقے اور سلیقے سے اتاری ہوئی تھی۔

اس نے میز پر رکھا ہوا چھرا اٹھایا۔۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ ڈریکولا کی طرح۔۔۔۔۔ کسی خون آشام درندے کی مانند کچا کھانے لگے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے مختلف جگہ کے گوشت کاٹے اور ایک آدم خور کی طرح مزے لے لے کر قلعے سے نیچے اتارنے لگا۔

میں اگر مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو خوف و دہشت سے شاید بے ہوش ہو جاتا۔

میرے اعصاب مضبوط اور قوی اس لئے تھے کہ میں جنگل میں لرزہ خیز مناظر دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ جنگل میں درندوں کو نہ صرف ایسے جانوروں کو چیر پھاڑ کر کھاتے دیکھا تھا جو ان کے مقابلے میں کم زور اور بے ضرر سے تھے۔ وہ ان موذی درندوں کا بال تک بچا نہیں کر سکتے تھے۔ عام جانوروں کو درندوں کا چیر پھاڑ کر کھانا ایسا خوف ناک لرزہ خیز نہیں بھتا ان کا انسانوں کو کھانا۔۔۔۔۔

انسانوں کا شکار کر کے انہیں کھانا سب سے دل خراش منظر ہوتا تھا۔ جب وہ چیر پھاڑتے تو آتما لرز جاتی تھی۔ دو ایک مرتبہ تو میں بے ہوش بھی ہو گیا تھا۔ ایسا بھیانک منظر ایک آدمی دیکھنے سے رہا۔

میرے لئے ایک ایک بل کسی صدی کی طرح بھاری اور آہستہ تاک تھا۔۔۔۔۔ جب میں نے قدم بڑھایا

تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ساری طاقت سلب ہو کر رہ گئی ہو۔۔۔۔۔ بس اس میں خون خشک ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ ساری ہمت جواب دے چکی تھی۔ چوں کہ مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی ہے۔

مجھے اپنی زندگی سے زیادہ فکر اپنی بیوی اور لڑکیوں کی عزت اور جان کی فکر تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیوں اور کس لئے میری بیوی اور لڑکیوں کے حصول کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ان کیوں کا نشانہ بنائے۔۔۔۔۔ پھر ان کی قابل اعتراض قسم کی فلمیں بنائے۔۔۔۔۔ پھر اپنے ساتھیوں اور آدمیوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے حوالے کر دے۔۔۔۔۔ جب وہ جی بھرے کہ ان سے کھیل لیں تو ایک ایک کر کے انہیں ذبح کر دے۔ پھر ان کی کھال اتر کر ان کا کچا گوشت کھا جائے۔۔۔۔۔ خون پی جائے۔

مجھے ہر قیمت پر ان کی عزت اور زندگی بچانا تھی۔ انہیں تحفظ دینا تھا۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ اس شیطان نے سب سے خطرناک بد معاشوں کو میری بیوی اور لڑکیوں کے انگوٹھے کے لئے پیچھے لگا دیا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ میں اس کی شرط پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ اس شیطان نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری بیوی اور لڑکیوں کی فلم سپر ہٹ جائے گی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے گلا گھونٹ کر ختم کر دیتا۔

میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت جمع کی۔ میرے ہیر من من بھاری ہو رہے تھے۔ میرے لئے ایک ایک قدم آگے کرنا ایسا ہی تھا جیسے صدی کی مسافت طے کر رہا ہوں چوں کہ جان پر بنی تھی۔ اس لئے اپنے آپ کو جبر سے گھٹینا ہوائی کی طرف بڑھا۔

میں نے بہ مشکل چند قدموں کی مسافت طے کی ہوگی۔ دونوں خون خوار شکاری کتے اچانک جانے کہاں سے نکل کر یا میری بوسوگھ کر میری راہ میں حائل ہو گئے۔ میرا دل اچھل کر قلعے میں آ گیا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ پھر مجھے اچانک اس منتقل چڑی ناچ کا خیال آیا تو میں نے اسے نکال کر ان کی نظروں کے

سامنے لہرایا۔ اگر لحظہ بھر کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہ مجھ پر حمل آور ہو چکے ہوتے اور میری نکال پھینک دیتے۔

میں کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا ندی پر پہنچا۔ وہیں بارہ جدید ترین چھوٹی بڑی کشتیاں کنارے کھڑی تھیں۔ میں ایک موٹر بوٹ پر سوار ہو گیا۔ میں نے اس کا انجن اس لئے اسٹارٹ نہیں کیا تھا کہ رات کی خاموشی میں اس کی آواز پھرے دار سن لیتے۔ وہ اس وقت ممنوعہ فلم کی شوٹنگ دیکھ رہے تھے۔ اور پھر شیطان شاید ہوش میں آچکا ہو۔ وہ اس کی آواز سن کر چونک جاتا۔ پھر میں کئی کدورتیک لے آیا۔ پھر اس کا انجن اسٹارٹ کیا۔ پھر ایک سمت چل پڑا۔

مجھے نہیں معلوم تھا یہ رات کدھر جاتا ہے۔ منزل کون سی ہے۔۔۔۔۔ میں جھرمٹا اٹھا اور چلا جا رہا تھا۔ دل میں ایک خوف دامن گیر تھا کہ مجھے اچانک غائب پا کر میرے تعاقب میں کوئی بد معاش نہ آ رہا ہو۔۔۔۔۔ میں بار بار پلٹ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں بھٹکتا رہا۔ جب پوچھنے لگی تو مجھے دور سے نورسٹ کا گاڑ کا دفتر نظر آیا۔ جب سچ کا اقبال اچھل چکا تو دفتر جانے سے پہلے میں نے کتنی روک دی۔ بڑا دیکھا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ امریکی ڈالروں اور ہندوستانی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔ سو سو ڈالر کے سو نوٹ تھے اور ہندوستانی کرنسی دس ہزار روپے تھی۔ میں نورسٹ کا گاڑ کے دفتر جانے کے بجائے ایک ہوٹل میں آ گیا۔ ایک کمرہ لے کر سو گیا۔ دن کے اجالے میں گھر جانا میرے لئے خطرناک تھا۔ میں مغرب کے وقت ہزار روپے مجھے جانے کی طلب ہوئی تو میں نیچے آیا۔ بھوک کی آگ بھڑکی تھی۔ ہوٹل کا ہال خالی تھا۔ میں کھانا کھا رہا تھا تو اس وقت دو بد معاش کھانے کے ہال میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہ بنگلور شہر کے خطرناک غنڈے تھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ میری لاش اور تعاقب میں آئے ہیں۔ یہ میری غلط فہمی تھی۔ ان دونوں نے کھانے کا آرڈر دیا۔ ویٹر جب آرڈر لے کر چلا گیا تو ایک بولا۔

”یار جنتندر! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس

بلک ٹائیگر کو کہاں تلاش کریں؟ حرام زادہ مر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ریش۔۔۔۔۔! وہ اپنی محبوبہ کو تانے پٹنے اور اس کی مزاج پر سی کے لئے جاتا رہتا ہے۔“

”اب ہمیں بہت ہوشیاری سے ایسا منصوبہ بنانا ہے کہ وہ بچ نہ سکے۔“ ریش نے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ اب نہیں بچ سکے گا۔“ جنتندر بولا۔ ”ہم اس کی کار میں بم نصب کر دیں گے۔ جب وہ گاڑی اسٹارٹ کرے گا تو ریوٹ سے اڑا دیں گے۔“

”لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ راہ گیر، غور تیش اور بچے اس دھماکے سے متاثر ہوں۔“

”بلا سے۔۔۔۔۔ وہ مرتے ہیں مرنے دو۔۔۔۔۔“ جنتندر نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”باس نے کیا کہا۔۔۔۔۔ ٹائیگر کو موت کے گھاٹ اتارتے وقت یہ مت دیکھو کہ۔۔۔۔۔ ساتھ میں کون رو رہا ہے۔“

”وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ میری ساعت غیر معمولی طور پر تیز ہے۔ ان کا منصوبہ اور باتیں سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں ساکت و جاہد ہو گیا۔ خون رگوں میں نچھو رہا گیا۔ میری نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور ذہن ماؤف ہو گیا۔ میری کچھ کچھ میں نہیں آیا۔ جب نظروں کے سامنے سے تار کی چھٹی تو میرا معطل دماغ کسی قابل ہوا۔۔۔۔۔ مجھے اچانک تمہارا خیال آیا۔ میں نے ان کی گفتگو میں تمہارا نام سنا۔ یہ جان کر کہ تم بنگلور میں ہو اور وہ شیطان تمہیں ختم کرنے کے لئے تمہارے تعاقب میں بد معاشوں کو لگا رکھا ہے مجھے اس خیال سے ڈھارس بندھی۔ پھر میری جان میں جان آئی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ میں تمہیں شاید بتا چکا ہوں کہ میں اس شیطان کے ہاں سے فرار ہوتے وقت اس کا بوڑا اور ہیروں کی انگوٹھیاں لے آیا تھا۔ میرے پتا کی سار تھے۔ میں نے تین برس اس دکان میں کام کیا تھا جس میں پتا کی بیلز میں تھے۔ مجھے ہیروں اور سونے کی پہچان ہے۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ایک انگوٹھی ڈیڑھ لاکھ کی مالیت سے کم کی نہیں ہے۔

میں نے گھر آ کر تم کی کتنی کی۔ اس رقم میں ڈالر زیادہ اور ہندوستانی کرنسی کم تھی۔ میں سیدھا گھر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہو گئی کہ ہاتھ نہیں ملتا۔ وہ مجھ سے مل کر خوب روئیں۔ پھر میں نے اپنی چٹی کو بتا دیا کہ بد معاشوں نے کیا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ لڑکیوں نے بھی یہ سب سن لیا تھا۔ ان کی خوشی، غم، پریشانی اور خوف و دہشت میں بدل گئی۔ میں نے ڈھارس دی کہ میں ٹائیگر کو تلاش کرتا ہوں۔ چٹی نے خیال ظاہر کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر سے مجھے اغوا کر لیا جائے۔ ہم نے منصوبہ بنایا کہ کسی نہ کسی طرح راتوں رات کسی بس، کو چڑھ کر یا ریل گاڑی سے چنائے چلے جائیں۔ لیکن جان نہ سکے۔ کیوں کہ دیکھا کہ مکھڑوں قسم کے بد معاش ہمارے گھر پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ہم گھر میں قید ہو کر رہ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آپ سے کیسے رابطہ کر دوں یا ہم فرار ہو جائیں۔ دیکھو بھگوان کا کرنا۔ آپ اوتار بن کر آ گئے۔

”میں بروقت پہنچ گیا ہوں۔“ ٹائیگر نے دلاسا دیا۔ ”اوپر والے نے چاہا تو کسی پر آج نہیں آئے گی۔ پریشان مت ہو۔ میں ان دونوں بد معاشوں سے نمٹ لوں گا۔ ان کے ارمان خاک میں مل جائیں گے۔“

”بھیا۔۔۔ جتنا جلد ہو سکے ہمیں چنائے پہنچا دو۔“ اردو گڑ گڑایا۔ ”ہم آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔“

”طمینان رکھو اردو!۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”تم مجھے وہاں کا نقشہ بنا کر دے دو تاکہ میں اس کی مدد سے پہنچ سکوں۔“

”میں نقشہ بنائے دیتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن بہت آسان ہے۔۔۔۔۔ شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔ میں آپ کو اتنا بتائے دیتا ہوں۔ اس شیطان کی گہری مثال مغرب میں سو میل اندر ہے۔ دریا جو ہے وہ ایک انتہائی گہنجاں اور تاریک جنگل سے گزرتا ہے۔ جنگل کے درندوں کی دہاڑ سنائی دیتی ہے۔ لیکن وہ کنارے نظر نہیں آتے ہیں۔ پچیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جنگل ختم ہو جاتا ہے۔ پھر دور سے شیطان کی گہری نظر

آتی ہے جو وہاں سے چھ سات میل دور واقع ہے۔ رات کے وقت اس میں جو دو تین عمارتیں ہیں ان کے کمروں میں روشنی دکھائی دے گی۔ یہ شیطانی ٹمرا ایک گلوٹیل کے جڑ پرے پر آباد ہے۔“

”وہ منٹل چمی بیج مجھے دے دو۔ کیوں کہ اب وہ تمہارے کسی کام کا نہیں ہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔

”میں آپ کو پیش کرنے والا ہی تھا۔“ اردو نے کہا۔ ”یہ بڑے کام کی چیز ہے۔۔۔۔۔ مجھے ایک ملازم نے بتایا تھا کہ یہ ایک طرح سے طلسماتی بیج ہے۔ صرف اس گہری کے کتے ہی جنگل کا ہر درندہ اسے دیکھتا ہے تو وہ جیسے غلام بن جاتا ہے۔ معلوم نہیں اس بات میں کتنی چٹائی ہے۔ لیکن خون خوار شکاری کتوں کا حملہ آور ہونا بیج ہے۔ کیوں کہ میں اسے خود آزمایا تھا۔۔۔۔۔ شاید اس میں ایسا کوئی طلسم یقیناً ہوگا جو درندوں کو منطج بناتا ہے۔“

اردو نے الماری میں سے بیج نکال کر ٹائیگر کی طرف بڑھادیا۔

ٹائیگر نے اس منٹل بیج کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منٹل چمی بیج کو جیب میں رکھنے کے بعد کہا۔

”اس میں یہ جو عجیب و غریب نقش و نگار ہیں اس میں کوئی ایسا اسرار اور طلسم ہے جو درندوں کو سمجھ کر دیتا ہوگا۔ تاہم اس کی افادیت اور طلسم سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی سنیاہ یا کاحر اس میں پوشیدہ ہے۔۔۔۔۔ ایسے کتے بیج وہاں ہیں۔۔۔۔۔ کل کتے لوگوں کے استعمال میں ہیں؟“

”کل سات عدد لوگ ہیں جن کے پاس ہیں۔“ اردو نے بتایا۔ ”قلم اسٹوڈیو کے منجیر نے مجھے بتایا تھا کہ اس چمی بیج کے نقش و نگار میں سے ایسی شےیں خارج ہوتی ہیں جو درندوں کو سمجھ کر دیتی ہیں۔“

”ٹائیگر نے جیب سے بیج نکال کر اس کے نقش و نگار کو دیکھا۔ بڑی دیر تک دیکھنے کے بعد اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی اس میں

حیرت سے دیکھا۔“ یہ کیا؟“

”یہ بھی پال کا بیٹا ہے جو میں نے اسے زخمی کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالا تھا۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”اس میں برٹش پوٹو، ڈالر اور ہندوستانی کرنسی آٹھ ٹینک کے برابر ہے۔۔۔۔۔ یہ لاکھوں کی رقم بنتی ہے۔ اسے رکھ لو۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ اردو بولا۔ ”نہیں بھیا نہیں۔ میں اس شیطان کا جو بیٹا اور انگوٹھیاں لایا ہوں وہ اتنی بڑی رقم ہے۔۔۔۔۔ انگوٹھیوں کی مالیت لاکھوں کی ہے۔۔۔۔۔ میں اس رقم سے اپنی بیٹیوں کی شادیاں دھوم دھام سے کر کے بھی جانے کتنے برس تک پرورش زندگی گزار سکوں گا۔ اصل دولت تو سکون ہے۔ وہ مجھے مل گئی ہے۔ بلکہ ملنے والی ہے یہ آپ کی ملکیت ہے۔ اس پر آپ کا حق ہے۔ پلیز۔۔۔۔۔ آپ رکھ لیں۔“

”میرے پاس اللہ کا دیا اتنا ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ ٹائیگر نے بیٹا اس کے بجائے بڑی بیٹی کو دیتے ہوئے کہا۔

”وہاں جا کر اس رقم سے ایک مکان خرید لیتا۔ پھر بچپوں کی شادی دھوم دھام سے کرتا۔ یہ مکان تو سرکاری کوارٹر ہے۔ اب چوں کہ تم مکان کو خیر باد کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ سر چھپانے کے لئے جگہ بھی تو چاہئے۔ اور۔۔۔۔۔“

ساروہنے آ کر کہا۔ ”یہ دونوں بد معاش کون ہیں جوگی کے کتے پر کھڑے ہوئے ہمارے کوارٹر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔“

پھر ٹائیگر اور اردو اکٹری کے پاس گئے۔ پھر وہ سر کا کر دیکھا تو اردو نے کہا۔

”یہ دونوں۔۔۔۔۔؟“ ان میں سے ایک جتندر ہے اور دوسرا ریش۔۔۔۔۔“

کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اردو، اس کی بیوی اور لڑکیوں کے چہرے فٹ ہو گئے تھے۔

”رات ہمارے ہاں مہمان قدم و خجہ فرمانے لگے

ہیں۔“ ٹائیگر نے خوشی سے کہا۔ ”ان کا سواگت نہ صرف بڑی گرم جوشی سے بلکہ والہانہ انداز سے ہونا چاہئے۔ ایسا استقبال کہ گھر آیا ہوا مہمان جان سکے۔“

”لیکن بھیا!۔۔۔! سادھنا بولی۔“ ابھی رات کے آنے میں خاصی دیر ہے۔۔۔ کیوں نہ ہم عقبی راستے سے نکل جائیں؟“

”یہ مہمان نوازی کے اصولوں کے خلاف ہے۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”آپ لوگ دیکھیں گے میں ان کی کیسی خاطر مدارت کرتا ہوں۔ وہ زندگی بھر کسی کو بھولیں گے نہیں کہ ان کا کیسا سواگت کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔ نہیں بولیں۔۔۔۔۔ اور پھر جلدی کافی بنا کر لائیں۔“

رات کے دس بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت اروندا اور ٹائیگر کمرے میں اندھرا کئے کھڑکی کی اوٹ سے باہر جھانک رہے تھے۔ انہوں نے گلی کے کنارے پر جو اسٹریٹ لیمپ تھا اس کی روشنی میں گھر کی سمت آتے دیکھ لیا تھا۔ ٹائیگر نے پہلے ہی اروندا کی بیوی سادھنا سے کہہ رکھا تھا کہ دستک ہونے پر وہ سوال و جواب کرتی رہے۔ وہ جب تک اسے اشارہ نہ ملے دروازہ نہ کھولے۔

”کون ہے۔۔۔؟“ سادھنا نے تیز آواز میں پوچھا۔

”اروندا صاحب۔۔۔۔۔! تشریف رکھتے ہیں۔“ باہر سے رمیش نے کہا۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔“ سادھنا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ کسی کام سے تین ماہ سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون ہیں؟“

”ہم ان کے دوست ہیں۔۔۔۔۔ میرے ساتھ ان کے دوست بھی ہیں۔“ رمیش بولا۔ ”میرا نام بچن ہے اور دوسرے کا نام راج کمار ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“ سادھنا نے سابقہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے بھی آپ دونوں میں سے کسی کا نام نہیں سنا۔“

”ہم ان کے آفس کے دوست ہیں۔۔۔۔۔ فیجر

ٹورسٹ گائیڈ نے ان کی دو ماہ کی تنخواہ سمجھی ہے۔۔۔۔۔ دینے آئے ہیں۔“

”آپ دروازے کے نیچے سے لفافہ اندر ڈال دیں۔ سادھنا بولی۔

”شریستی جی!۔۔۔! اس کی رسید بھی تو لینی ہے۔“ رمیش نے کہا۔

”میں رسید بھی نیچے سے ڈال دوں گی۔“

”ہمیں معلوم نہیں آپ کون ہیں۔۔۔۔۔؟ کم از کم شکل دیکھ کر فیجر صاحب کو بتائیں۔“

”ٹائیگر نے اشارہ کیا تو وہ بولی۔“ ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں دروازہ کھول کر آ رہی ہوں۔ ایک منٹ۔۔۔۔۔“

ٹائیگر کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس نے اروندا کی تینوں لڑکیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کمرے میں آ جائیں۔

”جب وہ لڑکیاں آگئیں تو سادھنا نے دروازہ کھول دیا۔ رمیش دروازہ کو دھکا دیتا ہوا اندر گھس گیا۔ اس کے پیچھے چند تھا۔ اس نے دروازہ بند کر کے چٹنی لگا دی۔

رمیش نے ان چاروں کو یو لور کی زد میں لے لیا۔

”خبردار۔۔۔۔۔“ وہ مسخاک لہجے میں بولا۔ ”اگر تم میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو میں اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

”یہ کھلونا آپ کس لئے لائے ہیں۔۔۔؟“

میرے پتی کی تنخواہ والا لفافہ کہاں ہے۔۔۔؟“

”میرے پاس ہے۔“ چند نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ ”کھلونا تو میں بھی لایا ہوں۔“

”ہمیں کھلونے سے کیا لینا ہے۔۔۔۔۔ تنخواہ سے مطلب ہے۔۔۔۔۔ میرے پتی تین ماہ سے پراسرار طور پر لاپتا ہیں۔ تنخواہ گھر نہ آنے سے ایک ماہ تو پڑوس اور محلے والوں سے قرض لے کر گزارہ کیا۔۔۔۔۔ لیکن اب کوئی بھی قرض دینے کو تیار نہیں۔ ہم قافلوں سے زندگی گزار رہے ہیں۔ پلیز۔۔۔۔۔ تنخواہ لائے ہیں تو دے دیں۔

آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔“

”ہم کرپا ہی تو کرنے آئے ہیں۔۔۔۔۔“ رمیش نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔

پھر وہ اور چند نے اپنی اپنی جیب سے کلورو فارم میں بھیکے ہوئے رومال نکالے۔ وہ ماں اور بیٹیوں کی طرف بڑے تو ٹائیگر نے کمرے سے باہر آ کر کہا۔

”ڈیجرج رکھیں۔۔۔۔۔ میرے سرکار۔! کیا آپ یہ معطر رومال سونگھا کر ان سے اظہار محبت کرنا چاہتے ہیں۔“

وہ دونوں ٹائیگر کو دیکھ کر اس کی آواز سن کر ہنک پڑے۔ ”کون ہو تم۔۔۔؟“ رمیش دھاڑا۔

”نار۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”یہ کھلونے کیوں لائے ہو۔۔۔۔۔ کیا تمہاری عمر ہے کھلونوں سے کھیلنے کی۔۔۔۔۔ کھلونا تو میرے پاس بھی ہے۔“ ٹائیگر نے جیب سے پستول نکالا۔ وہ کھلونا پستول تھا جس میں نیچے بالی بھر کر پککاری مارتے ہیں۔“

”یہ کھلونا۔۔۔۔۔ جیب میں رکھ لو۔۔۔۔۔ چند نے فحشیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”خاموشی سے کھڑے ہو جاؤ۔ تم میں سے کسی نے شور مچایا تو اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔ میری بات کو مذاق مت سمجھو۔۔۔۔۔“

”گلتا ہے کہ تم دونوں بے وقوف نمبر ایک ہو۔ گمہ ہے ہو۔۔۔۔۔ تمہاری عقل گدی میں ہے۔ ذرا بھی عقل ہوتی تو اس میں سائی لیسر لگا کر لے آتے۔۔۔۔۔ رات کا وقت ہے۔ کیسا سنا اور چاروں طرف خاموشی بھائی ہوئی ہے۔ فائر کی آواز کی گونج تو اڑوس پڑوس ہی نہیں بھٹکے میں گونج جائے گی۔ لوگ گھروں سے نکل آئیں گے۔ سوچ لو۔۔۔۔۔“

”پہلے اس کا منہ بند کرو۔۔۔۔۔ یہ مسخرہ جانے کون سنا رہا ہے۔۔۔۔۔“ رمیش گرجا۔

”چند۔۔۔۔۔ ٹائیگر کی طرف بڑھا تو ٹائیگر نے فوراً ہی جیب سے کھلونا پستول نکال لیا۔ چند کے ہاتھ ہاتھ میں ریو لور تھا اور دائیں ہاتھ میں کلورو فارم میں بھیکے ہوئے رومال۔ اس وقت رمیش نے سادھنا اور لڑکیوں کو ریو لور کی زد میں لیا ہوا تھا۔

جیسے ہی چند اس کے قریب آیا تو اس نے چشم زدن میں نہ صرف چند کے ہاتھ پر بلکہ رمیش کے ہاتھ پر پککاری ماری۔۔۔۔۔ ان کے ہاتھوں سے ریو لور چھوٹ کر فرش پر گر پڑے۔۔۔۔۔ ان دونوں نے ایک جی ماری۔ چند کے ہاتھ سے کلورو فارم والا رومال نیچے گر گیا۔ وہ دائیں ہاتھ سے پایاں ہاتھ پکڑ کر کراہنے اور تڑپنے لگے۔

ان کے ہاتھ جھل گئے تھے۔ ٹائیگر کے کھلونے پستول میں تیزاب بھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ان دونوں نے تکلیف سہتے اور کراہتے۔۔۔۔۔ غصے سے ریو لور اٹھانے پڑے۔۔۔۔۔ ٹائیگر نے پہلے تو ایک زوردار لات رمیش کے سینے پر رسید کی تو وہ اپنا توازن قائم نہ کر سکا۔ دو تین قدم لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا اور ریو لور سے ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔۔۔۔۔ چند کے ساتھ بھی ٹائیگر نے وہی سلوک کیا۔ اس کے سینے پر لات مارنے کے بجائے اس کے لمبے بالوں کو پکڑ کر اسے زور سے دیوار کی چوٹ پر مارا کہ اس کی چوٹ برداشت نہ کر سکا۔

سادھنا نے اور اس کی بڑی بیٹی نے فرش پر ریو لوروں کے گرے ہی انہیں اٹھالیا تھا۔ دونوں فرش پر بے ہوش پڑے تھے۔ پھر اروندا باکی لئے کمرے میں آ گیا۔۔۔۔۔ ٹائیگر نے اس سے کہا تھا کہ وہ صورت حال ہاتھ سے نکلے دیکھ کر کمرے میں آ کر ان دونوں بدعاشوں کے سر چھاڑ دے۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ان دونوں نے مل کر جلدی جلدی ان کی مشکلیں کر سی پر کس دیں اور ان کے منہ پر وہی شپ چپکادیئے جو وہ ساتھ لائے تھے کہ سادھنا اور اس کی جوان لڑکیوں کے منہ پر چپکادیں گے۔

معاملہ الٹا ہو گیا تھا۔ انہیں لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ ماں اور بیٹیاں خوش ہو گئی تھیں۔ اروندا بھی خوشی سے زیادہ تجر زدہ تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ بازی الٹ بھی سکتی ہے۔ یہ خطرناک بدعاش اس آسانی سے قابو میں آ سکتے ہیں۔ ٹائیگر بازار جا کر تیزاب اور کھلونا پستول لے آتا تھا تو اروندا اور ماں بیٹیوں کی بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ٹائیگر ان سے

کیا کام لے گا۔ جب اس نے ٹائیگر سے کہا کہ ریوا اوروں کے مقابلے میں یہ پستول کیا کام دے گا۔ ٹائیگر اس کی بات سن کر مسکرا دیا تھا اور کہا تھا۔ ”بس..... تم خاموشی سے ایڈوچر فلم دیکھو.....“

آج کے اخباروں میں مہی پال کی خبر بھی چھپی ہے کہ اس کے کسی دشمن نے اس کے سر پر اتنے زور سے پتھر دے مارا کہ اس کا سر کھل گیا..... وہ بے ہوش کی حالت میں ہے..... کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ وہ کتنا عرصہ بے ہوش رہے گا..... حکومت نے اس کے سر کی قیمت پانچ لاکھ روپے رکھی تھی..... وہ بڑا خطرناک مجرم تھا..... اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے..... وہ پولیس کو دس افراد کے قتل..... اور کم عمر لڑکیوں کی بے حرمتی کے علاوہ..... عورتوں کے اغوا کے جرم میں مطلوب تھا۔ حکومت اس شخص کو انعام دینا چاہتی ہے جس نے مہی پال کو بے ہوش کی نیند سلا دیا۔

”تو آپ کیا پانچ لاکھ کی انعامی رقم حکومت سے لیں گے؟“ سادھنا نے پوچھا۔

”نہیں.....“ ٹائیگر نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو کیا اتنی بڑی رقم نہیں لوگے.....! جب کہ یہ انعامی رقم ہے۔“ اردونا حیرت سے بولا۔

”اس لئے کہ یہ پولیس کی ایک چال ہے.....“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”وہ انعام کا جھانسہ دے کر گرفتار کرنا چاہتی ہے..... اس پر قاتلانہ حملے کا جھانسہ دے کر اندر کر دے..... میں حکومت اور پولیس کی شطرانہ چالوں کو خوب سمجھتا ہوں۔“

”اب ان مہمانوں کی کیا خاطر مدارات کی جائے؟“ اردونا کی بیٹی شمشان نے ٹائیگر سے پوچھا۔

”پہلے تو انہیں ہوش میں لانا ہے..... پھر ان کی پریشانی دھت کرنی ہے.....“ ٹائیگر بولا۔ ”کتنی خوشی کی بات ہے کہ یہ ہم آسانی سے سر ہو گئی..... جس کی توقع نہ تھی..... جتنی بھی قاتل، ڈکیت، درندہ صفت اور وحشی ہے..... اس کے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ میں اس کے پاس کوہر پرائزد دینا چاہتا ہوں۔“

پھر ان دونوں کو ہوش میں لانے کی تدبیر بھی ٹائیگر کرنے لگا۔ ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد کیے بعد دیگرے ہوش میں آتے گئے۔ ایک ہاتھ جھلس جانے کے باعث انہیں تکلیف اور درد ہونے لگا تو وہ کسمسانے اور ترترنے لگے۔ چون کہ ان کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا اس لئے منہ سے کراہنے کی آواز نکلی نہیں پاری تھی۔

جب وہ پوری طرح ہوش میں آ گئے تو انہوں نے منظر دیکھا وہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آیا۔ خوف و وحشت سے ہتھی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے..... ان کے ریوا اور ایک عورت اور جوان لڑکی کے ہاتھ میں تھے ان کی نظروں کے سامنے اردونا تھا جس کا شیو کی دونوں بازو ہوا تھا جسے وہ پہچان نہ سکے۔ ٹائیگر کو دیکھا تو بری طرح چوٹے..... ایسا لگا جیسے کوئی ڈراؤنا پسنا دیکھ رہے ہوں..... اس وقت انہوں نے ٹائیگر کو پہچانا نہیں تھا۔ اس لئے ان کا سارا دھیان عورت اور لڑکیوں کی سندرتا کی طرف تھا۔ اور پھر وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ٹائیگر یہاں ہوگا..... یوں بھی اس وقت ٹائیگر نے نفی میں سر ہلایا اور داڑھی اور مونچھیں سامنے والی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس وقت کمرے میں جو چھ افراد تھے انہیں موت کے فرشتے دکھائی دے رہے تھے تھے..... دو عورتوں کے ہاتھ میں ریوا اور اردونا کے ہاتھ میں اسٹک تھی۔ ٹائیگر کے ہاتھوں میں کھلونا پستول جو صوب سے خطرناک ہتھیار تھا..... گولی سے کہیں خطرناک..... گولی سے تو آدمی فوراً مر جاتا ہے..... لیکن تیزاب جو جلن، تکلیف..... درد دیتا اور جھلسا دیتا ہے انہیں اب اس کا احساس ہو رہا تھا..... ان کا ہاتھ جو بندھا ہوا تھا..... جو جھلس گیا تھا..... اس کی تکلیف ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔

ان دونوں نے اپنا پورا زور صرف کر دیا تھا کہ اپنا متاثرہ ہاتھ چھڑالیں..... ریبوں سے آزاد کر لیں۔ وہ جیسے ہی اسے آزاد کرنے کی کوشش کرتے جیسے ان کی جان

نکل جاتی۔ ان کی کراہیں سینے میں گھٹ کر رہ جاتیں۔ وہ جوڈ جینٹل کیکر لائے تھے سامنے والی میز پر رکھے ہوئے اس کے علاوہ ان کے بڑے لارچا تو بھی.....

”میں سب سے پہلے بن بلائے مہمانوں سے سب کا تعارف کرادوں.....“ ٹائیگر کہنے لگا۔ ”یہ مسٹر اردونا ٹرسٹ کا مینیجر..... جسے اس شیطان پاس نے اسے ہراساں اور وحشت زدہ کر کے اس کی بیٹی اور لڑکیوں کو بھی اغوا کر کے ریوا ل بنالے تاکہ ان کی عزت سے کھیلے اور ان کی معنویت فہمیں بنائے۔ پھر قتل کر دے یعنی ذبح..... پھر خون پی کر اردونا کی کھال اتروا کر کچا گوشت اور بوٹیاں حرنے لے لے کر درندے کی طرح کھا جائے..... ان کی بیٹیاں اپنے خون خوار شکاری کتوں کو کھلا دے..... تمہارا پاس آدم خوروں سے بھی بڑی کڑھ ہے..... آدم خور بھنا ہوا انسانی گوشت کھاتے ہیں..... درندوں کا بھی.....“

قسمت نے ساتھ دیا، اردونا وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو کر دس دن پہلے گھر پہنچ گیا..... تم دونوں نے دس دن پہلے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر پروگرام بنایا اردونا کے گھر میں کس کس طرح پوائنٹ پر اس کی بیوی اور لڑکیوں کو رہنا ل بنایا جائے..... ان کے منہ پر ٹیپ چپکا کر یہ صرف دل کے ارمان نکالے جائیں اور بلیک میل کرنے کے لئے عربیاں حالت کی تصویر اتاری جائیں..... لیکن انہوں کی بازی الٹ گئی..... یہ لڑکیاں تمہارے رحم و کرم پر ہونے کے بجائے اب تم ان کے رحم و کرم پر ہو.....

مجھے بھی تم سے اپنا حساب کتاب کرنا ہے..... تم دونوں نے پریس کلب کے باہر حملہ کیا۔ اس غریب صحافی ہمت نے میری زندگی بچانے کے لئے ایثار، ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ڈنچی ہو گئی۔ اس کی زندگی بھی جو جھل گئی۔ میں اس کا بدلہ اور انتقام نہ صرف تم دونوں بلکہ تمہارے شیطان پاس سے بھی لوں گا..... میں اپنے دشمن کو معاف کرنا نہیں چاہتا ہوں۔

تم دونوں پیشہ ور اور سفاک ترین قاتلوں میں سے ہو..... اور ہاں تم دونوں نے اپنی مجرمانہ زندگی میں اجرت سنے کر کچھ لڑکیوں اور عورتوں کے چہروں اور جسموں پر

صحیح طریقہ

ایک صاحب اپنی گاڑی میں بیٹھے آرام سے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کی بیگم پسینے میں شرابور گاڑی کی سروس میں مصروف تھیں۔ اتنے میں اتنا کا ایک دوست گھر آیا اس نے جب یہ منظر دیکھا تو ان صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔ تم یہ کام کس طرح اپنی بیوی سے کرانے میں کامیاب ہوئے۔ ان صاحب سے لاپرواہی سے منہ سے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔ معمولی سی بات ہے ایک دن میں نے بیگم سے کہا جب میں گاڑی سروس کرتا ہوں تو میرا وزن ایک پونڈ کم ہو جاتا ہے۔ بس اسی دن سے یہ کام بیگم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔

(ٹائیگر محمد عظیم رضوی۔ کھاریاں کینٹ)

تیزاب پھینکا..... تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ تیزاب سے کتنی تکلیف ہوتی ہے..... اب تمہارے ہاتھ کا کچھ حصہ جل گیا تو معلوم ہو رہا ہوگا کہ یہ تکلیف کیسی ہوتی ہے.....

تم قانون کے ہاتھوں سے اس لئے بچتے رہے ہو کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت اور عینی گواہ نہیں تھا..... تم دونوں نے عینی گواہوں کو بھی دنیا سے رخصت کر دیا..... تمہارے جرائم کی فہرست ایک اخبار کے کرائم رپورٹر نے دی تھی۔ تم دونوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا جو ناکام ہو گیا تھا..... اتفاق سے ایک کرائم رپورٹر نے تم دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ میں تم دونوں کی تلاش میں تھا۔ حالات کے چکر نے تم سے ملا دیا۔

ٹائیگر نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔

”تم دونوں کے جرائم ناقابل معافی ہیں..... عدالت تم دونوں کو جو سزا دے گی وہ ایسی نہ ہوگی جس کے تم دونوں مستحق ہو..... سزا تمہیں میں دوں گا.....“

فیصلہ میں سناؤں گا۔۔۔۔۔ تم دونوں یہ بھول گئے کہ اوپر والے کے ہاں دیر ہے۔۔۔۔۔ اندر نہیں۔۔۔۔۔ میں تم دونوں کو گولی مار کر ہلاک نہیں کروں گا۔ اس لئے کہ گولی سے فوراً مر جاؤ گے یا کچھ دیر تڑپ کر۔۔۔۔۔ لیکن میں تو ایسی سزا دینا چاہتا ہوں کہ برسوں تک ایڑیاں لرزٹے رہو۔۔۔۔۔ موت مانگو تو موت نہ ملے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ کوئی سزا نہیں ہے۔

میرے خیال میں یہ کھلونا پستول تم دونوں کو سزا دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ چاروں باری باری تم دونوں پر پستول چلائیں گی۔ شاید تم نے سنا ہوگا کہ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔۔۔۔۔ یا کوئل کا۔۔۔۔۔

چاچی! پہلے آپ آئیں۔۔۔۔۔ سب سے پہلے آپ پچکاری ماریں۔۔۔۔۔ سب ہی باری باری پچکاری ماریں گی۔۔۔۔۔ اس بات کا خیال رکھیں ایک آنکھ ضائع ہو۔۔۔۔۔ پورا چہرہ جھلس جائے۔ ہاتھ پیر اور جسم جھلس جائے۔ کوئی حرج نہیں۔۔۔۔۔ ان سے ذرہ برابر رعایت نہ ہو۔۔۔۔۔

جنتدر اور ریش یہ سن کر زخمی پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے اور تڑپنے لگے۔۔۔۔۔ اول غول کرنے لگے۔۔۔۔۔ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

ٹائیگر نے کہا۔۔۔۔۔ ”موت دیکھ کر کیا بھگوان یاد آ رہا ہے؟ سزا ملتی ہے ل کر رہے گی۔“

”کیا یہ بہت ہی بھیانک عبرتناک اور انتہائی تکلف دہ سزا نہیں؟“ سادھنا بولی۔ ”یہ کیا برداشت کر سکیں گے۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ ٹائیگر کہنے لگا۔

”اگر ان کی جگہ کوئی درندہ ہوتا تو اسے اتنی بھیانک سزا نہیں دی جاتی۔۔۔۔۔ یہ انسان ہیں۔۔۔۔۔ درندہ صفت۔۔۔۔۔ شقی القلب۔۔۔۔۔ ان کی انسانوں پر جو بربریت کی گئی آپ اس کا تصور تو کیجئے۔ انہوں نے سات دس برس کی معصوم بچیوں کی عزت لوٹی۔۔۔۔۔ درندگی کی۔۔۔۔۔ شادی شدہ عورتوں کو نہیں بخشا۔ اور پھر ان دونوں

حرام زادوں نے لڑکیوں عورتوں پر بھی محض چند روپوں کے عوض تیزاب پھینکا۔۔۔۔۔ اور اس کے علاوہ قتل اور خون خرابا بھی کیا۔ کیا یہ کسی رعایت اور معافی کے مستحق ہیں۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔“ ماں اور بیٹیوں نے بیک وقت یک زبان ہو کر کہا۔

”آپ آج کے روز کا تصور کریں۔ یہ آپ کی عزت سے پھیلنے اور تقویٰ میں اتارنے آئے تھے۔ اگر آپ چاروں پر قیامت گزر جاتی تو کیا محسوس کرتیں؟ کیا آپ انہیں معاف کر دیتیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“

”تو پھر اس شہ کا کام میں دیر کیوں؟ کس بات کا انتظار ہے۔۔۔۔۔“

”تو یہ ریش تھا۔۔۔۔۔؟“ سادھنا کا چہرہ نفرت اور غصے سے تھما گیا۔ اس کی آنکھیں شعلہ برساں لگیں۔ وہ زہر ناک لہجے میں بولی کیوں نہ میں رسوئی سے چھری لا کر اس کا سر تن سے جدا کر دوں۔۔۔۔۔ پھر اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں اور چیلوں کو کھلا دوں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ سشما بولی تو اس کی زبان کا پھٹنے لگی تھی۔ ”ان دونوں کے ساتھ اس سے بھی کہیں بربریت کرنی چاہئے۔۔۔۔۔ ماں جی۔۔۔۔۔ رسوئی سے چھری لے کر آتی ہوں۔“

”جب وہ رسوئی کی طرف بڑھی تو ٹائیگر نے لپک کر اس کی ہانہ پکڑ لی تو وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مجھے جانے دیں۔ میں اسے ذبح کر کے اس کا خون پی جاؤں گی۔“

”سشما! اجنباتی نہ ہو۔۔۔۔۔ اصل سزا نہیں ہے۔ تھوڑی دیر کے مہمان رہیں گے۔۔۔۔۔ ان کا چہرہ اور جسم جھلسا دینے سے یہ مر مر کے جیتے رہیں۔۔۔۔۔ جن اور تکلیف۔۔۔۔۔ انہیں اذیت۔۔۔۔۔ تکلیف اور عذاب دینی رہے گی۔۔۔۔۔ ایک گھڑی، ایک دن نہیں۔۔۔۔۔ ہفتوں اور مہینوں۔۔۔۔۔ اس وقت تک جب تک موت نہیں آ جاتی۔

ایک لمحہ صدی سے کم نہیں ہوگا۔

سب سے پہلے سادھنا کھلونا پستول لے کر ریش کی طرف بڑھی۔۔۔۔۔ ریش اچھلا۔۔۔۔۔ سر ہلانے لگا۔ سادھنا نے سب سے پہلے اس کے چہرے پر پچکاری ماری۔۔۔۔۔ پھر اس کے جسم پر۔۔۔۔۔ پھر اس کے جسم کے سب سے نازک حصے پر۔۔۔۔۔ وہ بے آب مایہ کی طرح تڑپنے لگا۔۔۔۔۔ پھر جنتدر کو اس نے اسی طرح نشانہ بنایا۔ پھر ان چاروں نے۔۔۔۔۔ وہ دونوں خوف و وحشت، درد اور تکلیف کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو چکے تھے۔

”کیا یہ دونوں مر گئے؟“ سشما نے انہیں بے حس و حرکت دیکھ کر پوچھا۔

”یہ بے غیرت۔۔۔۔۔ درندے۔ اتنی جلدی اور اے مرنے سے رہے۔“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”یہ جلس جانے کے باعث بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد دیکھنا کیسے تڑپتے ہیں۔ انتقام اور کینہ گردار تک پہنچانے کی آتش پوری ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہم یہاں سے چلنے کی تیاری کرتے ہیں۔“

گھر میں فون تھا۔ ٹائیگر نے ریسور اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے کسی نے ہیلو کہا تو وہ بولا۔

”آننگار جی۔۔۔۔۔! دو بارسل ہیں۔ جلدی سے آ کر لے جاؤ۔ کسی دیر نے میں ٹھکانے لگاتا ہے۔“

”دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

دس منٹ میں آننگار اپنے ایک ساتھی کے ساتھ پہنچ گیا۔ وہ ایک بڑی گاڑی لے کر آیا تھا۔ وہ طویل القامت خوش اخلاق تھا۔ اس نے اردو، سادھنا، لڑکیوں اور ٹائیگر کو تسکین دیا۔ پھر اردو اور ٹائیگر سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”مجھے خبر مل گئی تھی آپ آئے ہیں۔۔۔۔۔ براہِ شرم نے بتایا تھا۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔“

”اس کے ساتھی نے بھی جیرو دی کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو بڑے تھیلے تھے۔

”یہ دونوں کون ہیں۔۔۔۔۔؟“ آننگار نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے مسخ ہو گئے تھے۔

”یہ ریش اور جنتدر ہیں۔“ ٹائیگر نے بتایا۔ ”یہ دونوں شب خون مار کر عزت سے کھینچے آئے تھے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ بہت اچھا کیا۔ یہ حرامی زندہ ہیں یا مر گئے؟“

”زندہ ہیں۔۔۔۔۔ بے ہوش ہیں۔۔۔۔۔ صرف جھلس گئے ہیں۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”ان کا زندہ رہنا ضروری ہے۔“

”ہاں آپ سچ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ اور اس کا ساتھی دونوں کی مشکلیں کھولنے لگے۔

آننگار نے انہیں تھیلوں میں ڈال کر ان کے منہ قلعی سے باندھ دیے۔ ٹائیگر نے تین ہزار روپے بڑھائے تو وہ پس و پیش کرنے لگے۔ ٹائیگر نے زبردستی دے دیے۔

وہ گاڑی کی ڈگ میں ڈال کر اور ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

”اوہ بھگوان۔۔۔۔۔!“ سادھنا نے ایک لمبا سانس لیا۔ ”میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ انہیں کہاں اور کیسے ٹھکانے لگایا جائے گا۔ بھیا نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔“

☆ ☆ ☆

رات ایک بجے کی فلائٹ کی ٹکٹیں انہیں مل گئیں۔ ٹائیگر نے انہیں مدراس یعنی اب جو چٹائے شہر تھا اس میں اردو، لڑکیوں اور جنتدر کا سگا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہاں پہنچا کر چائے پی کر پھر ہوائی جہاز سے بنگلور واپس آیا تو اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔

وہ بہت خوش تھا کہ نہ صرف یہی پال کو ان دونوں غنڈوں کو کینہ گردار تک پہنچا آیا تھا۔ اب اسے اس شیطان درندے کو کینہ گردار تک پہنچانا تھا۔ یہ ہم سر

کرنا تھی۔

بنگور میں کمرشل اسٹریٹ پر جوتوں کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے پاس جوتوں کی جتنی ورائٹی تھی ہندوستان کے کسی بھی شہر کی دکان پر نہ تھی۔ اس دکان کا نام نیو ماڈرن بوٹ ہاؤس تھا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے جوتوں کے کارخانوں سے جدید ترین ڈیزائن کے نہایت عمدہ جوتے، میڈلز اور چمپلیں مردانہ اور زنانہ جو بڑے فیشن اور پائیدار بھی ہوتے تھے۔ اس کے امریکہ، یورپ، چین، ہانگ کانگ اور کئی بڑے ملکوں سے درآمد کرتا تھا۔ اس لئے ہر وقت گاہکوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ دکان کے اندر گاہکوں کا رش دیکھ کر لگتا تھا مفت میں جوتے دیئے جا رہے ہیں۔

ٹائیگر جب کبھی بھی بنگور آتا تھا اس دکان سے نہ صرف جوتے، مردانہ سینڈل بلکہ چمپلیں بھی خرید کر لے جاتا تھا۔ اب چوں کہ ہم پر جانا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ ایسے جوتے کی جوڑی خریدی جائے جو جڑی اور بے حد پائیدار ہو۔ اس لئے وہ دکان پر آیا تھا۔ دکان میں گاہکوں کا اس قدر رش تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ دکان میں سہاش دتہ ایک پرانا سٹلر تھا۔ وہ ٹائیگر کی پسند اور مزاج کو خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے ٹائیگر کا وقت ضائع نہ ہوتا تھا۔ اور ٹائیگر اسے سودو سو روپے اپنی خوشی سے ٹپ دے دیتا تھا۔ ویسے ایسی دکانوں پر ٹپ کی کوئی روایت نہ تھی۔

وہ ٹائیگر کو دیکھتے ہی لپک کر آیا اور نساکار کرنے کے بعد کہا۔

”سر! آپ بہت دنوں بلکہ ایک لمبے عرصے کے بعد آئے ہیں۔ شکار کا پروگرام بنا کر آئے ہوں گے؟“

”ہاں ٹھیک کہتا ہوں!“ ٹائیگر نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں شکار پر جاتے وقت یہاں سے جوتے خرید کر لے جاتا ہوں اور واپس جاتے ہوئے بھی کوئی ایسی ہی جوڑی دکھاؤ جو ہمیشہ دکھاتے ہو؟“

”کوئی ڈیزائن برس سے ایسے جوتوں کی جوڑی نہ

صرف بڑی زبردست، پائیدار اور بلکہ نایاب بھی ہے۔۔۔۔۔ اور بے حد قیمتی بھی ہے۔۔۔۔۔ بے حد آرام دہ۔۔۔۔۔ کسی بھی موسم میں۔۔۔۔۔ اس میں ایسی نرمی اور گداز محسوس ہوتا ہے کہ اس کا لمس سارے بدن میں سرور و کیف اور فرحت سا پہنچا دیتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ ٹائیگر مسکرا دیا۔ ”میں نے آج تک ایسی کوئی بات کسی جوتے کی جوڑی میں نہیں پائی اور نہ ہی تم نے کبھی کسی جوتے کی جوڑی کی اس قدر تعریف کی۔۔۔۔۔؟“

”دکان پر پہلی بار فروخت ہو رہی ہے اس لئے میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔“ وہ بولا۔ ”آپ بھی اسے پہن کر اس کی تعریف پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ ٹائیگر مسکرا دیا۔ اس کا تجسس اور اشتیاق بڑھ گیا۔ ”یہ جوتے کیا امریکہ یا یورپ یا افریقی ممالک کے بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ میں نے کبھی تمہاری زبان سے کسی جوتے کی ایسی تعریف نہیں سنی۔ ہندوستان کے بنے ہوئے جوتوں میں کیا ایسی کوئی خوبی اور خصوصیت ہوتی ہے۔“

”یہ کسی کو نہیں معلوم۔“ سہاش دتہ نے جواب دیا۔ ”دو تین مہینے میں ایک شخص آتا ہے۔ وہ ہندوستانی ہے۔ صرف دس بارہ جوڑی لاتا ہے اور اس کی قیمت وصول کر کے چلا جاتا ہے۔ مالک نے کئی مرتبہ اس سے پوچھا کہ یہ کس ملک کے بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ وہ صرف یہ جواب دیتا ہے کہ۔۔۔۔۔ آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ کٹنے سے۔ یہ درآد شدہ ہیں۔ غیر قانونی۔ یہ اسمگل ہو کر آتے ہیں۔ کس ملک کے ہیں۔ وہ بتانے سے قاصر ہے۔ اگر آپ کو نہ خریدنا ہوں تو میں کسی اور دکان پر چلا جاؤں گا۔ یہ جوتے اس قدر پائیدار اور مضبوط ہیں کہ شکار کھیلنے اور جنگل میں بہت کام آئیں گے۔ اس کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اس پر پالش کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی صابن سے دھو دیں۔ نہ صرف یہ چمک جاتے ہیں بلکہ اس میں ایک

جب سناکھارا آ جاتا ہے۔“

سہاش دتہ نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ناپ کی ایک جوڑی لے آیا۔ ٹائیگر جوتے کی جوڑی دیکھ کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اور بھی ایسے خوب صورت، ایدہ زیب اور نرم و گداز چرمی جوتے نہیں دیکھے تھے۔ ان کے لمس نے ان کی کس کس میں ایک عجیب کیف (اڈاؤ)۔

اس نے جوتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے سہاش دتہ کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ریشم کی طرح نرم و ملائم ہیں۔۔۔۔۔ پھول کی طرح ہلکے ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ پیر میں جوتے ہیں بلکہ موزے لگ رہے ہیں۔“

”یہ اس کی خصوصیت ہے۔“ سہاش دتہ کہنے لگا۔ ”یہ جتنے نرم، ملائم اور گداز لگ رہے ہیں اتنے ہی سخت اور مضبوط ہیں۔ آپ اسے مہینے کے بعد کتنی ہی سخت چیز محسوس شے اور چٹان یا پہاڑی یا دیوار کو پوری قوت سے لات ماریں۔۔۔۔۔ جوتے اور آپ کے پیر پر کوئی اثر نہ ہوگا۔۔۔۔۔ آپ کسی دھندے یا آدی کولات رسید کر سہیں وہ کئی فٹ دور جا کرے گا۔ اس میں آپ کی طاقت کے علاوہ جوتے کی پائیداری کا دخل ہے۔“

”اس کی کیا قیمت ہے۔؟“ ٹائیگر نے حیر سے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

”صرف بیس ہزار روپے۔“ سہاش دتہ بولا۔ ”میں مالک سے بات کر کے آپ کو کچھ رعایت

لاؤں گا۔“

”رعایت کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“ ٹائیگر نے کہا۔ ”آپ اسے چیک کر دیں۔“

☆ ☆ ☆

صبح ناشتے کی میز پر ٹائیگر نے اخبار دیکھا۔ اس میں کچھ اندوہناک خبریں تھیں۔ ایک خبر تو یہ تھی۔ گیارہ نو جوان اور حسین لڑکیاں جن کی عمر چودہ

بائیس سے لے کر بیس برس کی عمر کے درمیان تھیں وہ

ایک ورائٹی شو میں شرکت کر کے آڈیٹوریم سے نکلیں۔ ان کا تعلق اسکولوں اور مختلف کالجز سے تھا۔ ایک کوشر میں آئی تھیں۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میوزیکل آرٹ سرکل کی وہ ممبر تھیں۔ جہاں وہ روزانہ رقص، موسیقی اور گانگی کی تربیت اور مشق کے لئے جاتی تھیں۔ اس ورائٹی شو کا اہتمام اسی ادارے نے کیا تھا۔ وہ کوشر میں سوار ہو گئیں اور ڈرائیور انہیں ان کے گھروں پر چھوڑنے کے لئے لے گیا۔ جب تین بجے گھروں کو نہ پہنچیں تو ان کے گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ آڈیٹوریم کے دفتر رابطہ کیا۔ وہ بند ہو چکا تھا۔ چوکی دار نے بتایا کہ لڑکیاں کوشر میں رات سوا بارہ بجے چلی گئی تھیں۔ رات ایک بجے تک سارا آڈیٹوریم خالی ہو چکا تھا اور اس کا دفتر بھی بند ہو چکا تھا۔

کوشر کی پراسرار کشیدگی کی اطلاع پولیس کو دی گئی۔ شہر کے کئی تھانوں کی پولیس اور موہاٹل وین حرکت میں آ گئیں۔ پولیس کو کوشر ملین پارک کے پاس ملی جو خالی تھی۔ ڈرائیور اور لڑکیوں کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ لڑکیاں ڈرائیور سمیت غائب تھیں۔ خیال کیا جاتا ہے اور پولیس کا کہنا بھی یہی ہے کہ انہیں شیطان مافیا نے اغوا کر لیا ہے۔ میسور پولیس کو فوراً خبر دی گئی ہے۔ آخری کاپی پریس جانے تک کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

دوسری خبر یہ تھی کہ تین ماہ سے اب تک سولہ برس کی عمر سے لے کر بائیس برس کی عمر کی لڑکیاں۔ جو پراسرار طور پر لاپتا ہو چکی ہیں۔ وہ اور سات نو جوان لڑکے اور جوں سال مرد بھی لاپتا ہیں۔ پولیس انہیں سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ ان کے بارے میں بھی یہ خیال ہے کہ اس شیطان مافیا نے اپنے ٹھکانے پر یہ غلام بنا رکھا ہے۔

چھ ماہ کے عرصے میں کل اب تک دو سو عورتیں لڑکیاں۔۔۔۔۔ مرد اور لڑکے جو پراسرار طور پر اغوا کر لی گئیں ان کا بھی کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ٹریفک کے حادثاتوں میں جوڑھی

مضبوط تھی۔ پہلے تو میں نے پوری طاقت سے اس کی کھوپڑی بجا دی..... اس کا سر مکمل گیا اور خون بہنے لگا..... وہ بے ہوش ہو گیا..... پھر میں نے دوسرے اور تیسرے کا بھی باجا بجا دیا..... وہ دونوں بھی زخمی ہو گئے..... اور پھر مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ مجھے دوپٹا لینا اور نہیں رہا۔ باہر آئی تو دیکھا کہ زبردست موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ میں جدر منہ اٹھا ادھر بھاگی..... بارش میں بھٹکتی گئی۔ جب میں مین روڈ پر آئی تو ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ اسے ایک تیس برس کا مرد چلا رہا تھا..... اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور بولا کہ..... شریستی کہاں جا رہی ہیں..... اس تیز بارش میں..... کیا سواری کی تلاش میں.....؟ آپ تو پوری طرح بیگ چکی ہیں..... پہلے..... میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں..... جب میں بیٹھ گئی تو اس نے کہا کہ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے مضبوطی سے پکڑ کر بیٹھ جائیں..... کیوں کہ اس تیز بارش میں امکان ہے کہیں آپ پھسل نہ جائیں..... پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا..... کیوں نہ آپ میرے غریب خانے چلیں..... میری بیوی اپنے میکے گئی ہوئی ہے..... آپ میرے گھر چل کر یہ کپڑے اتار دیں..... میں آپ کو اپنی چٹی کا اچھا لباس پہننے کے لئے خریدوں گا..... میں کافی بھی پلاؤں گا..... بارش میں مرد اور عورت کا مزا اور کیف اور ہی ہوتا ہے..... اس وقت میں نے ایک گاڑی کو تیزی سے گزرتے دیکھا۔ اس میں اندر روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے تینوں کو گاڑی میں دیکھا تو میرا خون نجد ہو گیا۔

جب وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اسکو ڈوالے کو روکنے کے لئے کہا..... اس نے گاڑی روک کر پوچھا کہ کیا بات ہے جان! کیا گھر چل کر دل خوش نہیں کر سکی.....؟ میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہا کہ میرا گھر اس گلی میں ہے..... اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر فاصلہ کم کر کے کہا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو..... تمہارے کپڑے بیگ تو گئے..... لیکن اس نے تمہیں شعلہ جسم بنادیا ہے..... بے لباس لگ رہی

نہیں..... نہیں..... میں کافی بناؤں گی۔ میں
بہت اچھی کافی بناتی ہوں۔ دودھ تو ہوگا؟“
ٹانگیار سے باورچی خانے میں لے گیا۔ فریج
میں سے اس نے کافی کے لئے جو دودھ نکال کر گرم کیا تھا
یہی وہ باہر ہی تھا۔ پھر اس لڑکی نے کافی بنائی۔ کافی بہت
اچھی اور ذائقہ دار بنائی تھی۔ ٹانگیار سے اچھی..... جو کہ مزہ
لے چکی۔ لڑکی نے کافی پیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
”میرا نام ہلا کماری ہے۔ میں میوہ پو نیوڑی
میں انگش لڑیج میں ایم اے کر رہی ہوں۔ سال دوم میں
ہوں۔ میرے پتا ایک اچھی کچی فرم میں سپروائزر ہیں۔ ماما
کی ایک انگش میڈیم اسکول میں ہیڈ ماستر ہیں۔ میں
ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میں اس شیطان درندہ صفت
کے جال میں جو پھنسی اس میں میرا اپنا دوش ہے۔“
چوں کہ میں آپ کو اپنا مہربان، دوست اور محسن
اور بے غلط ساتھی سمجھ رہی ہوں اس لئے آپ کو جو کچھ
مہی بناؤں گی وہ بالکل سچ سچ ہوگا۔ آپ سے کوئی بات
نہیں چھپاؤں گی۔ پو نیوڑی میں میرا شمار دو ایک حسین
لڑکیوں میں ہوتا ہے۔ لڑکے لڑائیک اور ہم جماعت
میرے حسن کے شیدائی ہیں۔ حقیقت میں میرا جیسا
حسن کسی بھی لڑکی کا نہیں ہے۔ میں دو برس سے پو نی
گوئین کا خطاب پارہی ہوں۔ میں شو بزنس کی دنیا میں
جانے کے لئے رقص و موسیقی کی تربیت بھی حاصل کی
ہوئی ہوں۔ ماما پتا جی کی ایک ہی شرط ہے کہ میں
کرئیریشن کرنے کے بعد شو بزنس میں جاؤں یا شادی
کے گھر بساؤں۔

میں اپنے حسن و جمال کی تعریفیں..... لڑکوں
کے مستحقہ خطوط..... فون..... ایس ایم ایس نے میرے
الحمد چندا حسن میں اضافہ کر دیا تھا..... میں نے
بے خودی کے سالانہ اور درمیان میں جو ورائٹی شو ہوتے
تھے ان میں اور شہر میں ہونے والے ورائٹی شو میں مجھے
درو کیا جاتا تھا..... میں ایک فلمی اداکارہ کی طرح اس
میں لپٹ کر سبک اسٹم کرتی تھی..... فلمی رسائل و جرائد
میری رنگین تصویر چھانے تھے جن میں عربانیت ہوتی

انمول موتی

تھی۔ جس نے مجھے بڑی شہرت بخشی..... فی وی اور کرنا تک فلم انڈسٹری کے نمبر فی فلم انڈسٹری سے بھی مجھے فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی۔ میں نے اپنے والدین کی شرط کی وجہ سے ان کی آخر غمگناہ دینے پر مجبور تھی۔ دل کرتا تھا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ دوں۔

میں جولیاں پہنتی تھی وہ بے حجاب ہوتا تھا۔ اس میں میرا نہیں بلکہ ماحول کا اثر تھا جو بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا تھا..... میری ماں مجھے کوئی تھی کہ تم حد سے زیادہ فیشن پرست ہوئی جا رہی ہو..... وہ ایک پرانے دقیقہ نوسی خیالات کی اور پرانی ڈگر پر چلنے والی عورت ہیں۔ حالاں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور شہر کے سب سے بڑے انگلش میڈیم اسکول کی ہیڈ ماسٹریں ہیں۔ میں ان کی باتیں نہ کر دوسرے کان سے اڑا دیا کرتی تھی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ میں ایک سہیلی کی سالگرہ کی تقریب میں گئی۔ اتفاق سے میری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ مجھے ایک خالی عینکی کھڑی نظر آئی۔ میں اس میں سوار ہو گئی۔ عینکی کچھ دور بھی گئی کہ کسی خرابی کے سبب بند ہو کر رک گئی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ عینکی ڈرائیور اس کا پلٹ اٹھا کر انجن دیکھ رہا تھا کہ ایک گاڑی آ کر رکی..... اس میں چار بدمعاش تھے۔ ایک اسٹیونگ پر بیٹھا تھا۔ اس میں سے تین بدمعاش اترے

میں کپڑے اٹھا کر کبکبن کی طرف چلی۔ لیکن اس نے کبکبن میں مجھے آیا۔ وہ دروازہ..... مضبوط کسرتی بدن کا تھا۔ اس نے صرف نیکر پہنی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیوچ لیا۔

”کہیں میں پینا تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ بن مانگے خزانہ مل گیا۔“

”مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ میں اس کے بازوؤں میں کسماتی ہوئی ہڈیانی لہجے میں چینی۔

”یقین نہیں آ رہا ہے کہ حقیقت بھی سنے سے کہیں حسین اور نکلن ہو سکتی ہے۔“ اس نے اپنی کرخت اور بھونڈی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں شیطیت ناچ رہی تھی۔

میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی غرض پوری کرنے اور دل کے ارمان نکالنے سے باز نہیں آئے گا۔

چھری کبکبن میں پڑی تھی۔ اس تک رسائی آسان نہ تھی۔ وہ ایک ایسا ہتھیار تھا کہ جس سے میں نے ایک قتل کیا تھا۔ اب دوسرا ملنے والا تھا۔

مجھے اس کی گرفت اور من مانی سے نکلنے اور کبکبن کے اندر لے جانے کے لئے مشورہ اور خود پردہ کی اور من مانوں سے کام لینا تھا۔ یہ عورت کے ہتھیار ہوتے ہیں۔ وہ نہ بڑھتا تھا۔ مسخ نہ تھا۔ میں با آسانی اس پر قابو پا سکتی تھی۔ زیر کر سکتی تھی اور موت کی نیند سلا سکتی تھی۔

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اور اسے مستی بھری نظروں اور خود پردہ کی سے پیش آتی ہوئی بولی۔

”تم کتنے خوب صورت۔۔۔۔۔ وجہ اور جوان ہو۔۔۔۔۔ کبکبن کے اندر چلو۔۔۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی کشتی آ نکلے اور تمیں بیاروجبت کی حالت میں دیکھ لے۔ میں عورت ہوں۔۔۔۔۔ مجھے یہاں بڑی شرم آ رہی ہے۔“

وہ مجھے گود میں اٹھا کر لے گیا۔ بستر پر لٹا دیا۔ چھری میز پر رکھی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”دروازہ تو بند کر دو۔۔۔۔۔“ وہ دروازہ بند کرنے بڑھتا تو میں نے فوراً ہی اٹھ

لی۔ کوئی ان کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ مجھے انخوامیر سے حسن اور پرکشش ہونے کی وجہ سے کیا گیا۔

میں اب اپنی نظروں میں ہی رسوا ہو گئی تھی۔ ذلیل اور حقیر ہو گئی تھی۔ گر گئی تھی۔ میرے گھر والے میری پر اسرار گشتی سے کس قدر پریشان اور فکر مند ہو گئے ہوں گے۔ میری ماما جی جج کہتی تھیں کہ

بہری بے حیائی۔ بے شری اور بے جالی ایک دن مجھے کسی قابل نہ رکھے گی۔ میں کیا منہ لے کر جاری ہوں؟ کیا دنیا والوں کو منہ دکھا سکوں گی؟ کیا

بچہ پر انگلیاں نہیں اٹھیں گی؟ کیا میرے لئے بہتر نہیں ہوگا کہ میں پانی میں چھلانگ لگا دوں۔۔۔۔۔ خود کھو کر لوں۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی۔

جب صبح ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کپڑے ابھی نم آلود ہیں۔ انہیں دھوپ کی ضرورت ہے۔ میں نے عرش پر کپڑے پھیلا دیئے۔ اس وقت سورج چمک رہا تھا۔ ہر طرف اجالا تھا۔ میں تاریک اور گھنے جنگل سے نکل کر کھلی جگہ پر پڑی۔ تاحہ نگاہ تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں چاہ وہی تھی کہ جلدی سے کپڑے نہک جاؤں۔ کہیں سے کوئی کشتی نہ نکل آئے اور مجھے

اس حالت میں دیکھ لیا جائے۔ میں نم آلود کپڑے اور اس لئے پہننا نہیں چاہتی تھی کہ شہدائی ہوا چل رہی تھی۔

سو نہ ہونے کا خطرہ تھا۔ میں کشتی میں جا رہی تھی۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ

کھارے کی جھاڑیوں کے عقب سے دور بین سے مجھے اپنی راج کر رہا ہے۔ میں عرش پر اسٹیرنگ تھا سے

کڑی کشتی کی رفتار کو قابو میں کئے ہوئے تھی۔ جن جھاڑیوں کے پیچھے سے مجھے دیکھا جا رہا تھا وہ مخالف سمت تھیں۔ اور کشتی اور جھاڑیوں کا درمیانی فاصلہ نصف

آٹھ لاکھ تھا۔ جب فاصلہ کم ہو گیا تب اس کی اوٹ سے ایک شخص نکلا اور نہایت تیزی سے کشتی کی طرف

بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں کشتی کی رفتار بڑھاتی وہ

ان کی سرحدی سے اوپر آ گیا۔

مطلح بالکل صاف ہو چکا تھا۔ لیکن میرے کپڑے ابھی سوکھے نہیں تھے۔ اس لئے مجھے بے لہای کی حالت میں کپڑے سوکھنے تک رہنا تھا۔ چوں کہ کوئی مجھے اس حالت میں دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس لئے میں بے نیازی سے

کڑی کشتی۔ پانی کے بہاؤ اور طغیانی میں ہی آئی کی کشتی کی رفتار میں بھی فرق آنے لگا۔ وہ رک رک کر چل رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں جا رہی ہوں۔ کیا اپنی منزل کی طرف۔ دن کی روشنی میں

اپنی منزل کا تعین کر لیتی۔ گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے جب تاریک جنگل دیکھا اور اب اس بات کا کوئی ڈر خوف نہیں رہا کہ شیطان کا کوئی بد معاش میرے تعاقب میں آ رہا ہے۔ کشتی کے انجن کی آواز سے ہتاجل جاتا کہ میرا

تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں نے نہ صرف اس کی ہیڈ لائٹ روشن کر دی بلکہ اس کا اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

اس کشتی کے کبکبن میں ایک ایئرگن بھی تھی جو بھری ہوئی تھی۔ ایک طاقت ور نارنج بھی تھی۔ میرے

دل کو تقویت سی ہوئی کہ کسی نے میرا تعاقب کیا تو میں اس ایئرگن سے اس کے پرچھے اڑا دوں گی۔ میرے

لئے یہ ایک سہارا اور اسلحہ بن گئی تھی۔ کشتی کی روشنی اندھیرے کو چیرتی ہوئی جاری

تھی۔ میں بالکل بھی پریشان اور خوف زدہ نہیں تھی۔ لیکن میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات

کی یلغار تھی۔ ایک غلش میرے سینے میں کی جھڑکی طرح پیوست ہو گئی تھی کہ میرے ہاتھوں سے ایک خون

ہو گیا۔ اس شخص کا جس نے مجھے کشتی میں دیوچ لیا تھا۔ میں نے اپنی عزت بچانے کے لئے اسے قتل کیا

تھا یا اپنی جان بچانے کے لئے۔ لیکن میرے پاس اب عزت رہی تھی کہاں؟ وہ شیطان مفت درندہ

پورے تین دن اور تین راتیں مجھے کھلونا بنائے ہوئے تھا۔ اس لمحے میں بڑے دکھ سے اور جذباتی ہو کر سوچ

رہی تھی کہ۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ میں نہایت حسین نہ ہوتی

اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ لڑکیاں واقعی بڑی خوش نصیب واقع ہوئی ہیں جو عام قسم کی اور بے کشش ہوئی

رانی جی بھر کے کرتے تھے۔ میری کزن آشانے مجھے کشتی چلانے کی تربیت دی ہوئی تھی۔ اس لئے میری معلومات وسیع تھیں۔ میرے ایک ہاتھ میں تھیلا اور

دوسرے ہاتھ میں چھری ابھی بھی تھی کہ کسی چوکی دار یا کتے نے حملہ کیا تو اسے بھوک دوں۔ میں کبکبن کی طرف بڑھی۔ اندر داخل ہوتے ہی کسی نے مجھے دیوچ لیا۔ میرا

سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اچھا تو فرار ہو کر جاری ہو۔۔۔۔۔ مجھے خوش کئے بغیر۔ یہ مردانہ کرخت آواز

تھی۔ شیطان درندہ صفت نے اپنے جزیرے پر قاتلوں، مجرموں اور شقی القلب اور درندہ صفت آدمیوں

کو رکھا ہوا تھا۔ میں نے خود پر قابو پا کر اس سے بیٹھے لہجے میں کہا کہ میرے کپڑے بھیگ چکے ہیں۔ انہیں

اتارنے دو۔۔۔۔۔ اس نے کہا کہ میں اتار دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ پھر اس نے

کبکبن میں روشنی کر دی۔ میں نے فوراً ہی چھری اس کے سینے میں گھونپ دی۔ وہ ایک جج مار کر دہرا ہوا۔

کبکبن سے باہر آ گیا۔ پھر میں نے دوسرا وار اس کی پشت پر کر دیا۔ اس نے اپنا سینہ پکڑ لیا تھا۔ پھر وہ بے

ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں نے پھر فوراً ہی کشتی کو اس کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔ اس کی لاش کسی نہ کسی طرح

گھسٹ کر پانی میں گرادی۔ پھر میں نے کپڑے اتار کر نچوڑ کر ایک طرف

سوکنے کے لئے رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد بارش تھمنے لگی۔ میں نے کشتی کا انجن اشارت نہیں کیا۔ اس کی

ضرورت اس لئے بھی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ بہاؤ پر چلی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں اس شیطان کی

باتیں تازہ ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے آدمی اس کے لئے سینیں لڑکیوں کی تلاش میں رہتے

ہیں۔ تمہارے حسن کا بڑا چرچا سنا اور تصویریں بھی اس کے آدمی نے بھیجی تھیں۔ میں نے انہیں حکم دیا کہ جتنا

جلد ہو سکے مجھے انخوامیر کے پہنچا دیا جائے۔ بارش رات دو تین بجے کے لگ بھگ رک گئی

تھی۔ پھر رفتہ رفتہ بادل چھٹنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد



سنیاسی راج کمار

عامر ملک - راولپنڈی

ارتھی شمشان گھاٹ میں جونہی پہنچی، موسلا دھار بارش اور طوفانی جھکڑوں نے لوگوں کو بدحال کر دیا، لہذا لوگوں نے ارتھی کو چھوڑ چھاڑ اپنی جانیں بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے مگر پھر جب واپس آئے تو مردہ غائب ہو چکا تھا۔

حرف اور سطر سطر محسوس اور نتیجے میں ذاتی حقیقت سے دو چار گوش اور دُریب کہانی

اس پر نضا مقام پر سچ و شام سینکڑوں لوگ سیر و تفریح کے لئے آتے تھے۔ سنیاسی کے قریب ایک طرف اس کا کنڈل رکھا ہوا تھا اور دوسری طرف اس نے اپنا لہا چٹا زمین میں گاڑ کر رکھا تھا۔ رکھتا سامنے آٹھوں پہرہوں کی جلتی رتی تھی اسی طرح وہ سخت سردی، بارش اور سردی کے طوفان میں متواتر چار مہینے تک مکمل چپ سا دھاپے استھان پر بیٹھا رہا۔ نہ وہ کسی سے سوال کرتا

دسمبر 1920ء میں پورا بنگال سردی کی زد میں آیا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے ساتھ بارش بھی جاتی تھی۔ ایسے میں ایک جوان سال خوبصورت سنیاسی تک دھڑک جہم پر صرف ایک لنگوٹی باندھے پورے بدن پر پڑی سے چوٹی تک بھسوت لے چہرے پر لمبی لالچی لمبے لمبے بالوں کی بنائیں سمیت ڈھاکہ میں لڑکی لنگا کے کنارے پک لینڈ بند پر آسن جما کر بیٹھ گیا۔

کر چھری اٹھائی۔ یہ چھری عام چھریوں کے مقابلے میں بڑی لمبی تھی۔ اس کی تیز دھار بڑی خوف ناک تھی۔ کسی بھی درندے کی گردن کا جرمولی کی طرح کاٹ سکتی تھی۔

”دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر تھما نہ لےجے میں کہا۔ میرا لہجہ اور تیز آواز سن کر وہ تیزی سے گھوما۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر ایک دم سے اچھل پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ میں نے اس کے تیسرے اندازہ کر لیا کہ وہ مجھ پر جھپٹے اور دیوچ کر قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے دھمکی دی۔

”تم کوئی حماقت نہ کرنا۔ زندگی چاہتے ہو تو پانی میں چھلانگ لگا دو۔“ درندہ تیار اپٹ پھاڑ دوں گی۔“ وہ ایک لمحے تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتا رہا۔ اس کے چہرے پر نفرت اور غصے کے تاثرات ابھرائے۔ اس نے اچانک مجھ پر جست لگائی۔ چوں کہ میں چونکا اور مستعد تھی۔ چھری کی لمبائی ٹھیک ٹھاک تھی۔ میں پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اس کا ہاتھ چھری کی دھار پر پڑا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا دھار کی زد میں آ کر کٹ گیا۔ انگوٹھا اور انگلیاں کٹ کر لنگ گئیں۔ ان میں سے خون بہنے اور مچنے لگا۔

اس نے ایک دل خراش چیخ ماری۔ اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ جب میں نے چھری لہرائی اس کی طرف بڑھی تو وہ یکین سے نکل کر دوڑا اور اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ چھپاکی کی آواز سنائے میں گونجی۔ میں نے فوراً ہی اسٹیرنگ سنبھال کر کشتی کی رفتار بڑھا دی۔ دوسرے لمحے میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تیزی سے تیرتا ہوا کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ کشتی کی تیز رفتاری کے باعث اس کے اور میرے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک دھبسا بن کر غائب ہو گیا۔ میں نے کشتی کی رفتار بہت ہی کم کر دی۔ جلد ہی یکین میں جا کر کپڑے پہنے جو سوکھ چکے تھے۔ میں

یہ سن کر میرا بدن خوف و دہشت سے لرزے لگا۔ (جاری ہے)

اور نہ ہی کسی سے خود شکام ہوتا۔ وہ اس سے گزرنے والے لوگ اس غیر معمولی حسین سنیاسی کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ عمر تقریباً 36 سال، چہرے کی ساخت بہت خوبصورت آنکھیں نیلگوں، کشادہ پیشانی اور نرم سٹول تھا۔ جلد ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ کہیں یہ سنیاسی بھووال جاگیر کا منجھلا راج کمار رامیندر نرائن تو نہیں ہے جو بارہ سال قبل مئی 1909ء میں سیاحت و علاج کے دوران دارجلینگ میں اپنی بیوی رانی بھواوتی دیوی اور رانی کے بھائی ستیندر ناتھ اور جاگیر کے بہت سے افسروں اور اہلکاروں کے سامنے پتے کے شدید درد کے عارضہ میں مر چکا تھا اور جس کی موت کی تصدیق کا شوقیت دارجلینگ کا سول سرجن لیشینٹ کرنل ڈاکٹر کال ورث جس نے راج کمار کا علاج کیا تھا، جاری کر چکا تھا۔ اس خوبصورت سنیاسی کی شکل و شبہت، آنکھیں، ہنر، چال ڈھال اور خدوخال آنجہانی راج کمار سے کامل مشابہت رکھتے تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں لوگ سنیاسی کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آنے لگے۔ بند کے قریب ہی مسٹر دیپال مگر جی، بیج کا مکان تھا۔ صبح شام میر کو جاتے ہوئے وہ بھی اس جواں سال سنیاسی کو دیکھ کر متاثر ہوتے۔ انہوں نے لوگوں کی چہ میگوئیاں سن کر ایک روز سنیاسی سے کہا کہ لوگ اس پر آنجہانی راج کمار رامیندر نرائن ہونے کا شک کرتے ہیں۔ اسی طرح کئی آدمیوں نے اسی طرح اپنے شک کا اظہار کیا۔ مگر سنیاسی کبھی انکار کرتا اور کبھی ٹال مٹول سے کام لیتا۔ مگر لوگوں کا تجسس اور اصرار روز بروز بڑھتا گیا۔ بالآخر 4 مئی 1921ء کو اس پر اسرار سنیاسی نے اقرار کر لیا کہ وہ بھووال جاگیر کا منجھلا راج کمار رامیندر نرائن ہی ہے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی نہ صرف تمام بنگال بلکہ پورے برصغیر ہندوستان اور اس کے باہر بھی ہلکے بچ گیا۔ دنیا راج کمار کو بارہ سال سے مرا ہوا سمجھ رہی تھی اور جس کی موت کی تمام رسومات ایک مدت پہلے ادا کی جا چکی تھیں۔ ان وہ ان کی نظروں کے سامنے جیتا جاگتا موجود تھا۔

سنیاسی نے جلد ہی بھووال جاگیر میں اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے ڈھا کہ کے کلکٹر اور یونٹو بورڈ کے سامنے کارروائی شروع کر دی۔ جہاں ناکام ہوئے یہاں نے ڈھا کہ کی دیوانی عدالت میں استعراق حق اور مشترکہ حصہ پر قبضہ حاصل کرنے کا باقاعدہ دعویٰ دائر کر دیا اور بالآخر طویل قانونی کارروائی کے بعد اور ہزاروں گواہوں کے بیانات قلم بند کر کے اور مکمل دستاویزی ثبوت مہیا ہونے کے بعد منجھلا راج کمار کی بیوی بھواوتی دیوی اور اس کے بھائی رائے بہادر ستیندر ناتھ کی سخت مخالفت کے باوجود سنیاسی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

پرنگہ بھووال۔ ڈھا کہ کے ٹیس میل شمال میں اور مسین سنگھ کے پچاس میل جنوب میں واقع ہے۔ روایت ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں ایک پٹھان حکمران شاہ بہاول غازی نے اپنی بقیان زندگی یاد الہی میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنا تمام علاقہ اپنے تین ماتحت افسروں کو بخش دیا۔ ان میں دو کا کٹھ تھے اور ایک برہمن تھا۔ جو علاقہ برہمن کے حصے میں آیا وہ شاہ بہاول غازی کی یاد میں بہاول کے نام سے موسوم ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ بنگالی تلفظ کے زیر اثر بھووال مشہور ہو گیا۔ بھووال راج کے تحت کئی بڑے بڑے تعلق دار تھے۔ برہمن افر کی موت کے بعد اس کی اولاد نسل بہ نسل حکومت کرتی رہی۔ یہاں تک کہ راجہ راجندر ناتھ حکومت کرنے لگا جو راج کمار رامیندر نرائن کا باپ تھا۔

بھووال جاگیر بنگال کی سب سے بڑی جاگیر تھی۔ اس کا رقبہ چھ سو مربع میل تھا اور صرف زمین کی لگان سے اس کی سالانہ آمدنی 1901ء میں دس لاکھ روپیہ سے زیادہ تھی۔ وسیع جنگلات وغیرہ کی کثیر آمدنی اس کے علاوہ تھی۔ 1901ء میں راجہ راجندر ناتھ کا ڈھا کہ میں انتقال ہو گیا اور اس کی لاش انجمن ٹرین کے ذریعے جاگیر کے صدر مقام بے پور لائی گئی۔ موت کے وقت راجہ نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔

راجہ کے بعد ہندو قانون کے مطابق بیٹیوں راج کمار مشترکہ طور پر مساوی حقدار قرار پائے لیکن ان کے

پانچ ہونے کی وجہ سے ان کی ماں مانی بحیثیت نگراں جاگیر کا انتظام کرنے لگی۔ یہ حکمران خاندان جاگیر کے بعد مقام بے پور میں ایک مشترکہ اور شامل حال ہندو خاندان کی حیثیت سے راجاڑی میں رہتا تھا۔ دستور کے مطابق راجہ کی بیٹیاں شادی کے بعد بھی اپنے ماں باپ کے گھر میں شوہروں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس وسیع علاقہ میں عالی شان عمارت خاندان کی رہائش لے لئے راجہ کی شاندار مہمان خانہ۔ زنان خانہ اور دوسری عمارتیں تھیں۔ بے شمار خدمت گار اور ملازمین کے رکانات بھی احاطہ ہی میں تھے۔ راجاڑی کے اندر میوہ بات کے وسیع باغ۔ شفا خانہ، چڑیا گھر اور ایک گہرا تالاب بھی تھا۔ راجہ کے اصطبل میں کئی بیش قیمت گھوڑے تھے اور راجاڑی سے تھوڑے فاصلے پر ایک نعل خانہ تھا جس میں تین ہفتی بروت جھوٹے رہتے تھے اور راجاڑی کے متصل ہی دیوتا مانکے مذہب کا ایک بڑا مندر تھا جہاں جاگیر کے لوگ پوجا کیا کرتے تھے اور ہر سال کئی صدیوں سے یہاں بھی وہیں انجام پاتی تھیں۔ وہیں سامنے ایک وسیع میدان تھا جہاں دور دور سے ساحلوں۔ سنیاسی گزرتی مگر کرتے تھے۔

راجہ کے خاندان کے قیام کے لئے شہر ڈھا کہ میں رہائے ہوئے کنگا کے کنارے ایک عالی شان حویلی تھی۔ راجہ کے لئے دو یا تین جاگیر کی کئی کئی کشتیاں تھیں۔

بیٹیوں راج کمار بچپن ہی سے کھیل کود کی زندگی گزارتا تھا۔ اور ابتدائی تعلیم کے سوا کچھ حاصل نہ کرتے۔ خصوصاً منجھلا راج کمار رامیندر نرائن ایک انتہائی اعلیٰ اور عیسائی نوجوان تھا۔ کلکتہ، ڈھا کہ اور دیگر شہروں میں اس نے کئی بازاری عورتوں سے تعلقات پیدا کر لئے تھے اور ان پر بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا۔

1900ء میں بڑے راج کمار کی شادی رانی بھواوتی دیوی سے ہو چکی تھی جو کلکتہ کے ایک متمول خاندان اور معزز برہمن خاندان کی لڑکی تھی۔ 1902ء میں منجھلا راج کمار کی شادی بھواوتی دیوی سے ہو گئی

اور 1904ء میں چھوٹے راج کمار کی شادی آئندہ کمار دیوی سے ہوئی تھی۔ منجھلا راج کمار کی بیوی بھواوتی دیوی کا باپ پہلے ہی مر چکا تھا۔ بھواوتی دیوی کے صرف ایک بھائی اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ چاروں بچے اپنی ماں پھول کمار کے ساتھ اپنے ماموں پر تپاں نارائن کے سہارے زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ایک بہت متمول اور باعزت شخص تھا مگر پھر بھی حکمران خاندان کا ہم پل نہ تھا اور منجھلا راج کمار کا رشتہ بھواوتی دیوی کے ساتھ اس کے بے نظیر حسن و جمال کی وجہ سے قرار پایا تھا۔ شادی کے بعد بھی منجھلا راج کمار نے اپنی بری عادتوں کو نہ چھوڑا اور بدستور طوائفوں کے کٹھوں میں شب و روز گزارتا رہا۔ رانی بھواوتی دیوی سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ اپنا شوق وہ کلکتہ اور ڈھا کہ کی بدنام گلیوں میں یا پھر اپنے مرد افغانہ میں یا شکار میں گزارتا تھا۔ وہ جلد ہی آتشک کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔

1907ء میں رانی یلاس کا انتقال ہو گیا اور بیٹیوں راج کماروں نے مشترکہ طور پر جاگیر کا انتظام سنبھال لیا۔ ہندو قانون کے مطابق بڑا راج کمار بطور کرتا دھرتا کے منتظم اعلیٰ تھا۔ ان ہی دنوں منجھلا راج کمار کے آتشک نے کچھ شدت اختیار کر لی اور دونوں بازوؤں اور ٹانگوں پر چھوٹے نکل آئے اور اسے علاج کی غرض سے کلکتہ جانا پڑا۔ جہاں وہ دو ماہ تک بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں سے علاج کرواتا رہا۔ اسی قیام کے دوران اس حکمران خاندان نے لاہور کچھ کو شکار کے لئے بے پور آنے کی دعوت دی۔

13 فروری 1909ء کو لاہور کچھ انجمن ٹرین کے ذریعے اعلیٰ حکام اور ملٹری کے بڑے بڑے کمانڈروں کے ہمراہ بے پور پہنچے اور راجاڑی کے عالی شان مہمان خانہ میں فروکش ہوئے۔ دوسرے روز یہ پارٹی باقیوں پر سوار ہو کر منجھلا راج کمار کی محبت میں بھووال کے گھنے جنگلوں میں شکار کرتی رہی۔

کلکتہ کے اس قیام کے دوران رانی بھواوتی دیوی کا بھائی ستیندر ناتھ جو منجھلا راج کمار سے ایک سال چھوٹا تھا اور بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد قانون کا طالب علم تھا۔ منجھلا راج کمار کے پاس اکثر و بیشتر قیام

پنیر رہا اور مٹھے راج کمار کو علاج اور تہیہ ملی آپ دھوا کی غرض سے دارجلینگ کے پہاڑی مقام پر چلنے کی ترغیب دیتا رہا۔ لارڈ کچر کے شکار کے بعد ستیندر ناتھ پھر بے پور آیا اور ایک ماہ تک مٹھے راج کمار کے پاس قیام کیا اور اسے دارجلینگ کے سفر کے لئے آمادہ کر لیا۔ دارجلینگ میں قیام کے انتظامات کرنے کے لئے ستیندر ناتھ اور مٹھے راج کمار کا پرائیویٹ سیکریٹری دارجلینگ گیا۔ جہاں اس نے پہاڑ پر ایک گھٹی کرائے پر حاصل کر لی۔ اس کے بعد ستیندر ناتھ مٹھے راج کمار کو لے جانے کے لئے بے پور لوٹ آیا۔ رانی بھادوی دیوی نے اب تک اپنے شوہر کے ساتھ اکیلے سفر نہیں کیا تھا۔ رواج کے مطابق نوجوان بہو کا اپنے شوہر کے ساتھ اکیلے سفر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے وہ جب بھی شوہر کے ساتھ سفر پر جاتی تھی تو اس کے ہمراہ ستیہ بھالیا راج کمار کی ہمیش بھی جاتی تھیں۔ مگر اس دفعہ ستیندر ناتھ نے بتایا کہ گھٹی میں رہائش کی کمی ہے اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ رانی بھادوی دیوی کے ساتھ خاندان کی کوئی دوسری عورت نہیں جائے گی۔

18 اپریل 1909ء کو مٹھلا راج کمار اور رانی بھادوی دیوی دارجلینگ کے لئے روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ رانی کا بھائی ستیندر ناتھ خاندان کا ڈاکٹر آ شقوش داس۔ راج کمار کا ایک پرائیویٹ سیکریٹری کئی محافظ چار خانا سہ نوکرانیاں خدمت گار اور دیگر عملے کے ارکان تھے۔ 20 اپریل 1909ء کو یہ پارٹی دارجلینگ پہنچ گئی اور مذکورہ گھٹی میں قیام پزیر ہوئی۔ مٹھے راج کمار کی ہمسفر اس پارٹی کے افراد کے بیان کے مطابق 5 مئی 1909ء کو رات کو مٹھے راج کمار کے پیٹ میں سخت درد اٹھا اور دارجلینگ کے سول سرجن اور ڈاکٹر آ شقوش داس کے علاج کے باوجود 8 مئی 1909ء کو آدھی رات کے وقت پتے کے شدید عارضہ میں مٹھے راج کمار کا انتقال ہو گیا اور دوسرے روز صبح یعنی نو مئی کو اس کی اتنی ایک جلوس کی شکل میں دارجلینگ کے شمشان میں لے جا کر جلا دی گئی۔ 10 مئی 1909ء کو رانی بھادوی دیوی۔ اس کا

بھائی ستیندر ناتھ اور دیگر لوگ دارجلینگ سے میل ٹرین میں بے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ بے پور میں 6 اور 7 مئی کو دارجلینگ سے بھیجے ہوئے کچھ تارسلے تھے۔ جن میں ایک میں مٹھے راج کمار کو خف سا بخار دوسرے میں پیٹ میں کچھ تکلیف اور مرض میں افادہ کی اطلاع تیسرے تارسلے میں کئی مٹی۔ لہذا چھوٹا راج کمار بہت سے عزیزوں اور عملے کے ساتھ دارجلینگ پہنچنے کے لئے 9 مئی کو صبح کے وقت بے پور۔ ریلوے اسٹیشن کے لئے روانہ ہوا۔ مگر راستے میں اسے نوبے صبح دارجلینگ سے دو تارسلے ایک میں مٹھے راج کمار کی شدید علامات اور دوسرے میں اس کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ جب دارجلینگ میں پوروا جکشن پہنچی تو رانی بھادوی دیوی اور اس کے ہمراہ پارٹی کو بے پور جانے کے لئے گاڑی بدلنے کی غرض سے میل سے اترنا پڑا۔ وہاں ان کو بے پور سے آئی ہوئی ایک پارٹی مل گئی۔ جس میں راج کمار کے بھانجے اور کچھ عزیزوں کے علاوہ بہت سے محافظ اور دربان تھے۔ بڑے راج کمار کو ستیندر ناتھ پر اعتماد نہ تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ ستیندر ناتھ کہیں اپنی بیوہ بہن رانی بھادوی کو بچائے بے پور لانے کے براہ راست کلکتہ نہ لے جائے۔ رانی بھادوی کا ستیندر ناتھ کے قبضہ میں چلے جانا جاگیر کی ملکیت اور آمدنی کے تیسرے حصے سے محروم ہونے کے مترادف تھا کیونکہ وہ اس کے انجمنی شوہر کی ملکیت کی مالک تھی۔ بڑے راج کمار نے یہ بڑی پارٹی رانی بھادوی کو ہر حالت میں بے پور لانے کے لئے بھیجی تھی ان حالات میں ستیندر ناتھ کو بھی بیوہ بہن کے ساتھ بے پور آنا پڑا۔ بے پور میں رانی بھادوی دیوی اپنے شوہر کے سوگ میں آدھو بکا کرتے نڈھال ہوتی چلی گئی اور جب بھی ستیندر ناتھ اس سے ملنے کی کوشش کرتا تو وہ منہ موڑ لیتی اور ایک دفعہ تو ایک ملازمہ نے یہ کہتے ہوئے بھی سنا۔ ”میرے قریب مت آؤ۔ تم ہی نے مجھے ایک رانی بنایا تھا اور تم ہی نے مجھے اب ایک بھکارن بنادیا ہے۔“

بارہا کوشش کی گئی کہ وہ دارجلینگ میں مٹھے راج

کمار کی بیماری کی تفصیل بتائے۔ مگر مٹھے راج کمار کا نام آئے ہی وہ زار و قطار رونے لگتی۔ اور سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ پائی تھی کہ..... ”مجھ بد نصیب کو نہ تو تیار داری ہا موقع ملا اور نہ عالم نزع سے پہلے میں راج کمار کے پاس زیادہ جا سکی۔“

بڑا راج کمار اور چھوٹا راج کمار ہر طرح سے اس کی دیوبنی کرتے تھے۔ اصر دارجلینگ سے آنے کے بعد ہی سے ستیندر ناتھ برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح رانی بھادوی کو اپنے قبضہ میں کر لے مگر بظاہر دونوں راج کماروں سے محبت سے ملتا رہا۔ کچھ دنوں بعد اسے یہ موقع بھی میسر آ گیا۔

جاگیر کے فیئر مسٹرین کے خلاف زمین کا الزام لگایا گیا اور یقین تھا کہ اسے نوکری سے برطرف کر کے مقدمہ چلایا جائے گا ستیندر ناتھ نے اسے دلا دیا کہ اگر وہ رانی بھادوی دیوی کو ہموار کر لے تو سین کو ہر طرح سے بڑے راج کمار کو سمجھا بھگا کر بھیالیا جائے گا۔ سین دینے بھی دونوں راج کماروں سے ناراض ہو چکا تھا۔ وہ اس کام میں لگ گیا اور رفتہ رفتہ اس نے رانی بھادوی دیوی کا دل قدرے ستیندر ناتھ کی طرف سے صاف کر دیا۔ یہ کہنا کہ ستیندر ناتھ کی ہمت بندھی اور اس نے اپنی ماں اور بیوی کو تار پاڑ سے ڈھا کہ فحش کر دیا۔ جہاں سب رہنے لگے۔ ڈھا کہ کل میں میل کے قاصدے پر تھا اور رانی بھادوی اب اپنی ماں کے پاس اکثر پیشتر آنے لگی اور رفتہ رفتہ سجدہ رکے ہاتھوں میں ایک کھلی بن کر رہ گئی۔

4 نومبر 1909ء کو اس نے اپنے بھائی ستیندر ناتھ کو اپنا تختہ مقرر کر دیا۔ جس نے دوسرے ہی دن مٹھے راج کمار کی زندگی کے پیر کی 30 ہزار روپیہ کی رقم حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ اور اس سلسلے میں دارجلینگ جا کر سول سرجن کال ورث سے مٹھے راج کمار کی موت کا شوکیٹ حاصل کر لیا اور چند دنوں میں یہ رقم بھی حاصل کر لی۔ دونوں راج کماروں نے اس رقم سے اپنا حصہ لینے سے انکار کیا۔ مختار مقرر ہو جانے پر ستیندر ناتھ رانی بھادوی کے نام سے راج کماروں سے بڑی بڑی

رقمیں وصول کرنے لگا۔ اس کے علاوہ بیوہ رانی کا الاؤنس جو بڑھتے بڑھتے سات ہزار روپیہ ماہوار ہو گیا تھا۔ وہ بھی وصول کرنے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ ستمبر 2010ء میں بڑے راج کمار کا انتقال ہو گیا اور اپریل 1911ء میں رانی بھادوی دیوی نے بے پور کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہا اور ستیندر ناتھ کے ساتھ کلکتہ میں رہنے لگی۔ 1913ء میں چھوٹا راج کمار بھی مر گیا اور اس کی بیوہ رانی آننداماری بھی راجپاڑی چھوڑ کر اپنے بھائیوں کے ساتھ ڈھا کہ میں رہنے لگی۔ مرنے سے پہلے چھوٹے راج کمار نے رانی آننداماری کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لے۔ چنانچہ اس نے اپنے پیچھے رام نرائن کو گود لے لیا۔ مٹھے راج کمار کی موت کے بعد ہی بے پور دیو پور پورے بنگال میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ اس کی لاش جلائی نہ جا سکی تھی عام طور سے یہ خبر مٹھے راج کمار کے ایک وفادار نوکر شریف خان سے منسوب کی جا چکی تھی جو راج کمار کے ساتھ دارجلینگ گیا تھا۔ مگر خود شریف خان بھی دارجلینگ سے آنے کے بعد مر گیا تھا۔ ابھی یہ افواہ گرم تھی کہ چار مہینے بعد ہی ایک سنیا سی گھومتا پھرتا بے پور آ نکلا اور مذہب ہاڑی والے میدان میں مقیم ہوا۔ اس میدان میں دو دروازے سادھو سنیا سی آ کر قیام کرتے تھے اور ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھووال جاگیر کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ ایک رات وہ نووارد سنیا سی ایک دوسرے سنیا سی سے خوفگتھو تھا تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں کا مٹھلا راج کمار دارجلینگ گیا تھا جہاں وہ مر گیا اور کہتے ہیں کہ اس کی لاش شمشان سے غائب ہو گئی تھی اور جلائی نہ جا سکی تھی یہ سن کر نووارد سنیا سی نے کہا کہ کچھ ہی دن ہوئے اسے سیاحت کے دوران چار سنیا سی ملے تھے ان کے ساتھ ایک بخوبی الجواس نوجوان تھا جس کے متعلق وہ کہتے تھے کہ اسے وہ دارجلینگ کے شمشان سے اٹھالائے تھے۔ سنیا سی نے کہا کہ صبح جاگیر کے ملازم سادھو سنیا سیوں کا ناشتہ لے کر آئیں گے تو انہیں یہ بات بتادی جائے گی۔ نووارد گھبرا کر بولا۔ ”ناب بابا۔ یہ راجاؤں کے

معاملات ہیں۔ میں مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا نہ معلوم وہ کون کون جانا تھا۔ مگر سنیا سی کا اصرار تھا کہ اس بات میں کوئی حرج نہیں۔ اس پر نووارد سنیا سی خاموش رہا۔ رات زیادہ گزر چکی تھی میدان میں مقیم سنیا سی سو گئے۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نووارد سنیا سی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ رات ہی کو غائب ہو گیا تھا۔ جب راج باڑی کے ملازم ناشتہ لے کر میدان میں پہنچے تو اس سنیا سی نے نووارد سنیا سی کی زبانی جو امر سنا تھا ان سے بیان کیا۔ ملازم اسی وقت راج باڑی پہنچے اور تمام حقیقت بڑے راج کمار کے سامنے بیان کی۔ نووارد ہر طرف ہر کارے دوڑائے گئے کہ نووارد سنیا سی کو تلاش کر کے لائیں مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس پر بھی چاروں طرف تلاش پارٹیاں روانہ کی گئیں تاکہ اس خبر کی صداقت معلوم کی جائے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا مٹی ساھو جو ہمیشہ چپ رہتا تھا۔ آن کرڈھب باڑی والے میدان میں مقیم ہوا۔ رانی ستیہ بھاما اور چوٹی دیوی کیلئے ان میں مقیم ہوا۔ رانی ستیہ بھاما افواہ کے بارے میں معلوم کرنی تھیں۔ اس مٹی ساھو نے پوچھنے پر کاغذ پر کچھ ایسا جواب لکھا۔ جس سے ان کی کچھ ہمت بندھ گئی اور ان کے خیال کو تقویت ملی کہ شاید بھٹلا راج کمار ابھی زندہ ہے۔

کئی سال گزر گئے مگر یہ افواہ گشت لگاتی رہی۔ ان سے متاثر ہو کر 3 ستمبر 1917ء کو رانی ستیہ بھاما نے مہاراجہ برودان کو حسب ذیل خط لکھا۔

عالی جناب! میری آشر باد۔ میں آنجنابی راجہ کی نارائن کی بیوہ اور آنجنابی راجہ راجندر نارائن کی ماں ہوں۔ میرے تین پوتے تھے۔ تینوں عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ تینوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ اور اسی طرح ہماری نسل کا چراغ گل ہو چکا ہے۔ آٹھ سال ہوئے میرا منجھلا پوتا اپنی بیوی اور سالے کے ساتھ دارجلینگ گیا تھا۔ جہاں وہ خون کے دست کے عارضہ میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ عرصہ سے یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ وہ زندہ ہے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد جب اس کی ارٹھی شمشان لے

جائی گئی تو سخت بارش اور ہوا کا طوفان آیا اور لوگ اس کی لاش کو بغیر جلانے کہیں پناہ لینے چلے گئے اس دوران وہاں ایک سنیا سی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آٹھلا اور میرے پوتے کو اٹھا کر لے گیا اور علاج معالجہ سے اسے تندرست کر لیا کہتے ہیں کہ میرا پوتا اب ان کے ساتھ دنیا و مافیہ سے بے نیاز کھوتا پھر رہا ہے جو لوگ دارجلینگ گئے تھے ان کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ میرے بھٹلے پوتے کی موت کے وقت جو دارجلینگ میں قیام پزیر تھے اور آپ ہی نے ارٹھی کے لئے گنگا جل اور کٹی کے پتوں کا انتظام کیا تھا اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ یہ افواہ کہاں تک درست ہے۔ کیا بھٹلے راج کمار کی لاش واقعی جلادی گئی تھی؟ اگر آپ مجھے اس امر سے واقف کریں تو کچھ صبر کا سامان ہو جائے گا۔

مہاراجہ برودان نے جواب میں تحریر کیا کہ ان کی کوشی شمشان سے کچھ ہی فاصلے پر پہاڑ کی بلندی پر تھی جہاں سے شمشان نظر آتا تھا انہوں نے لوگوں کا مجمع تو ضرور دیکھا تھا اور انہیں بتایا گیا تھا کہ بھووال کے بھٹلے راج کمار کی ارٹھی لائی گئی ہے مگر موسم کی خرابی کی وجہ سے خود ارٹھی میں شریک ہونے کے لئے شمشان نہ جاسکے تھے نہ انہیں اتنے سال بعد یہ یاد تھا کہ ارٹھی رات میں یا دن میں لائی گئی تھی اس کے علاوہ انہیں کچھ اور معلوم نہیں۔

اس طرح کئی سال گزر گئے تینوں راجکار مر چکے تھے ان کی بیوہ رانیاں اور راج باڑی سے اپنے عزیزوں کے ہاں منتقل ہو چکی تھیں 1920ء تک تمام جاگیر کا انتظام کورٹ آف وارڈز نے سنبھال لیا تھا۔ بیوہ رانیاں کو ان کے شوہروں کے حصہ کی آمدنی ملتی رہی۔ اور اس وقت رانی بھادوی دیوی کو تقریباً بیس لاکھ روپیہ مل چکا تھا جب کا سب سمجھ رہا تھا کہ کام آ رہا تھا۔ اپنے نام پر کلکتہ میں اس نے کئی کئی خیمیاں خرید لی تھیں۔ اب وہ ایک بہت بڑا آدمی بن چکا تھا اور سلطنت برطانیہ نے اسے رائے بہادر کا خطاب بھی عطا کر دیا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جب دسمبر 1920ء میں وہ تک دھڑنگ ایسی جٹائیں ایسی داڑھی اور تمام بدن پر بھجوت

لنے والا ساھو ڈھا کہ کے بک لینڈ بندر نمودار ہوا تھا۔ اپریل 1921ء تک یہ خبر تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی کہ ڈھا کہ میں ایک خوبصورت سنیا سی نے دریا کے کنارے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ جس کے متعلق افواہ ہے کہ وہ بھووال جاگیر کا بھٹلا راج کمار ہے۔ جو بارہ سال قبل دارجلینگ میں مر چکا تھا۔ دور دراز علاقوں سے ہزاروں لوگ اسے دیکھنے کے لئے آنے لگے۔

12 اپریل 1921ء کو یہ سنیا سی اس جگہ سے اٹھ کر راج باڑی کے ڈھب باڑی والے میدان میں ایک آم کے درخت کے نیچے چھوٹی رما کر بیٹھ گیا۔ یہ خبر بھٹلے راج کمار کی بہن جیوت دیوی تک پہنچی چکی تھی۔ لیکن حکومت کی ناراضگی کے خیال سے وہ اب تک کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ لیکن جب سنیا سی ڈھب باڑی کے میدان میں آن بیٹھا تو دوسرے روز ہی اس نے سنیا سی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

غروب آفتاب کے بعد سنیا سی جیوت دیوی کے گھر پہنچا اور گھر کے برآمدے میں ایک چٹائی پر نگاہ نیچے کر کے بیٹھ گیا اس کے قریب ہی جیوت دیوی آگئی وادی رانی ستیہ بھاما اور جیوت دیوی کی دو بیٹیاں اور کچھ عزیز بیٹھ گئے اور سب لوگ سنیا سی کو انتہائی غور سے دیکھنے لگے۔ لیکن تمام جسم پر بھجوت، ایسی داڑھی، دراز جٹائیں، اور شام کے دھندلکے کی وجہ سے وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے کہ آیا بھٹلا راج کمار وہی ہے۔ قد وہی تھا چال ڈھال وہی تھی۔ پھر اس کے خدو خال وہی تھے مگر اندھیرے کی وجہ سے آنکھوں کا رنگ نہ دیکھا جاسکتا تھا۔ جیوت دیوی نے سنیا سی سے پوچھا۔

”ساھو بابا..... تم یہاں کتنے دن قیام کرو گے؟“ ”بہر حال دریا سے ہم پتر میں اٹھان کرنے چلے جائیں گے۔“ سنیا سی نے دم آواز میں کہا۔

اس شام گھر والوں نے کچھ پھل دینی اور بیٹھ سنیا سی کے سامنے رکھا۔ مگر اس نے سوائے تھوڑے سے ٹیکے کے کچھ نہ کچھا اور اٹھ کر چلا گیا۔ گھر والوں نے مشورہ کیا کہ اسے کچھ روز سنیا سی کو پھر دعوت پر بلایا جائے اور دن کی

روشنی میں اسے شناخت کیا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن گاڑی بھیج کر سنیا سی کو بلوایا گیا۔ دن کے بارہ بجے وہ پھر جیوت دیوی کے گھر پہنچ گیا۔ اس دفعہ اسے بیٹھک میں کرسی پر بٹھایا گیا گھر کے سب لوگ وہاں آ گئے۔ جیوت دیوی اور ستیہ بھاما بھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ قریب ہی ایک مٹی مرصع چوٹی چوٹی رکھی تھی۔ جس کے ایک سرے پر جیوت دیوی کا بہنوئی بیٹھ گیا سنیا سی نے رانی ستیہ بھاما کو ہندی زبان میں کہا۔ ”تم کو چوٹی پر بیٹھنا چاہئے۔“

رانی ستیہ بھاما کھک کر چوٹی کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔ مگر سنیا سی پھر بولا۔ ”اٹھ کر آرام سے چوٹی پر بیٹھو۔“ رانی ستیہ بھاما کھک کر چوٹی پر سنیا سی کے مقابل بیٹھ گئی۔ سنیا سی نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور پھر رانی ستیہ بھاما کا پاؤں پکڑ کر اپنی طرف کھینچا آہستہ سے گردن ہلا کر کہنے لگا۔ ”توڑھی کو بڑا دکھ ہے۔“

اس کے بعد اس نے جیوت دیوی کی دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جیوت دیوی سے کہا۔

”یہ دونوں تمہاری بیٹیاں ہیں؟“ اور اس لڑکے کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے۔“

پھر اس کے بھانجوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ دونوں تمہاری بہن کے بیٹے ہیں۔“ آخر میں جیوت دیوی کی بھانجی کٹنی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”کیون ہے؟“

جیوت دیوی نے جواب دیا۔ ”یہ میری بڑی بہن کی بیٹی ہے۔“ یہ سنتے ہی سنیا سی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو جوان کٹنی دیوی اس وقت تک بیوہ ہو چکی تھی۔ اسنے میں جیوت دیوی کا بھانجا سنیا سی کے مقابل آکر اسے بھٹلے راج کمار کا فوٹو دکھانے لگا۔ جوں ہی سنیا سی کی نگاہ فوٹو پر پڑی اس کے آنسو بہنے لگے اور اس نے فوٹو کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس کے بعد جیوت دیوی کا بھانجا پھر اسے چھوٹے راج کمار کا فوٹو دکھانے لگا۔ آنجنابی بھٹلے راج کمار کچھوٹے راج کمار سے بہت محبت تھی۔ فوٹو پر نظر پڑتے ہی سنیا سی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور پھر اس نے اپنی آنکھوں پر اپنی ہتھیلی رکھ لی۔ یہ دیکھ کر جیوت دیوی سنیا سی سے مخاطب ہوئی۔

”سنیاسی تم تو تیا گی (تارک الدنیا) ہو۔ پھر اتنا کس کے واسطے دوتے ہو؟“

”ہم مایا (فلس) کی وجہ سے دوتے ہیں۔“
”لیکن تم تو تیا گی ہو۔ پھر فلس کس کے لئے دوتے پر مجبور کر رہا ہے۔“ جیو تر دیوی بولی۔

سنیاسی خاموش رہا۔ تو جیو تر دیوی پھر بولی۔
”کہتے ہیں کہ میرا جھٹلا بھائی دارجلینگ میں مر گیا اور جب اسے جلانے کے لئے ششمان لے گئے تو ہوا اور بارش کا ایک خوف ناک طوفان آیا۔ تو لوگ اس کی اتھی چھوڑ کر پناہ لینے کی غرض سے کہیں چلے گئے۔ اور جب طوفان ٹھنسنے پر واپس لوٹے تو لاش غائب تھی۔ جو لوگ میرے بھائی کے ساتھ دارجلینگ گئے تھے۔ ان میں کچھ تو کہتے ہیں کہ لاش جلادی گئی تھی اور کچھ کہتے ہیں کہ جلانی نہ چاکی گئی اور.....“

ابھی جیو تر دیوی اپنا جملہ پورا نہ کر سکی تھی کہ سنیاسی بول پڑا۔

”نہیں نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اس کی لاش نہیں جلانی چاکی تھی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔“

اس پر سب لوگوں نے انتہائی انتہاک سے سنیاسی کو گھورتا شروع کر دیا۔ اور پھر سنیاسی کو جانچنے کے لئے جیو تر دیوی نے بنگالی زبان میں کہا۔

”سنیاسی! تمہارے جسم کا ہر حصہ۔ چال و حال اور تمہارے خدو خال ہو۔ ہر ہوسیرے بھائی جیسے ہیں۔ کیا تم وہی ہو؟“

سنیاسی نے بھی ہندی میں جواب دیا۔
”نہیں بابا۔ میں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔“

اس کے بعد سنیاسی کے سامنے کھانا لایا گیا۔ جیو تر دیوی نے دیکھا کہ سنیاسی کے ہاتھ کی شہادت والی انگلی ٹھٹھے راج کمار کی طرح دوسری تمام انگلیوں سے بڑی تھی اور ٹھٹھے راج کمار کی طرح سنیاسی فقرہ لیتے وقت زبان کچھ باہر نکالتا تھا وہی دینگلیوں آکھیں۔ وہی انگلیوں کے ناخن، وہی آواز وہی قد تھا۔ لیکن تمام جسم پر بھوت، لمبی داڑھی، لمبی جٹاؤں نے ہیبت بدل کے رکھ دی تھی کہ اس

روز بھی کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جیو تر دیوی نے کوشش کی کہ سنیاسی کچھ روز اس کے گھر پر قیام کر لے مگر سنیاسی کو اٹھنے کے لئے چٹا گنگ ضلع میں چندراتھ کے مقام پر پہنچتا تھا، دس روز بعد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ شام کو چار بجے چلا گیا۔ 20 اپریل 1921ء کو جیو تر دیوی کو خبر ہوئی کہ سنیاسی نے چندراتھ سے واپس لوٹ کر ایک لینڈ بند پر آسن جمالیا ہے اس نے اپنے بیٹے کو اور ایک بڑے زمیندار رائے پرشاد کو ڈھاکہ بھیج کر سنیاسی کو بچے پر بلوایا اور اسے بیشک میں ٹھہرا دیا گیا۔ جہاں پہلے ہی آنجہانی بڑے کمار، چھوٹے کمار، راجہ راجندر ناتھ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے فوٹو آویزاں کر دیئے گئے تھے۔ روزانہ کے سوراخ میں سے جیو تر دیوی نے جھانک کر دیکھا کہ ان تصویروں کو دیکھ کر سنیاسی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ دوسرے روز سنیاسی علی راج تالاب سے اٹھان کر کے لوٹا اور کہنے لگا۔
”میری بیشک کی صفائی کر دو۔“

یہ سن کر سب کو یقین ہو گیا کہ سنیاسی کے بھیس میں سوائے ٹھٹھے راج کمار کے اور کوئی نہیں۔ کیونکہ جس بیشک میں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ جیو تر دیوی کے بھانجے کی بیشک تھی۔ اس کے بعد جیو تر دیوی نے سنیاسی سے اصرار کرنا شروع کر دیا وہ اپنے جسم پر بھوت ملنا ترک کر دے۔ مگر اس نے اول کوئی پرواہ نہ کی لیکن جیو تر دیوی اور ستیہ بھاما کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔

3 مئی 1921ء کو جب سنیاسی اٹھان کر کے تالاب سے لوٹا تو جیو تر دیوی اور گھر کے دیگر افراد نے اس کے جسم کو پہلی بار بغیر بھوت ملے ہوئے اپنے اصلی چہرے میں دیکھا۔ وہی سفید سرخی آمیز رنگت، وہی دانی ٹانگ پر بچپن میں گاڑی کے پیسے پھر جانے کا نشان وہی بانیں بازو پر پھوڑے کے زخم کا گول نشان موجود تھا۔ گھر کے تمام افراد نے بخوبی شناخت کر لیا کہ سنیاسی کے روپ میں بارہ سال قبل مرجانے والا بھووال کا جھٹلا راج کمار رامیندر نارائن ہے۔ مگر سنیاسی اب بھی اس بات سے انکار کر رہا تھا۔ فوراً ہی گھر کے ملازمین اور خدمت

گروں کے ذریعے یہ بات بچے پورا اور قریب وجہار میں آگ کی طرح پھیل گئی اور 4 مئی 1921ء کو علی راج ہی انسانوں کا ایک جم غفیر بچے پورا اندیا اور میدان میں جمع ہو گیا۔ سنیاسی اب بھی خود کو جھٹلا راج کمار تسلیم کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس پر جیو تر دیوی نے سنیاسی سے بر ملا کہا۔ ”تمہارے جسم پر سارے نشانات تمہارا رنگ، تمہاری آنکھیں، تمہارا قد تمہاری آواز اور تمہاری ہر چیز میرے ٹھٹھے بھائی جیسی ہے۔ تم وہی ہو۔ سنیاسی تم اپنی اصلی شخصیت کا اظہار کرو۔ جب تک تم ایسا نہ کرو گے میں کھانا پینا بالکل ترک کر دوں گی۔“

باہر لا تعداد انسانوں کا ہجوم جمع ہو کر سنیاسی کو دیکھنے کا اصرار کر رہا تھا۔ لہذا سہ پہر کو اسے باہر لا کر جمع کے درمیان ایک اونچے چوڑے پر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا تمام جمع التجا کرنے لگا کہ وہ اپنی اصلی شخصیت ظاہر کر دے۔ شام کو پانچ بجے سنیاسی نے آخر کار جمع کے سامنے تسلیم کر لیا کہ وہ جھٹلا راج کمار رامیندر نارائن ہی ہے جسے دنیا بارہ سال سے سرا ہوا سمجھ رہی تھی۔ ”راج کمار کی ہے“ کا قلم شکاف نعرہ اٹھا اور لوگوں نے وہیں ٹھہرانے پش کرنے شروع کر دیئے۔

حکومت بنگال اور خصوصاً کورٹ آف وارڈز کے حالات روز بروز خدشہ تر ہوتے جا رہے تھے۔ جب سنیاسی نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ بھووال کا جھٹلا راج کمار ہے تو مزاحمتیں نے بجائے کورٹ آف وارڈز کو زمین کا لگان دینے کے سنیاسی کو دنیا شروع کر دیا۔ حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے کورٹ آف وارڈز کے منیجر سر سید غلام نے جن کے زیر انتظام جاگیر تھی 5 مئی 1921ء کو ہی ڈھاکہ کے کلکٹر کو ایک خفیہ رپورٹ تحریر کر کے روانہ کی جس میں ان تمام واقعات کی تفصیل دراطلاع دی گئی اور آگاہ کیا گیا کہ سنیاسی کا طرف داری میں عوام کا جوش و خروش اتنا بڑھ چکا ہے کہ فوراً کارروائی نہ کی گئی تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے اسی قسم کی دوسری رپورٹ بچے پورا تھانے کے افسر علی کے حکام کو ارسال کی۔

لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ جوق در جوق ہزاروں کی تعداد میں بچے پورا میں روزانہ امنڈتے چلے آ رہے تھے۔ مجبوراً ایسٹ بنگلا ریلوے کو اس بے پایاں ہجوم کو بچے پورا پہنچانے کے لئے دو دور کے مقامات سے انیشل ٹرینیں چلائی پڑیں 15 مئی 1921ء کی سہ پہر تک لاکھوں انسانوں کا جم غفیر راجہاری کے قریب میدان میں جمع ہو چکا تھا اور سنیاسی کو دیکھنے کے لئے نعرے لگا رہا تھا۔ چار بجے شام سنیاسی ایک ہاتھی پر سوار ہو کر انسانوں کے اس سیلاب کے درمیان سے گزرا۔ لوگوں نے سنیاسی کو اس کے حقوق دلانے کی غرض سے ایک ایسوسی ایشن قائم کر دی اور لاکھوں روپیہ چندہ جمع ہو گیا راج کمار کی تینوں بیٹیوں، اس کی داوی رانی ستیہ بھاما، بڑے راج کمار کی بیوہ رانی سرجو بالا اور دوسرے تمام عزیز سنیاسی کو اچھی طرح پرکھنے کے بعد جھٹلا راج کمار تسلیم کر چکے تھے۔ مگر ٹھٹھے راج کمار کی بیوی رانی بھادونی دیوی اور اس کے بھائی رائے بہادر مستند راتھ نے اسے جھٹلا راج کمار تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جھٹلا راج کمار بارہ سال پہلے دارجلینگ میں نصف شب کے قریب ان کی نظر کے سامنے فوت ہو چکا تھا اور دوسرے دن صبح دس بجے اس کی لاش جلا کر رکھ کر دی گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ یہ سنیاسی دراصل پنجاب کے قصبہ اوجلا کا رہنے والا شخص مال سنگھ ہے جسے چند با اثر لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر فرضی جھٹلا راج کمار بنا کر رکھ کر دیا ہے۔

ادھر راج کمار کی تینوں بہنوں نے ڈھاکہ کے کلکٹر کو ایک عرض داشت پیش کی کہ تحقیقات کرائی جائے کہ آیا یہ سنیاسی جھٹلا راج مار رامیندر نارائن ہی ہے اور اگر تحقیق سے یہ بات ثابت ہو جائے تو پھر ٹھٹھے راج کمار کو اس کے حقوق واپس تفویض کئے جائیں۔ مگر اس عرض داشت پر کوئی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔

ادھر مستند راتھ نے سنیاسی کو جعل ساز ثابت کرنے کی تک و دو شروع کر دی۔ وہ کہتا تھا کہ اگر سنیاسی کو جھٹلا راج کمار تسلیم کر لیا گیا تو وہ خود جاگیر کی تیسرے

جسے کی آمدنی سے محروم ہو جائے گا جو وہ اپنی بہن رانی بھادی دیوی کے ذریعے وصول کر رہا تھا۔ یہ بھی یقینی تھا کہ ایسی صورت حال میں دارجلینگ میں اس نے اور ڈاکٹر آشوتوش نے سازش کر کے بھٹلے راج کمار کی جان لینے کی جو کوشش کی تھی۔ اس کا پردہ چاک ہو جائے گا، رانی بھادی دیوی پورے طور پر اپنے بھائی کے ہاتھ میں کھ پتی بن چکی تھی۔ اس کو اندیشہ تھا کہ بھائی قانون کے شکنجے میں کس لیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اس نے بھٹلے راج کمار کے ساتھ جو زندگی گزاری تھی۔ وہ بھی نہایت ناخوشگوار تھی۔ لہذا اس نے ہر حالت میں اپنے بھائی کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علاوہ ازیں حکومت بنگال بھی کورٹ آف وارڈز کے ذریعے سنیا سی کی پوری مخالفت کر رہی تھی۔

29 مئی 1921ء کو سنیا سی نے ڈھاکہ کے کلکٹر سے ملاقات کر کے اپنے حقوق کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ اس نے اول تا آخر اپنی سرگزشت کے تفصیل وار واقعات بتائے۔ مگر کلکٹر نے جواب دیا کہ ”اگر سچے ہو تو عدالت میں باقاعدہ دعویٰ کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔“ پھر 3 جون 1921ء کو کلکٹر ڈھاکہ نے حسب ذیل نوٹس جاری کیا۔

ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ بورڈ آف ریونیو بنگال کے پاس اس امر کا ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ بھووال کا منجھلا راج کمار 8 مئی 1901ء کو دارجلینگ میں مر گیا تھا اور اس کی لاش جلا کر رکھ کر دی گئی تھی۔ یہ سادھو جو خود کو منجھلا راج کمار ظاہر کرتا ہے محض ایک جعل ساز ہے۔ جو کوئی اس کو لگان باچندہ دے گا وہ اپنے اس فعل کا خود مدبر ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک اور نوٹس جاری کر دیا جس کی رو سے سب پور میں سنیا سی کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا اور وہ کئی سال جے پور نہ جاسکا۔ اس عرصہ میں وہ اپنی دادی ستیہ بھما اور بہن جیوت دیوی کے ساتھ ڈھاکہ میں سکونت پذیر رہا۔

مگر حکومت بنگال اور ستیندر ناتھ کی مخالفت، عوام

کے جوش کو ٹھنڈا نہ کر سکی۔ پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں شائع کئے گئے۔ شاعروں نے سنیا سی کے متعلق کئی غزلیں کہیں۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر خوش الحان لڑکے یہ نظمیں اور گیت گا کر پمفلٹ اور کتابیں بیچتے رہے۔ بھووال ایسوسی ایشن کے پرجوش کلارکن دیہاتوں اور شہروں میں لکچر دیتے پھرتے تھے۔ اس عرصہ میں سنیا سی نے کئی مرتبہ رانی بھادی سے ملاقات کرنے کی کوشش کی مگر کام نہ رہا وہ سنیا سی کو اپنا شوہر ہی تسلیم نہ کرتی تھی۔ 22 جولائی 1922ء کو رانی ستیہ بھما نے ڈھاکہ سے اپنے پوتے کی بیوی رانی بھادی دیوی کو حسب ذیل خط لکھتے بھیجا۔

”خوش نصیب بھادی دیوی!“

میرے بیٹے راجہ راجندر نارائن کا منجھلا بیٹا رامیندر نارائن زندہ ہے ایک برس سے زیادہ عرصہ ہوا کہ جو ایک سنیا سی کے روپ میں ڈھاکہ میں وارد ہوا تھا اور جس کو بے شمار حرازمین اور شرفائے منجھلا راج کا تسلیم کر لیا تھا۔ اسے میں نے اپنی آنکھوں سے نہایت غور سے دیکھا ہے میں نے اسے جے پور میں بھی دیکھا تھا اور اب کئی روز سے روزانہ ہی اسے گھر دیکھتی ہوں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ میرا منجھلا پوتا رامیندر نارائن ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے دیکھتے ہی پہچان لو گی جب سے وہ ڈھاکہ میں وارد ہوا ہے تم لوگوں میں سے کسی نے آ کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی ہے۔ لہذا میں تمہیں مشتقانہ طور پر دعوت دیتی ہوں کہ آ کر خود حقیقت اپنی نظروں سے دیکھ لو۔ ضرور آ جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خاندان کی شہرت اور عزت کو دھرم اور انصاف کے مطابق بچاؤ!

رانی بھادی دیوی نے اس خط کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ 15 دسمبر 1922ء کو رانی ستیہ بھما کا انتقال ہو گیا۔ آخر کوشش کے طور پر دسمبر 1926ء میں سنیا سی نے بنگال کے بورڈ آف ریونیو کے سامنے اپنے حقوق کی بازیابی کی درخواست پیش کی مگر بورڈ نے اسے بھی مسترد کر دیا۔

بالآخر ہر طرف سے مایوس ہو کر 24 اپریل

1930ء کو سنیا سی نے ایک دیوانی دعوئی ڈھاکہ کی عدالت میں جاگیر کے قبضے اور بازیابی کا دائرہ کر دیا۔ لہذا ہارولڈ عالیہ بذریعہ اس کے فریق بنائے گئے۔ سنیا سی کی طرف سے چودہ پیرسٹر اور وکلاء نے اور مدعا علیہ کی طرف سے وکیل سرکار رائے بہادر سسندکار کمار گھوش اور تین دوسرے پیرسٹروں اور وکیلوں نے مقدمہ کی پیروی کی۔ دراصل مقدمہ میں اصل مخالفت کرنے والا فریق رانی بھادی دیوی ہی تھی۔ رانی سر جو بالا دیوی نے نہ صرف سنیا سی کی کوئی مخالفت نہ کی بلکہ اس نے عدالت میں سنیا سی کو اپنا دیور اور امیندر نارائن تسلیم کر کے اس کے ہدف کی پوری پوری حمایت کی۔ باقی دودعا علیہ نے مقدمہ میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ سنیا سی نے عدالت میں بیان دیا۔

”میں بھووال کا منجھلا راج کمار رامیندر نارائن ہوں مدعا علیہ رانی بھادی دیوی میری دھرم بھتیجی ہے جو کل طور پر اپنے بھائی رائے بہادر ستیندر ناتھ کے زیر اثر ہے۔ 18 اپریل 1909ء کو میں اپنے سالہ لارے بہادر ستیندر ناتھ کی ترغیب پر سیاحت کے لئے جے پور سے دارجلینگ کے لئے روانہ ہوا۔ اس وقت سوائے آنکھ کے مجھے کوئی دوسرا عارضہ نہ تھا۔ میرے ساتھ میری بھتیجی رانی بھادی دیوی، اس کا بھائی ستیندر ناتھ ڈاکٹر آشوتوش انار خاندانی ڈاکٹر اور میرے غلے کے لوگ تھے۔ 20 اپریل کو ہم سب بائیسٹ سائیز گمشدہ میں دارجلینگ میں قیام پذیر ہوئے۔ دارجلینگ پہنچنے کے چودہ پندرہ دن بعد ایک رات مجھے پیٹ میں گرانی اور دم محسوس ہوا۔ اس رات میں نے اپنے ڈاکٹر آشوتوش سے اس کا ذکر کیا۔ دوسرے دن ایک یورٹین ڈاکٹر نے آ کر میرا معائنہ کیا۔ اس نے میرے لئے ایک نسخہ تجویز کیا تین دن تک میں بیمار رہا مگر کچھ افاق نہ ہوا۔ اس رات آٹھ یا نو بجے ڈاکٹر آشوتوش نے ایک گلاس میں مجھے دوا پلائی۔ دوا کے بہت ہی میرے سینے میں جلن شروع ہو گئی اور تین یا چار منٹوں بعد میں سخت بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس مجھے تے ہو گئی۔ تکلیف کی شدت سے میں چیخنے لگا

اور میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”آشوتوش تم نے مجھے کیا پلایا ہے؟“

8 مئی 1909ء کی صبح مجھے یکے بعد دیگرے کئی دست خون کے آئے اور شدید نفاہت مجھ پر غالب آ گئی اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اپنے آپ کو چار سنیا سیوں کے درمیان جنگل میں ایک جھوپڑی میں پڑا ہوا پایا۔ ڈاکٹر آشوتوش نے مجھے جوہر دیا تھا وہ دماغ میں کچھ اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ ہوش ہونے پر مجھے یہ بھی یاد نہ تھا کہ میں کون ہوں۔ کہاں رہتا تھا میرے عزیز واقارب کون تھے۔ مختصر یہ کہ میں اپنی گزشتہ تمام زندگی کو قطعی فراموش کر چکا تھا۔ ہر چند اپنے دماغ پر کئی دفعہ زور ڈالا۔ مگر کچھ یاد نہ آیا۔ اس کے ساتھ مجھے دنیا اور اس کی کسی شے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ان سنیا سیوں کے ساتھ میں ملک ملک، شہر شہر اور دوا در دوا پھیری لگاتا رہا۔ گھومتے پھرتے چار پانچ سال بعد ہم کشمیر کے مقام امر ناتھ جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر دھرم داس نے مجھے اپنا چیلہ بنالیا اور اس کا نام میرے بازو پر داغ دیا گیا جواب تک موجود ہے۔ کشمیر سے گزر کر ہم تبت اور آخر کار نیپال جا پہنچے۔ ایک شام نیپال میں ایک مقام جس کا نام ہر اچھو پتر ہے جا کر مقیم ہوئے وہاں مجھے یاد آیا کہ میں کبھی ڈھاکہ میں رہتا تھا سوائے اس بات کے مجھے مزید کچھ یاد نہ آیا۔ میں نے اپنے گرو بابا دھرم داس سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے کہا۔

”اب تم جاسکتے ہو۔ تہا وقت آ گیا ہے۔ اپنے گھر واپس لوٹ جاؤ۔ اگر آئندہ کبھی تم ملایا پقا پو پاسکو اور سنیا سی لینا چاہو تو میں تمہیں ہر دور کے مقام پر ملوں گا۔“ یہ سن کر میں نے سنیا سیوں کو خیر باد کہا اور تہا وہاں سے روانہ ہوا۔ سفر کی صعوبتیں اٹھاتا اور کئی مقامات سے گزرتا ہوا آخر کار ایک روز آدھی رات کے قریب ڈھاکہ کے ریلوے اسٹیشن آ پہنچا۔ جوں ہی میں اسٹیشن پر اترا مجھے ہر چیز مانوس سی محسوس ہونے لگی۔ حالانکہ سنیا سی کے دوران ہم کبھی ڈھاکہ کی طرف نہیں گزرے تھے وہ رات میں نے اسٹیشن پر گزاردی۔ صبح صدر گھاٹ پہنچ کر دریا

کو پار کیا اور بک لینڈ بند پر پہنچ کر میں آسن جہاں کڑھ گیا لوگ بند پر سے گزر رہے تھے۔ چند شکلیں مانوس معلوم ہونے لگیں اور چند کے نام بھی یاد آ گئے لیکن اب بھی یہ یاد نہ آیا کہ میں ایک راجہ کا بیٹا ہوں۔ اسی طرح میں بند پر چار بیٹے تک بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ لوگ مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ تو بمودال کا بیٹھلا راجہ کا مکار معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح میری یادداشت عود کر آئی کہ میں ہی بیٹھلا راجہ کا مکار ہوں۔ پھر قاسم پور کا زمیندار رائے پر شاہ بند پر پہنچا۔ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھا وہ مجھے قاسم پور لے گیا۔ جہاں میں نے چار پانچ دن گزارے اس کے بعد رائے پر شاہ نے مجھے ایک ہاشی پر سوار کر کے بچے پور پہنچا دیا اور میں مذہب باڑی کے متصل میدان میں ایک درخت کے نیچے آسن جہاں بیٹھ گیا۔ جہاں آہستہ آہستہ مجھے اپنی راجہ باڑی گھر، دروازہ اور عزیز واقارب بھی یاد آ گئے۔ عدالت کے رو برو کئی ایسے معزز اور قابل اعتماد گواہان نے بیان دیے جو مئی 1909ء میں بیٹھلا راجہ کمار کی معروضہ موت کے وقت دارجلنگ میں سکونت رکھتے تھے ان کے بیان کے مطابق جب انہیں اطلاع ملی کہ بمودال کے راجہ کمار کی موت واقع ہو گئی ہے تو اسی کے جلوس میں شریک ہونے کے لئے ”اسٹیت سائیڈ“ پہنچے رات نو بجے اسی کا جلوس روانہ ہوا۔ جلوس میں راجہ کمار کی پارٹی کے لوگوں کے علاوہ کوئی پچیس دوسرے آدمی بھی تھے ان میں باؤ پندی موہن نیوگی ججسٹریٹ اور کئی دوسرے معزز زمین بھی تھے۔ شمشان کوئی سے کوئی دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک گھنٹہ میں اسی کا جلوس شمشان پہنچ گیا۔ ابھی اسی کندھوں سے اتار کر زمین پر رکھی ہی تھی کہ بارش اور ہوا کے شدید طوفان نے آن کھیرا۔ بجلی کی بے پناہ چمک اور بادلوں کی گرج سے لوگوں کے دل دہلنے لگے۔ سب لوگ اسی کو وہیں چھوڑ کر پناہ لینے کی غرض سے پہاڑی پلڈنڈی پر چڑھ کر اور کئی موڑ کاٹ کر کچھ دور ایک مذبح خانہ میں چلے گئے ایک گھنٹہ بعد جب یہ طوفان تھا تو لوگ واپس لوٹے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کھٹ تو رکھی ہوئی ہے مگر لاش غائب تھی۔

سب لوگ خوف سے سہم گئے گو بارش تو بہت ہو چکی تھی مگر بجلی کی کوند اور بادلوں کی گرج اب بھی جاری تھی کچھ دیر اور اصرار دیکھا مگر لاش کا کوئی سراغ نہ ملا۔ مجبوراً اگر ہم لوٹ آئے۔

ادھر راجہ کمار کی پارٹی کے لوگوں کو خوف ہوا کہ بڑے راجہ کمار اور حکمران خاندان کو کیا جواب دیں گے۔ یہ تو بہت ہی بڑا پاپ اور بے عزتی تھی کہ ایک راجہ کمار کی لاش بغیر جلانے ہی لوگ اسی کو کیلا چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے اس شرمناک اور پر خطر صورت حال سے ششٹے کے لئے سچیدر ناتھ نے یہ ڈرامہ کھیلا کہ دوسرے روز ایک فرضی اسی تیار کر کے دن کے وقت شمشان میں چلائی گئی۔ اس اسی کی لاش کی شکل وغیرہ کسی کو نہ دکھائی گئی تھی۔ اس لئے مقدمہ کے دوران یہ موقف اختیار کیا گیا کہ بیٹھلا راجہ کمار کی موت آدمی رات میں ہوئی تھی اور اس کی اسی دوسرے دن صبح دس بجے چلائی گئی تھی۔

کافی تلاش کے بعد سنیا سی ورثن داس کا سراغ مل گیا۔ وہ ان چار سنیا سیوں میں سے ایک تھا جن کے ساتھ ڈھاکہ میں وارد ہونے والا سنیا سی برسوں رہ کر ملک ملک پھرتا رہا تھا ورثن داس نے عدالت کے رو برو بیان دیا۔

”میں اور ہم داس ناگا ایک ہی گرو ہر نام داس کے چیلے ہیں ہم دونوں دو سنیا سیوں کے ساتھ کھوئے پھرتے دارجلنگ جا پہنچے تھے۔ وہاں پہنچ کر حسب معمول دن تو بازاروں میں پھیری لگا کر گزار دیا کرتے اور رات ایک پہاڑی کی کھوہ میں گزارا کرتے تھے جو شمشان کے قریب نشیب میں تھی۔ جب ہم دارجلنگ میں تھے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اس رات اپنی کھوہ میں بیٹھے ہوئے ہم چاروں سادھو مذہبی امور پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ ایک چہرہ رات گزرے آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا گئی اور پھر بجلی بجی بارش ہونے لگی۔ اس وقت ہم نے کھوہ کے باہر۔ ”ہری بول۔ ہری بول۔“ پکارنے کی آواز بھی سنیں۔ گرو نے مجھے کہا۔

”نیکو باہر جا کر دیکھو کیا بات ہے۔“ وہ مجھ میں عمر میں کافی بڑے تھے اور پیارے مجھے نیکو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میں کھوہ سے باہر نکلا تو شمشان میں لوگوں کا مجمع نظر آیا۔ ان کے ساتھ ہی لائینیں تھیں۔

گرو نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا معاملہ ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”شمشان میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔“

اس پر گرو نے کہا۔ ”آمد آ جاؤ۔ وہاں تمہارا کیا کام؟“

میں کھوہ میں داخل ہو گیا۔ باہر ہوا کے جھکڑ بہت زوروں سے چل رہے تھے۔ ہم گیان دھیان کرنے بیٹھ گئے۔

جب کافی وقت ہو گیا تو گرو کہنے لگے۔

”باہر ایک مجمع ”ہری بول۔ ہری بول۔“

پکار رہا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ اب کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔ تم میں سے ایک جا کر معلوم کرے کہ کیا ماجرا ہے؟“

میں ہی قیل میں باہر نکلا۔ دیکھا کہ ہوا کا طوفان کم ہو چکا ہے۔ مگر بارش ہو رہی تھی۔ مجھے شمشان سے ایک خفیف سی آواز سنائی دی۔ میں ادھر دیکھنے لگا۔ آواز پھر سنائی دی۔ میں غور سے سننے لگا اس دفعہ پھر آواز سنائی دی۔ میں نے گرو سے کہا کہ شمشان سے کوئی آواز سنائی دے رہی ہے انہوں نے اندر سے پوچھا۔

”آواز کیسی؟“

میں نے جواب دیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مہربانی کر کے آپ بھی باہر آ جائیں۔ گرو باہر نکل آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے۔ ”آواز کدھر سے آ رہی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مشرق سے سنائی دے رہی تھی۔“

مشرق میں ہی ہماری کھوہ سے کچھ بلندی پر شمشان تھا۔ انہوں نے کہا۔

”جلدی کرو لائین باہر لے آؤ۔“ میں لائین باہر لے آیا تو انہوں نے کہا۔ چلو میرے ساتھ آؤ۔ ہم شمشان پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک کھٹ پڑی ہے آس پاس کی آدمی کا بچہ نہ تھا۔

گرو کہنے لگے۔ ”لائین اوپر کرو۔ میں کپڑا ہٹا کر دیکھتا ہوں۔“

میں نے لائین اوپر کر لی۔ گرو نے گرہ کھول کر لاش کے منہ کے اوپر سے کپڑا نیچے پاؤں کی طرف سرکا دیا۔ لاش ایک جوان آدمی کی تھی گرو نے لاش کے منہ اور تھنوں پر ہاتھ رکھا اور چونک کر کہنے لگا۔

”نیکو ایہ آدمی تو ابھی زندہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اسے جلدی میں مردہ سمجھ کر یہاں اٹھا کر لائے ہیں۔ جاؤ اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی بلا لاؤ۔“

میں نیچے اتر کر کھوہ تک پہنچا اور دونوں ساتھیوں سے کہا جلدی چلو کہ وہاں ہیں وہ دونوں میرے ساتھ فوراً شمشان چلے آئے۔ تو گرو نے کہا۔

”یہ آدمی تو ابھی زندہ ہے مگر ہم اسے کہاں لے جائیں ہماری کھوہ میں تو اتنی گنجائش نہیں کہ اسے وہاں رکھ سکیں خیر ابھی تو اسے وہاں لے چلو۔“

ہم نے لاش کے اوپر کی چادریں اور کھٹ تو وہیں چھوڑیں۔ گرو بولے۔

”پھرتی کرو۔ بارش تیز ہے۔“

ہم جب اس آدمی کو اٹھا کر طے تو دیکھا کہ پہاڑ اور بارش کی سر دی کی وجہ سے اس کا جسم کچھ کانپ رہا تھا اور کبھی کبھی خفیف سی کراہنے کی آواز بھی نکل جاتی تھی۔ گرو کہنے لگے۔

”یہ آدمی سر دی سے کانپ رہا ہے اس کے گلیے کپڑے اتار دو۔“

ہم کھوہ کے اندر داخل ہو گئے اس شخص کے بدن پر ایک بنیان اور کچھ دوسرے کپڑے تھے ہم نے وہ سب اتار دیے اور اسے ایک کبل میں لپیٹ دیا۔ اس کے بعد گرو کہنے لگے۔

”اس پہاڑی کے نیچے جو گھر نظر آ رہا ہے اسے وہاں لے چلو۔ بارش ہو رہی ہے راستے میں یہ پھر گلیا ہو جائے گا اس کے اوپر ایک اور کبل ڈال دو۔“

اس کے بعد ہم تینوں ساتھیوں نے اس شخص کو اٹھایا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ جب ہم اس

گھر کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ گرد کہنے لگے۔

”موسلا دھار بارش میں ہم چائی کہاں سے لائیں۔ چٹے سے تالا تو ڈرو۔ چٹے سے تالا تو نہ ٹوٹ سکا البتہ ابھی سے کنڈے کی زنجیر موڑ کر دروازہ کھول لیا گیا۔ ہم اس آدمی کو اٹھائے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اندر دیوار کے سہارے ایک دو چار پائی رکھی تھی۔ اس پر اسے لٹا دیا۔ رات ہم نے اس کمرے میں گزاری صبح مکان کا مالک آیا تو اس نے جو ہم چار سا دھوؤں اور اس آدمی کو دیکھا تو پوچھا۔

”کیا ماز ہے؟“

ہم نے جواب دیا۔ ”ہمارا ساسی بیمار ہو گیا ہے برسات کی وجہ سے ہم نے تمہارے گھر میں پناہ لے لی ہے۔“ اس شخص کا نام گرجا بھوشن تھا اس نے ہمیں ایک کنبل اور مہیا کر دیا اور کہیں سے ایک حکیم سے کچھ یونانی دوائیں لا کر دیں۔ شیشان سے لایا ہوا آدمی ابھی بے ہوش تھا۔ کچھ دیر اور گھر کے باہر لوگ جمع ہونے لگے ہم اس شخص کو اٹھا کر پہاڑی کے نشیب میں اترتے چلے گئے یہاں تک کہ گنجان جنگل میں جا نکلے۔ وہاں ہمیں ایک غیر آباد جمو پڑی نظر آئی اور ہم اس میں ٹھہر گئے۔ تین دن بعد اس شخص کو ہوش آ گیا مگر وہ بالکل مخبوط الحواس اور نیم پاگل انسان کی طرح حرکتیں کر رہا تھا۔ جمو پڑی میں ہم نے پندرہ دن قیام کیا۔ اس عرصہ میں اس شخص کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اس نے ہماری محبت اختیار کر لی۔ مگر اپنے بارے میں اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھا اور اس پر کیا زہری تھی؟ اس کے بعد ہم پانچوں بستی بستی اور ملک ملک گھومتے رہے۔ نیپال پہنچ کر وہ شخص ہم سے جدا ہو کر چلا گیا۔ اور آج جس شخص کو میں عدالت میں دیکھ رہا ہوں یہ وہی آدمی ہے جسے ہم دارچلیک کے مششان سے اٹھا کر اپنی کھوہ میں لے گئے تھے۔“

گرجا بھوشن رائے جس کے گھر میں شیشیوں نے رات گزاری تھی جنگلات کا ایک بڑا ٹھیکیدار تھا وہ اور اس کے بہت سے بڑی عدالت میں حاضر ہوئے

اور سب نے بیان دیا کہ جو کچھ درشن واس نے بھوشن رائے کے گھر میں ایک بیمار آدمی کے ساتھ قیام کرنے کے بارے میں کہا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔

اس حرم المثل مقدمہ میں ایک ہزار اور ستر گواہوں جن میں مٹھے راج کمار کی بیویوں نے اور اس کی بڑی بھانج رانی سر جوبالا اور کئی قریبی رشتہ داروں نے اور خود مدعا علیہ رانی بھواوتی کی مہمانی سر جوبانی دیوی جس کے ہاں اس نے پرورش پائی تھی اور اس کی ماموں زاد بہن نے اور سینکڑوں معزز گواہوں نے عدالت میں سنیا کی کے حق میں بیان دیا کہ وہ مٹھلا راج کمار رامیندر رائے ہے۔

مدعا علیہ کی جانب سے چار سو اسی گواہوں نے بیانات دیئے۔ مگر ان میں سوائے رانی بھواوتی دیوی کے بھائی سیندر ناتھ کے حکمران خاندان کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ خود سنیا کی کا بیان کئی دن جاری رہا۔ اس نے اپنی تمام سرگزشت تفصیل وار بتائی۔ ثبوت کے طور پر اس نے راجاڑی کے زمانہ کسروں کی اندرونی تفصیل اپنے بچپن کے واقعات اور خود رانی بھواوتی کے جسم پر تین شناختی علامات کی نشان دہی کی۔ ان نشانات میں سے ایک نشان کا سوائے رانی بھواوتی کے شوہر کے کسی کو علم نہ ہو سکتا تھا۔ مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے ہزاروں لوگ ڈھا کی عدالت اور اس کے باہر جمع ہوتے رہے۔

24 اگست 1936ء کو سٹر چلالا بوس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ ویشن جج ڈھا کے ان تاریخی مقدمہ کا فیصلہ سنایا، ہزاروں کی تعداد میں لوگ دور دور کے علاقوں سے آ کر عدالت کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ دنیا کے کئی ملکوں کے اخباروں کے نامہ نگار اس موقع پر خاص طور پر آئے تھے۔ فیصلے کی رو سے سنیا کی کو بھووال کا مٹھلا راج کمار رامیندر رائے قرار دے دیا گیا اور اس کے تمام حقوق بحال کر دیئے گئے اور یوں ایک تاریک دنیا سنیا کی پھر سے راج کمار بن کر کاروبار دنیا میں مصروف ہو گیا۔



قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

میری فرمائیں جو نصیب ہوں، چلے آتا میرے پاس تم ہیں اجورے کتنے معاملے میری ذات سے تیری ذات تک (ملیخا خان..... پشاور)

اے دبیر تیری رخ بستگی میں کیوں طلب اس کی منجھ نہیں ہوتی (ساجدہ راجہ..... سرگودھا)

میرے مرنے کے بعد میری ایک کہانی لکھنا کیسے برباد ہوئی میری جوانی لکھنا یہ بھی لکھنا کہ کس طرح میرے ہونٹ خوشی کو ترسے کیسے بہتا رہا میری آنکھ سے پانی لکھنا (فارسیہ تیم..... ٹھٹھیک موڈ)

میں نے اپنی تمام زندگی غموں کے نام کر دی اپنے دل کی ہر اک آرزو ناکام کر دی یہ بھی نہ سوچا کیسے گزرے گا تیرے بن اک اک پل بس بنا سوچے ہی یہ اک خوشی تیرے نام کر دی (ساجدہ راجہ..... گوجرانوالہ)

اس سے بچھڑے ہیں تو جاتے ہیں دنیا کی حقیقت ہر سانس یہاں آفت ہے، ہر گھڑی مصیبت کون کہتا ہے کہ بچھڑنے سے آتی ہے یادوں میں کمی ادارے دل کو تو اس سے ہے پھر وہی عقیدت (اقصی رباب..... فیصل آباد)

پل تو ہیں بے شمار وفا کی نشانیاں لیکن ہر اک شے سے نزلے تمہارے خط جیسے ہو عمر بھر کا اثاثہ غریب کا کچھ اس طرح سے میں نے سنبھالے تمہارے خط (شبانہ ندیم..... لاہور)

جس طرف نظر کروں اسی کا پر تو ہے میرے دھیان کے سب راستوں میں رہتا ہے

پھنچ کر اس سے پریشان بہت ہوں میں بھی سنا ہے وہ بھی بڑی اکجھنوں میں رہتا ہے (فائزہ احمد..... کراچی)

وہ میرا ہے اس کا نام کوئی اور نہ لے ان بیکٹی آنکھوں کا جام کوئی اور نہ لے کچھ اس لئے بھی میں نے اس کا ہاتھ نہ چھوٹا وہ گر گیا تو اسے تمام کوئی اور نہ لے (شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالیار)

نکال دے دل سے خیال اس کا یادیں کسی کی تقدیر کو بدلا نہیں کرتیں (انتخاب: محسن عزیز حلیم..... کوئٹہ گلاں)

جتنی شدت سے مجھے غم دیئے ہیں اس نے اتنی شدت سے تو میں نے اسے چاہا بھی نہیں (انتخاب: عمرو دراز..... کھٹیاں خاص)

اس شخص سے میرا اتنا تعلق ہے وہ اگر پریشان ہو تو مجھے نیند نہیں آتی (انتخاب: محمد اسحاق انجم..... کنگن پور)

عجیب تماشا گر ہیں یہ مٹی کے پتلے بھی بے وفائی کرو تو روتے ہیں اگر وفا کرو تو لا دیتے ہیں (انتخاب: نعمان شاہ..... الد آباد)

پھر اتنے مایوس کیوں ہو اس کی بے وفائی پر تم خود ہی تو کہتے تھے کہ وہ سب سے جدا ہے نا (انتخاب: حسنین اقبال..... کھٹیاں خاص)

بھولی بھولی صدا ہوں مجھے یاد کیجئے تم سے کہیں ملا ہوں مجھے یاد کیجئے منزل نہیں ہوں خضر نہیں راہزن نہیں منزل کا راستہ ہوں مجھے یاد کیجئے (پروفیسر واجد گیلانی..... کراچی)

ہوا تھمی تھمی، موسم تھا بہکا میرے دل میں تیرا خیال تھا مہکا کچھ ایسے پراسرار سا موسم تھا کچھ تیرے قربت کو تھا میں بہکا (عثمان فنی..... پشاور)

☆☆



اپنے ہونٹوں پر وہ حرف راز آیا بھی نہیں
لاکھ چاہا دل نے لیکن کچھ بتایا بھی نہیں
جو شب ہجران کے ہر غم کی طمانی کر سکے
وائے محرومی قسمت دن وہ آیا بھی نہیں
ان کا آنا غیر ممکن ہو گیا جس روز سے
دل کے دیرانے کو دوبارہ بسایا بھی نہیں
آنے والوں کو بھلا کیوں میرے گھر تکلیف ہو
اس قدر چھوٹا تو دروازہ لگایا بھی نہیں
اس کی جھولی میں گریں گے کیا دعاؤں کے کنول
جو مصیبت میں کسی کے کام آیا بھی نہیں
لوگ کترا کے گزر جاتے ہیں کہیں جانے کس لئے
آج تک ہم نے کسی کا دل دکھایا بھی نہیں
آج بھی لوگوں سے کرتے ہیں محبت ٹوٹ کر
ہم نے عاطر اپنا یہ مسلک چھپایا بھی نہیں
(رانا حنیف عاطر.....جمدو)

جو خواب مسلسل سے رہائی نہیں دیتا
وہ چہرہ کہیں پر بھی دکھائی نہیں دیتا
مجھ کو تو تری چپ کا بھی مقبوم ہے معلوم
تو ہے کہ تجھے شور سنائی نہیں دیتا
اتنی ہے فراغت کہ فراغت ہی نہیں ہے
جو کام ہے کرنا وہ بھائی نہیں دیتا
جو آگ کے دریاؤں میں ہنسا ہوا اترے
وہ جرم محبت کی صفائی نہیں دیتا
حسرت ہے تجھ تو مرے آنسو کبھی دیکھے
میں ہوں کہ غذاؤں کی دہائی نہیں دیتا
دشوار زمیوں کے سفر اسنے کئے ہیں
اب دشت مجھے آبلہ پائی نہیں دیتا
اتیار جو رہے اپنے گریباں سے اچھتا
وہ ہاتھ کسی کو کبھی کمانی نہیں دیتا
(انس امتیاز احمد.....کراچی)

صحران میں کھڑا باد صبا مانگ رہا ہوں
ناداں ہوں میں محبت کا صلہ مانگ رہا ہوں
دل میں ہے گناہوں کی کک آکھ میں آنسو
بچدے میں پڑا فضل خدا مانگ رہا ہوں
دشمن کو میں اپنے نہیں بھولا ہوں پس مرگ
قاتل سے میں خون بہا مانگ رہا ہوں
صحرائے غم جبر ہے فرقت کی کڑی دھوپ
محبوب کے دامن کی ہوا مانگ رہا ہوں
جس دور میں عربیائی کوئی عیب نہیں ہے
اس دور میں آنکھوں کی حیا مانگ رہا ہوں
جس شخص کے ہاتھوں سے واجد زخم لے ہیں
کیوں اس سے میں زخموں کی دوا مانگ رہا ہوں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گنگوئی.....کراچی)

اپنے چہرے کو کوئی گر آئینے میں دیکھا
کون ماتھے کی سطر پھر زائچے میں دیکھا
آپ گر قنیر خال و خد کی بتلاتے اسے یہ
وہ عبارت چھوڑ کر کیوں حاشیے میں دیکھا
دونوں عالم کی حقیقت کا وہیں کھلا بھرم
خود کو اپنی ذات کے گر آئینے میں دیکھا
کہ ہمیں آزاد کر دیتا تو یارب فکر سے
کون روز و شب کے پھر دائرے میں دیکھا
وہ جو اک دنیا بنا بیٹھا تھا اپنی ذات میں
کھینچ کر پرکار اس کو زاویے میں دیکھا
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

تجھے بھولنا بھی چاہیں تو بھلا نہیں سکتے
اپنی آنکھوں کے آنسو ہر روز چھپا نہیں سکتے
دل میں بسی ہے اک پیاری سی تصویر تیری
وہ تصویر ہم لوگوں کو دکھا نہیں سکتے
پیار تو ہم صرف اور صرف تم سے کرتے ہیں
لوگوں کے سامنے وہ پیار ہم جتنا نہیں سکتے
ہم جانتے ہیں تمہیں ہماری جدائی کا کوئی رنج نہیں
تمہیں تو اپنے دل کی بات بھی ہم بتا نہیں سکتے

تم نے کیا تھا وعدہ کہ تمہیں بھول جائیں ہم
انہوں کہ وہ وعدہ ہم نبھا بھی نہیں سکتے
(صبا محمد اسلم.....گوجرانوالہ)

رہنکے میری آنکھوں کا مقدر ٹھہرے
شک پلکوں پہ آکر سمندر ٹھہرے
پوچتا رہا جس بت کو دل میں بٹھا کر
میرا قاتل اب وہی، میرا ولد دار ٹھہرے
وہ زندگی، یا موت مقدر کردے
ہم ہر حال میں ظالم ترے پرستار ٹھہرے
بکھر خون ہو تب جا کر اک شمع بنے
پھر وہی تو زمانے میں سدا شاہکار ٹھہرے
ازل سے چلا آیا ہے دستور یہی جہاں کا
یہاں جو بھی بچ بولے وہی سنگسار ٹھہرے
(انسارہ نوشین.....فیصل آباد)

آنکھوں سے میری اس لئے لالی نہیں جاتی
یادوں سے کوئی رات جو خالی نہیں جاتی
تو جان بھی مانگے تو بن مانگے دے دوں
اس لئے تیری جو کوئی بات بھی ٹالی نہیں جاتی
اب عمر نہ موسم نہ وہ دے کہ وہ چلے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
معلوم ہمیں بھی ہے بہت سے تیرے قصے
ہر بات تیری ہم سے اچھالی نہیں جاتی
بمراہ تیرے پھول کھلاتی تھی جو دل میں
اب شام وہی درد سے خالی نہیں جاتی
ہم جان سے جائینگے تجھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی
(انتخاب.....ملقیس خان۔پشاور)

بھول اور خوشبو، چاند، ستارے، سارے ساتھی تیرے تھے
تکلیاں، جگنو، کلیاں، پھنوسے، سارے ساتھی تیرے تھے
ککارے کون لگاتا میری پھنوس میں ڈولی کشتی کو
خود سمندر، ساری لہریں دھارے ساتھی تیرے تھے

کچھ میرے اپنے کچھ بیگانے اور خود میرا دل
میری جان کے دشمن جاناں، سارے ساتھی تیرے تھے
محبت کی اس بازی میں، میں نے پار ہی جانا تھا
اچھا وقت "خود محبت اور مقدر" سارے ساتھی تیرے تھے
میں اپنی فریاد لے کر جاتی تو کس کے پاس کنول
حاکم "قاتل" اور مصنف، سارے ساتھی تیرے تھے
(مس فوزیہ کنول.....منڈی بکھن پور)

کمال ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھوں سے اس کی دہن سجاؤں گی
سپرد کر کے اسے چاندنی کے ہاتھوں
میں اپنے گھر کے اندھروں میں لوٹ آؤں گی
بدن کے کرب کو وہ بھی نہ سمجھ سکے گا
میں دل میں روؤں گی آنکھوں میں مسکراؤں گی
وہ کیا گیا رفاقتوں کے سارے لطف گئے
میں کس سے روٹھ سکوں گی کے مناؤں گی
جواز ڈھونڈ رہا تھا وہ نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا میں اسے بھول جاؤں گی
(ساجدہ راجہ.....ہندواں سرگودھا)

بھیکے ہوئے موسم میں تیری یاد بھی ستائے
کس کے جوڑے میں پھول کون سجایا کرے
فاصلے بہت ہیں تیرے میرے درمیان میں
یہ دوریاں دل سے پھر مٹایا کون کرے
بند ہیں میرے لئے وفا کی ساری راہیں
دیران راہوں میں چراغ جلایا کون کرے
ندامت ہوئی ہے تیری بے وفائی پہ ہمیں
بیگانوں سے پھر ہاتھ ملایا کون کرے
دل کو غم رہے گا تیری کم نگاہی کا جاوید
گہری ہوئی قسمت سے پھر سمجھوتہ کون کرے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

تو میری روح کے اندر ہے کئی صدیوں سے
جیسا میرا جسم تو گھائل ہے کئی صدیوں سے

میں کہ ایسا تو نہیں تم کو بھول جاؤں گا
تو میرے ذہن پہ نقش پا رہے کئی صدیوں سے
تو میرے رگ و جاں میں سلایا ہوا ہے
تو میرے ذات کا قیدی ہے کئی صدیوں سے
میں تیرے جسم کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہوں
تیری خوشبو میرے اندر ہے کئی صدیوں سے
میں تیرے پیار کو پاکر ہی جیت جاؤں گا
ورنہ یہ ہار مقدر ہے کئی صدیوں سے
(عثمان غنی..... پشاور)

اس کا یہی احسان ہی کافی ہے دوستو
بس کچھ یادیں چھوڑ گیا میری زندگی میں
(شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہار)

اے	ساقی	سن	فریاد	میری
کبھی	دنیا	تھی	آباد	میری
میں	پریم	مگر	کا	ہوا
اور	پیار	کا	اتنا	عادی
سائنس	بھی	پیار	سے	چلتی

تنہائی کے لمحے سارے
 میری یاد سے پہلے سارے
 انجانے سے گلتے ہیں کیوں
 دیکھے بھالے چہرے سارے
 خوشیوں کے سب رنگ تمہارے
 خواب دکھوں کے میرے سارے
 کون کسی کا اس دنیا میں
 اسانے درد لیے سارے
 اڑ گئے دھوپ میں تلی بن کر
 رانا میرے سپنے سارے
 (قدیر رانا.....راولپنڈی)

جیسے کوئی دیوانہ پھرتا ہو صحرا میں
 کسی کی نظر سے عیاں ہے اداس جاوید
 شمع جلے پھر کوئی کیسے تیز ہوا میں
 (محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

بس اس کے پاس رہتی ہے
 (عثمان غنی.....پشاور)

وہ بھی کسی لڑکی تھی
 پانیوں میں بہتی تھی
 بادلوں میں رہتی تھی
 سانس سانس چلتی تھی
 بات بات رہتی تھی
 ہونٹ میں ہلاتا تھا اور وہ مہکتا سا
 گیت بنتی جاتی تھی
 حلقہ رات کو صاف کاغذ

منزلوں کے راستوں میں
 کوئی رکاوٹ آئے
 رشتوں کو نبھانے میں
 چاہے کوئی بھی دکھ آئیں
 خوشیوں کی کشتی کو
 کہ سمندر میں

خونی سفر

شہزادہ چاند زیب عباسی - کراچی

شبنوں برف کے نیچے مردہ لاش بے گور و کفن پڑی تھی، زندگی سے اس کا ناطہ ٹوٹ چکا تھا، اس کے نزدیک ہی ایک تھیلی میں ایک انگوٹھی پڑی تھی، ایک نوجوان نے وہ انگوٹھی اس لاش کی انگلی میں پھنادی، انگوٹھی کا انگلی میں جلنا تھا کہ.....

سوچ کی وادی میں مجھے پرواز دل و دماغ کو فرحت بخشی دل فریب اور تیرا گلیز کہانی

سانے آئیں۔ وہ ایک گارمنٹس فیکٹری میں منیجر کی پوسٹ پر تھا۔ فیکٹری سے شام چھ بجے چھٹی ہوتے ہی کلب چلا جاتا۔ جہاں وہ علاقے کے نوجوانوں کو مارشل آرٹ کی تربیت دیتا تھا۔ وہاں سے رات دس بجے گھر پہنچتا۔ اس کے علاوہ اس کا مشغلہ موبائل فون پر لڑکیوں سے کپ شپ بھی کرتا تھا۔ وہ اٹلے سیدھے نمبر فرانی کرتا اگر کوئی مرد کال اسٹینڈ کرتا تو رات گئے نمبر کہہ کر معذرت کر لیتا۔ اور اگر کال اسٹینڈ کرنے والی کوئی لڑکی ہوتی تو کپ شپ لگاتا۔ اس کی باتیں اس قدر دل نشین اور دلچسپ ہوتیں کہ اکثر لڑکیاں متاثر ہو کر اس سے دوستی کر لیتیں۔ اس کی یہ دوستی صرف موبائل فون کی حد تک رہتی۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔

لیکن اس کا یہ سلسلہ بھی رک گیا۔ قصہ کچھ یوں تھا کہ ایک روز گھر سے فیکٹری جاتے وقت سگنل کی بتی سرخ ہونے پر اس نے موٹر سائیکل روک دی، اچانک اس کی نظر قریب کھڑی کار پر پڑی، کار کی پچھلی نشست پر موجود لڑکی کو دیکھ کر وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ لڑکی کیا تھی۔ ”حسن و جمال کا شاہکار“ تھی۔ ٹریفک سگنل کی بتی گرین ہوتے ہی اس نے موٹر سائیکل کار کے تعاقب میں دوڑادی اس کا یہ تعاقب شہر کے ایک مشہور کانجنگ

سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے قیدی نمبر تین سو بارہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کی شیوہ بھی ہوئی اور لباس شکن آلود تھا۔ رات نصف سے زائد بیت چکی تھی۔ آج اس کی زندگی کی آخری رات تھی، ہائی کورٹ سپریم کورٹ کے بعد صدر مملکت کی طرف سے بھی اس کی رحم کی اپیل مسترد ہو چکی تھی۔ ہر گزرنے والا پل اس کی زندگی کی گھڑیاں کم کرتا جا رہا تھا۔ ساحل نامی وہ نوجوان موت کے خوف سے بے چین نہیں تھا۔ وہ ایک بہادر انسان تھا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والا، اصل میں اس کی بے چینی کا سبب اس کے بوڑھے والدین، اس کا بڑا بھائی اعجاز تھا۔ بہن زبیدہ جو اس سے عمر میں پانچ سال بڑی تھی، شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی۔ سب کی امیدوں کا وہ واحد سہارا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی محبت شازبہ تھی۔

اس کی موت کے بعد ان پر کیا گزرے گی۔ اس کا جرم محبت تھا جس کی سزا اکثر موت ہی ہوتی ہے، شیریں فرہاد کیل مجنوں، سکی پنوں، ہیرا خاں اور دوسرے بہت سے عاشق اس کی واضح مثال ہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر وہ ایک طرف گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ ماضی کی پرچھائیاں اس کی نگاہوں کے

جاری رہا۔ اس کا لڑکی میں امراء اور صاحب حیثیت لوگوں کی اولادیں زیر تعلیم تھیں۔

اس کے بعد اس کا یہ معمول بن گیا۔ روزانہ اس لڑکی کی کار کا پیچھا کرتا۔ جب تک وہ لڑکی کا لڑکی میں داخل نہ ہوتی وہ وہیں موجود رہتا۔ اس کی یہ بے قراری اس لڑکی سے چھپی نہ رہی، وہ مسلسل کئی روز سے اس کو اپنے گرد پروانے کی طرح چکر لگاتے دیکھ رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام شازیہ تھا۔ اس کے والد سیٹھ واجد ایک بہت بڑے بلڈر تھے۔ ملک بھر میں ان کے کئی پروڈیجٹس چل رہے تھے۔ شازیہ ان کی اگلی بیٹی تھی۔ شازیہ کی والدہ ذکیہ بیگم انتقال کر چکی تھیں۔ بیوی کی وفات کے چھ ماہ بعد ہی سیٹھ واجد نے ایک مشہور کمرشل ماڈل ماریہ سے شادی کر لی تھی جو ان پر نہیں ان کی دولت پر فدا ہو گئی تھی۔

ایک روز وہ حسب معمول شازیہ کا پیچھا کرتا ہوا کالج پہنچا۔ ڈرائیور شازیہ کو کالج کے گیٹ پر اتار کر واپس لوٹا، تو وہ ساحل کی طرف بڑھی۔ ساحل اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر گھبرا گیا، شازیہ اسے گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”جی..... جی۔“ وہ بوکھلا گیا۔

”آپ اتنے روز سے مسلسل میرا پیچھا کر رہے ہیں اب جبکہ میں آپ کے سامنے ہوں تو آپ کے چہرے پر پسینہ کیوں آ رہا ہے؟“ وہ مسکرائی تو ساحل کو ایسا لگا جیسے پوری کائنات مسکرا اٹھی ہوں۔ شازیہ کی مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ملا۔

”اس روز آپ کو گاڑی میں دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری تلاش ختم ہو گئی ہو۔ میں روزانہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ کی ایک جھلک دیکھنے یہاں آتا ہوں۔ سر راہ آپ کو مخاطب کرنے کی ہمت اس لئے نہیں کی کہ آپ پرانے مان جائیں۔“

”آپ نے اتنا سب کچھ تو کہہ دیا، پر اپنا نام نہیں بتایا، جلیس سب سے پہلے میں اپنا تعارف کرواتی ہوں، میرا نام شازیہ ہے اور میں ٹھہرڈائیر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔“

”میرا نام ساحل ہے اور میں، ایس ایم گارنشن فیکٹری میں جاب کرتا ہوں۔“

”ساحل صاحب! آنے جانے والے عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں ایسا کرتے ہیں پھر ملیں گے، آپ میرا موبائل نمبر نوٹ کر لیں۔“ شازیہ نے اپنا نمبر نوٹ کر دیا اور کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ ان کی اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ شازیہ نے ساحل کے کہنے پر اپنے گھر پر اس کا ذکر کیا۔ لیکن جس طرح ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، دو پیار کرنے والوں کے بیچ سناج دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شازیہ پر سختیوں کی انتہا کر دی گئی۔ سوتیلی ماں نے جو اس سے کچھ سال ہی بڑی تھی سیٹھ واجد کو کہہ کر اسے کالج جانے سے روک دیا۔

اس روز وہ اپنی سیکلی کے گھر جانے کے بہانے گھر سے نکلی، ساحل کو فون کر کے ایک پارک میں بلایا، وہ دونوں وہاں سے ساحل کی بہن کے گھر پہنچے۔ صورتحال سے آگاہ ہوتے ہی زبیدہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں تھی صورتحال کی نزاکت کو سمجھتی تھی۔ اس نے ان دونوں کو سمجھانا چاہا مگر وہ نہیں مانے اور اسی روز کورٹ میرج کر لی۔ کورٹ سے وہ دوبارہ زبیدہ کے گھر پہنچے، شازیہ نے فون پر اپنے والد کو بتایا کہ اس نے ساحل سے کورٹ میرج کر لی ہے، پہلے تو انہوں نے اسے بے نقطہ سنا نہیں پھر بولے۔

”میری ساحل سے بات کر اور۔“

”السلام علیکم انکل!“ ساحل نے شازیہ کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کہا۔

”دیکھو ساحل بیٹا تم میرے آفس آ جاؤ مل بیٹھ کر اس مسئلے کا حل نکال لے۔“ دوسری طرف سے سیٹھ واجد نے کہا تو اس نے اچھا کیا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور اسی وقت موٹر سائیکل پر ان کے آفس جا پہنچا۔

”بیٹا اگرچہ تم دونوں نے غلط قدم اٹھایا ہے لیکن اب جو ہونا تھا ہو چکا، بہتر یہی ہے کہ تم شازیہ کو میرے گھر بھیج دو، اپنے گھر والوں کو رشتہ طے کرنے کے لئے میرے گھر بھجواؤ اور سختی کروا کر شازیہ کو لے جاؤ تاکہ معاشرے کے سامنے ہماری عزت رہ جائے۔ بیٹا تم اتنا تو جانتے ہو کہ کسی بیٹی اس طرح گھر سے چلی جائے تو

معاشرے اسے عزت سے جیسے نہیں دیتا۔“ واجد صاحب لکڑی لہجے میں بولے۔

”ٹھیک ہے انکل! میں چند گھنٹوں بعد شازیہ کو آپ کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔“ وہ بولا اور اپنی بہن کے گھر پہنچ کر شازیہ کو اس ملاقات کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ”وہ تیار ہو جائے تاکہ وہ اسے اس کے والد کے گھر پہنچا دے۔“ اسی دوران کھانا تیار ہو چکا تھا، کھانا کھاتے اور شازیہ کے تیار ہوتے ہوئے تین گھنٹے گزر گئے۔

اچانک گھر کا دروازہ زور سے دھڑکھڑایا گیا۔ ”کون ہے؟“ زبیدہ دروازے کی طرف لپکی۔ جیسے ہی دروازہ کھولا نصف درجن پولیس اہلکار گھر میں گھس گئے۔ ”ساحل کہاں ہے؟“ انپکٹر نے پوچھا۔

”میں ساحل ہوں، کیا ہوا آفسر؟“ ساحل شور و غل کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

”مسٹر ساحل سیٹھ واجد کا کچھ گھنٹے قبل قتل ہو چکا ہے۔ ان کے پرسل پیکریٹری اتفاقاً نے آپ پر شے کا انبار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی موت سے قبل سیٹھ واجد نے آخری ملاقات آپ سے کی تھی۔ آپ کے دہانے سے نکلنے کے کچھ دیر بعد جب وہ کسی کام سے ان کے آفس میں داخل ہوئے تو ان کی خون آلود لاش ملی۔ اتفاقاً صاحب اور مقتول کی بیوی نے آپ پر شک کا انبار کیا ہے۔ ہم آپ کو سیٹھ واجد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتے ہیں۔“

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے جب میں ان کے پاس سے نکلا تو وہ زندہ تھے؟“ ساحل گھبرا گیا۔ ”یہ سب بعد اوقات میں کہیے گا۔“ اسے ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ ان کی گفتگو کے دوران شازیہ کمرے سے باہر آ چکی تھی۔ صورتحال سے آگاہ ہوتے ہی وہ رونے لگی۔ ساحل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر کیس چلتا رہا، عدالت میں اتفاق سننے کے خلاف گواہی دی۔ چچا اسی کی گواہی نے اسے اپنی طرح چھڑا دیا۔ چچا اسی خان افسر کا کہنا تھا کہ ”صاحب کے کمرے سے ساحل گھبرا ہوا نکلا اور بھاگے

کے سے انداز میں وہاں سے نکل گیا۔“

واجد سیٹھ کو یمن دل کے مقام پر خنجر گھونپ کر قتل کیا گیا تھا۔ آلہ قتل پولیس کو نہیں ملا تھا۔ ساحل کو چھائی کی سزا سنائی گئی۔

”جوان تمہاری زندگی کے آخری چند گھنٹے باقی ہیں، اس طرح بیٹھے رہنے سے بہتر ہے نماز پڑھو، قرآن پاک کی تلاوت کرو اور گناہوں کی معافی مانگو۔“ اس کی سماعت سے ایک بھاری بھر کم آواز کمرانی، آنکھیں کھول کر دیکھا تو سالخو کے پار اہلکاری میں گشت کرنے والا سلیم نامی سنتری کھڑا تھا۔

”سلیم بھائی کیا نام ہو رہا ہے؟“

”رات کا ایک بج رہا ہے، ٹھیک باج بجے تھیں پھانسی لگھاٹ لے جایا جائے گا۔ گویا تمہاری زندگی کے صرف چار گھنٹے باقی ہیں۔ انہیں قیمتی بنانے کے لئے اللہ کو یاد کرو۔“ سنتری اسے نصیحت کر کے آگے بڑھ گیا۔

ساحل ایک طرف بیٹھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیے۔ ”یا اللہ تو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ تو ہی میری بے گناہی کا گواہ ہے۔ جس طرح تو نے بے گناہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل میں مدد فرمائی تھی، یا اللہ میری مدد کر، یا اللہ تو جو چاہے کر سکتا ہے۔“ وہ آنکھیں بند کئے صدق دل سے دعا کر رہا تھا، اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”آنکھیں کھولو بیٹا! اس کی سماعت سے ایک شیریں آواز کمرانی، ساحل نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے ایک نورانی چہرہ والے بزرگ موجود تھے۔

”آپ کون ہیں اور یہاں کیسے پہنچے؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا اور بخور کال کوٹھری کے مقفل دروازے کو دیکھا۔

”ان باتوں کو چھوڑو، میں تمہیں صحیح سلامت اس کال کوٹھری بلکے اس جیل سے باہر نکال دوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیوں مذاق کر رہے ہیں؟ میری زندگی کے صرف ساڑھے تین گھنٹے باقی ہیں۔ ان سنگٹاخ

سلاخوں کے درمیان سے چڑھا بھی باہر نہیں جاسکتی، میں کیسے یہاں سے نکلوں گا۔“ انتہائی پریشانی کے باوجود ساحل بس پڑا۔

”ہنو مت! جب میں یہاں آسکتا ہوں تو تمہیں باہر نکال بھی سکتا ہوں۔ یہ سب تقدیر کے کام ہیں۔ تمہارا اس جیل میں قید ہونا۔ پھر پھانسی سے پہلے یہاں سے غائب ہونا اس میں بھی کوئی مصلحت ہے۔ جو آنے والے وقت میں تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“ بزرگ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

اسی وقت قدموں کی چاپ سنائی دی، راہداری میں گشت کرنے والا ستری سلاخوں کے پار کھڑا ساحل کو حیرت سے گھور رہا تھا۔ ساحل گھبرایا ہوا سا بزرگ کے سامنے سے اٹھا اور سلاخوں کے قریب جا پہنچا۔ ”خیریت تو ہے کس سے باتیں کر رہے تھے۔“ ستری اس پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”یہ بابا پراسرار طریقے سے اندر آئے ہیں انہی سے باتیں کر رہا تھا۔“ ساحل بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”لگتا ہے تم داغی توازن کھو چکے ہو، اسی لئے ہلکی ہلکی باتیں کر رہے ہو، ان سلاخوں کے پیچھے تمہارے علاوہ دوسرا کوئی موجود نہیں۔“ ستری اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھتا ہوا چل دیا۔

”وہ بزرگ کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ بزرگ کے قریب جانے کی اب اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”ڈرو مت! میرے قریب آؤ، میں تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“ وہ جھجکتا ہوا ان کے قریب جا پہنچا۔ ”میرے ساتھ آگے بڑھو۔“ بزرگ نے اس کا ہاتھ تھاما اور سلاخوں کے قریب جا پہنچے۔ کٹھری کا متقل دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہ حیرت زدہ سا ان کے ساتھ کال کٹھری سے باہر نکلا۔ ان کے باہر نکلنے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ ”پیچھے مڑ کر دیکھو۔“ انہوں نے کہا تو ساحل نے پلٹ کر دیکھا۔ کال کٹھری کے فرش پر ایک

فصل قیدی خبر تین سو بارہ کی وردی پہنچے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ ہنس مچا ہوا تھا۔ ساحل کا ہنسنے کا اسے دیکھ کر مسکرایا اور فرش پر لپٹ کر آنکھیں موند لیں۔

”بابا جی یہ سب کیا ہے؟“ ساحل کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ تمہارا ہمزاد ہے۔ کچھ دیر بعد جب گشت پر معذور ستری لوٹے گا تو یہ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرے گا، اس کا معائنہ کرنے والا ڈاکٹر بھی اس کی طبی موت کی تصدیق کر دے گا۔ تم قانون اور دنیا کی نظر میں مردہ کہلاؤ گے۔ لیکن درحقیقت زندہ رہو گے۔ اس کی لاش تمہارے دروازے کے حوالے کر دی جائے گی، لحد میں اتارنے کے بعد ہمزاد وہاں سے غائب ہو جائے گا، اب یہاں سے چلو میرے پاس وقت کم ہے۔“ وہ راہداری میں چلتے ہوئے گشت پر معمول ستریوں کے پاس سے گزرے۔ حیرت انگیز طور پر ان ستریوں نے انہیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

”کیا! نہ ہی انہوں نے ہماری طرف دیکھا اور نہ ہی روکا؟“ ساحل نے حیرت سے پوچھا۔

”جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے نہ ہی تمہیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی مجھے دیکھ سکتے ہیں۔“ وہ مختلف راہداریوں اور بیرکوں سے ہوتے ہوئے جیل کے مین گیٹ پر جا پہنچے۔ حیرت انگیز طور پر راستے میں موجود کئی سپاہیوں نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ مین گیٹ پر ایک حوالدار اور نصف درجن سپاہی ہاتھوں میں رائفلیں تھامے چوکے کھڑے تھے۔ ان کے نزدیک پہنچتے ہی ہماری بھر گیمٹ خود بخود کھل گیا۔ وہ دونوں جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلے، گیٹ دوبارہ خود بخود بند ہو گیا۔

”ساحل بیٹے اب میرے جانے کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ تم یہاں سے سیدھے شاداب نگر جاؤ گے۔ وہاں صفر حسین کی حویلی پر جا کر کہنا کہ ”تم نوکری کی تلاش میں ہو۔“ اگر کسی نے پوچھا کہ ”کیا کام جانتے ہو تو تم کہنا کہ میں ڈرائیور ہوں۔“ ان کا ڈرائیور نوکری چھوڑ

کر چا چکا ہے۔ تمہیں ڈرائیور کی نوکری پر رکھ لیا جائے گا۔ اس حویلی میں مشل نام کی لڑکی ہے، تم یہ لاکٹ اسے روکے اور کہو گے کہ یہ لاکٹ بابا نور جلال نے دیا ہے۔“

بابا نے ایک لاکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ساحل نے لاکٹ جیسے ہی ان کے ہاتھ سے لیا۔ وہ تائب ہو چکے تھے۔

رات کے چار بجے کا وقت تھا۔ اسی لئے لوہے کی سسٹن میں۔ اکاؤنٹ کا ڈاکٹر بھی اس کی طبی موت پر وعدے کے مطابق شاداب نگر کیسے پہنچوں گا۔ اور قیدیوں کے لباس میں مجھے کسی نے دیکھ لیا تو مشکل میں پھنس جاؤں گا۔“ سوچتے سوچتے اس کی نظر اپنے لباس پر پڑی تو وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کے جسم پر قیدی کی وردی کے بجائے سفید رنگ کا کرتا ظہور موجود تھا۔ اس نے کرتے کی سائیکل کی جیب کو ہجارت محسوس کرتے ہوئے ہاتھ ڈالا تو اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ اس کے ہاتھ میں پانچ سو کے نوٹوں کا ایک گنڈی موجود تھی۔ اسے یہ سب کچھ الف لیلیٰ کی کہانی کی طرح لگ رہا تھا اس نے سوچا کہیں وہ خواب نہیں دیکھ رہا، یہ نہ ہوا کچھ کھلے پر خود کو دوبارہ جیل کی سلاخ سلاخوں کے پیچھے پائے، یہ سوچ کر زور سے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت پر چٹکی کاٹی، تکلیف ہوئی تو کھنکھایا، یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔

مشل گہری نیند سے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی سردی میں بھی اسے خوف سے پسینے آ رہے تھے۔ اس نے خوف کا سبب وہ خواب تھا۔ جو کبھی کبھار وہ دیکھتی تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کی اور وال کلاک کی طرف دیکھا رات کے دو بج رہے تھے، ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں اور سونا چاہا مگر نیند اس کی آنکھوں سے ہنوز دور تھی۔ خواب میں دیکھے گئے ہاتھ پوری جذبات سے اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ خوف ناک خواب کئی ماہ سے اسے مسلسل دکھائی دے رہے تھے۔

وہ خواب میں اکثر دیکھتی۔ وہ ایک برف پوش پہاڑی علاقے میں موجود ہے۔ برف میں ایک انسانی جسم دفن ہے۔ جس کا صرف سر اسے دکھائی دیتا ہے۔ پتلا جسم برف تلے دفن ہوتا ہے، برف میں دفن مردہ شخص کا چہرہ نہایت ہی بھیاںک ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کا ایک طرف کا حصہ جلا ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ ایک آنکھ صحیح سلامت اور دوسری آنکھ کا صرف گڑھا تھا۔ مشل کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرخ ہوتی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے خون نچک رہا ہو، وہ مردہ شخص برف سے باہر آ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن درختی کی طرح مڑے ہوئے اور لمبے ہوتے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مشل کی طرف بڑھتے ہوئے کہتا ہے۔ ”میں پچاس سال سے برف میں دفن تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ میں تیرے خون سے اپنی پیاس بجھاؤں گا۔“ اس کے ساتھ ہی مشل کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

مشل کے خوف زدہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بزدل تھی۔ وہ جدید دور کی لڑکی تھی جس نے سیلف ڈیفنس کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے والد صفر حسین شاداب نگر میں وسیع زمینوں کے مالک تھے۔ شہر میں دو گارمنٹس فیکٹریاں اور کاروں کا شوروم بھی تھا، وہ جتنی، ایماندار اور نیک سیرت انسان تھے، ان کا چھوٹا بھائی اصغر حسین موقع پرست اور لالچی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ عیاش اور جوئے کا شوقین بھی تھا۔ ان کے والد فدا حسین کی تین اولادیں تھیں۔ صفر حسین، اصغر حسین اور نوجوان بیٹی آسیہ جو ایک وحشی انسان کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔ ان دنوں اصغر حسین اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ بیٹی کے صدمے سے فدا حسین کی حالت بہت ناساز ہو چکی تھی۔ اصغر حسین کے تعلیم مکمل کر کے لوٹے ہی زمین، جائیداد اور بینک اکاؤنٹس میں موجود رقم اور بزنس دونوں بھائیوں میں

براہری کی بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا۔ تقسیم کا یہ عمل ان کے خاندانی وکیل محمد اسلم کی نگرانی میں ہوا۔ جو صفدر حسین کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایماندار اور اصول پرست انسان تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد اصغر حسین نے پر نکالنے شروع کر دیئے۔ دونوں بھائی صاحب اولاد اور شادی شدہ ہو چکے تھے، صفدر حسین کا ایک بیٹا آٹھ سالہ منور حسین اور دس سالہ بیٹی مثل تھی جبکہ اصغر حسین کا ایک بیٹی بیٹا رضوان تھا۔ اصغر حسین نے آدھی سے زائد دولت اور جائیداد جوئے میں ہار دی۔ باقی کی کسر اس کی عیاش طبیعت نے پوری کر دی۔ بازاری عورتوں کی بری امت نے اسے لگا لگا کر دیا۔ وہ بیوی اور بچے کے ہمراہ تنگ دستی سے زندگی بسر کرنے لگا۔

بڑے بھائی صفدر حسین نے اس کڑے وقت میں اس کا ساتھ دیا۔ اپنی ایک گارنٹن فیکٹری میں جنرل منیجر کی پوسٹ پر اسے رکھ لیا۔ اپنی حوصلی سے کچھ فاصلے پر شامدار قسم کی ایک حویلی اسے بھی بنا کر دی۔ رفتہ رفتہ اصغر حسین کی پوزیشن مستحکم ہونے لگی۔ ان دنوں مثل بارہ سال کی اور منور دس سال کا تھا۔ جب ان کے گھر المناک حادثہ رونما ہوا۔

اس دن وہ پرسکون نیند سو رہے تھے، آدھی رات کے وقت کھٹکے کی آواز سے صفدر حسین کی آنکھ کھل گئی اور پھر یہ دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے کہ ان کے بیڑ روم میں دو رائفل بردار ان کی طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزاحمت کرتے ایک رائفل بردار نے گولی چلا دی۔ جو سیدھی ان کے دل میں پیوست ہو گئی۔ ان کی بیوی بلیٹس نے ڈر اور خوف سے دلدوز چیخ ماری ہی تھی کہ دوسری گولی نے انہیں بھی ہمیشہ کی نیند ملا دیا۔

مثل اور منور حسین پہلی گولی کی آواز سن کر جاگ اٹھے تھے وہ اس وقت اس بیڑ روم سے ملحقہ کمرے میں موجود تھے جس کا ایک دروازہ صفدر حسین کے بیڑ روم میں کھلا تھا، اس نے دروازے کی ہول سے

نظریں جمادیں۔ صفدر حسین کے بیڑ روم کے منظر نے مثل کو خوفزدہ کر دیا۔ خون میں لخت پت صفدر حسین بیڑ پر بے حس و حرکت پڑے تھے ان کے بیڑ کے قریب دو رائفل بردار رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ دونوں کے چہرے سامنے رخ پر تھے، کی ہول سے وہ انہیں واضح طور پر دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک دہلا پٹلا اور پست قامت تھا جبکہ دوسرا خاصا قوی ہیکل اور دراز قد تھا۔ مثل کے دیکھتے ہی اس دراز قد شخص نے اس کی ماں کو بھی گولی مار کر قتل کر دیا۔

اس بار فائر کی گونج دار آواز پر منور خوف سے چیخ پڑا۔ اس کی چیخ سن کر دونوں قاتل ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے دروازے کو دھکیلا چاہا مگر دروازہ لاک تھا۔ مثل نے بائیں سمت والا دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ کورڈر میں کھلا تھا۔ اسی وقت گولی چلنے کی آواز سنائی دی، قاتلوں نے گولی مار کر دروازے کے لاک کو ناکارہ بنا دیا تھا۔

خوفزدہ مثل باہر بھاگی، گھبراہٹ میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کمرے میں اس کا بھائی بھی موجود ہے۔ قاتل کمرے میں داخل ہو چکے تھے، مثل نے باہر نکلنے ہی کو ریڈر میں دوڑ لگا دی۔ اسی وقت ایک فائر ہوا اور منور کی دلدوز چیخ سنائی دی۔

وہ پانگوں کی طرح کورڈر میں بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اسے اپنے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی پے در پے چند فائر ہوتے گولیاں اس کے ارد گرد سے شوش شوش کی آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ گیٹ کے سامنے چوکیدار کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ وہ لمحہ بھر کو کھلی، پھر لاش کو پھلانگ کر گیٹ سے باہر نکلی اور ایک طرف دوڑتی ہوئی نکل گئی، اسے اپنے عقب میں دوڑتے قدموں اور گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پے در پے فائرنگ سے ارد گرد کے گھر میں موجود نفوس جاگ اٹھیں اور گھروں سے باہر نکل آئے، چاروں طرف شور و غل مچ گیا۔ سامنے

اس کے پڑوسی دینو چاچا اور چند افراد دوڑتے چلے آ رہے تھے اور پھر قاتلوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ شاداب نگر میں کھرام مچ چکا تھا ہر آنکھ انکھ بار تھی۔ صفدر حسین ان کی بیوی اور بیٹا منور حسین، بیٹوں حملہ آوروں کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ان بیٹوں کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

مثل کی حالت بہت خراب تھی وہ دن رات روتی رہتی، اگر چہ اس کی رہائش اصغر حسین کے گھر تھی، پر اس کا دل وہاں بھی نہیں لگ رہا تھا، اسے رہ رہ کر اپنے والدین اور بھائی کی یاد آتی تھی، قاتلوں کا قد و قامت چہرہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا۔ یہ دیکھ کر صفدر حسین کے وکیل اور دوست محمد اسلم اسے شہر اپنے گھر لے گئے۔

آٹھ سال اس نے وہیں گزارے۔ وہیں تعلیم حاصل کی۔ اس کے دل میں آتش انتقام بھڑک رہی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ تنہا لڑکی کا انسانوں کے اس جنگل میں رہنا مشکل ہے، اس نے شہر ہی کے ایک مارشل آرٹ کلب سے سیلف ڈیفنس کی تربیت حاصل کی، کچھ شوق بھی تھا، اور دل میں بھڑکنے والی آگ کی بدولت وہ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کرتی چلی گئی، وکیل صاحب سے کہہ کر لائسنس بنوایا۔ پہلے خرید لیا اور نشانہ بازی کی مشق شروع کر دی۔ انہی دنوں محمد اسلم کا امریکہ جانے کا پروگرام بن گیا۔ ان کا بیٹا وسیم سرکے پیشانی تھا۔ انہوں نے مثل کو بھی ساتھ لے جانا یا مگر اس نے انکار کر دیا۔ محمد اسلم نے اپنے جنگل کی پامیاں اسے سونپ دیں اور خود اپنے بیٹے کے پاس چلے گئے۔ کچھ روز بعد مثل نے جنگل کو تالا لگایا اور اپنی ملازمہ رضیہ اور اوجیز عمر ملازمہ ابراہیم چاچا کے ہمراہ شاداب نگر اپنی آبائی حویلی میں جا پہنچی۔

اصغر حسین مکاری سے تمام دولت و جائیداد اور لائسنس پر نگرانی کے نام پر قابض ہو چکا تھا۔ مثل کی اہلی سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ رضوان سے شادی

کے لئے اسے آمادہ کرنا چاہا مگر مثل نے انکار کر دیا، اب اس کی زندگی کا مقصد اپنے گھرانے کی برہادی کا انتقام لینا تھا۔

ماضی کی پرچھائیوں میں گم ایک رات مثل ایسی سوئی کہ اس کی آنکھ رضیہ خالہ کے بچھوڑنے سے کھلی۔ ”بی بی جی آنکھیں کھولیں دن چڑھ آیا ہے۔“

وہ سست روی سے جمائیاں جیتی ہوئی اٹھی اور واش روم میں جا کھکی کچھ دیر بعد جب وہ اپنے روم میں پہنچی تو ناشتہ لگ چکا تھا۔ ”خالہ ڈرائیور چاچا چند دنوں کی چھٹی پر گئے تھے اب تک نہیں واپس لوٹے کیا مسئلہ ہے؟“ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”بیٹا سننے میں آیا ہے کہ اس کا بیٹا جوان ہو چکا ہے اور روزگار سے بھی لگ چکا ہے۔ اسی نے انہیں کام کرنے سے منع کیا ہے وہ کہتا ہے۔“ ابا تم گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو، اب کمائی کی میری عمر ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے خالہ آپ ابراہیم چاچا سے کہیں کوئی نیا ڈرائیور ڈھونڈیں، میں ذرا شہر چارہی ہوں کچھ کپڑے لینے ہیں۔“ وہ آنکھ کھڑی ہوئی۔ ”بیٹا ڈرائیور نہیں ہے اور تم گاڑی چلانے کی ماہر بھی نہیں ہو، شہر کی سڑکوں پر ٹریفک زیادہ ہوتا ہے کچھ دن رک جاؤ، جیسے ہی کوئی ڈرائیور ملے گا، تم چلی جانا۔“ خالہ نے اسے روکنا چاہا۔

”کچھ نہیں ہوتا خالہ میں گاڑی آہستہ چلاؤں گی۔“ وہ پرس شانے سے لٹکا کر چلتی ہوئی گیٹ پر جا پہنچی۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا ابراہیم چاچا کسی سے جو گفتگو تھے۔ وہ گیٹ سے باہر نکلی۔

وہ درمیانی قد و قامت کا چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ جو چاچا ابراہیم سے بات کر رہا تھا۔ ”کیا ہوا چاچا یہ کون ہیں؟“

”بیٹا یہ تو کسی کی تلاش میں آیا ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ ماہر ڈرائیور ہے۔ لیکن اس کا ہمارے علاقے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ ہم کسی اجنبی کو ملازم نہیں رکھ سکتے۔“ چاچا ابراہیم اس کی طرف

مڑے۔

”چاچا جی کبھی کبھی اجنبی انہوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں، مجھے ویسے بھی شہر جانا ہے، ان کی ڈرائیونگ میں مہارت کا اعزاز بھی ہو جائے گا اور آپ کے انٹرویو میں جو کسر رہ گئی ہے وہ میں پوری کر لوں گی۔“ وہ ہنسی اور گندی رنگت کے اس کلین شیڈ نو جوان کو اندر آنے کو کہا۔ اس کے باپا کی لینڈ کروزر ان دنوں اس کے زیر استعمال تھی، حویلی کے کیران میں موجود تھی، کچھ دیر بعد لینڈ کروزر شاداب نگر کی سڑک پر درمیانی رفتار سے چل رہی تھی۔

نو جوان کے گاڑی چلانے کا انداز اسے ماہر ڈرائیور ثابت کر رہا تھا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“ اور اس سے پہلے آپ کہاں تھے؟ ”مٹھل نے پوچھا۔ ”میرا نام ساحل ہے، میرا تعلق فلاں شہر سے ہے اور اس سے پہلے میں سینٹرل جیل کے چھاننی گھاٹ میں تھا۔“ ساحل نے اطمینان سے جواب دیا اور مٹھل بری طرح چونک پڑی۔ ساحل نے گاڑی روک دی اور مٹھل کی طرف دیکھنے لگا۔ ”میں چاہتا تو آپ سے جھوٹ بھی بول سکتا تھا۔ لیکن جھوٹ سے مجھے نفرت ہے، مجھے بابا نور جلال نے یہاں بھیجا ہے اور یہ لاکٹ بھی آپ کے لئے دیا ہے۔“ اس نے لاکٹ حیرت زدہ مٹھل کو دیا۔

”نور جلال تو میرے نانا کا نام ہے، انہیں تو فوت ہوئے عرصہ ہو چکا ہے، اسی کہتی تھیں وہ ماہر روحانیت تھے یعنی نورانی علم کے عامل۔ ان کی ایک تصویر بھی ہمارے گھر میں موجود ہے تم ان کا حلیہ بتاؤ؟“

ساحل نے بابا نور جلال کا حلیہ دہرایا اور بتایا کیسے انہوں نے اسے جیل سے آزاد کر دیا۔

”یہ حلیہ تو واقعی نانا جان کا ہے، اس کا مطلب ہے آپ سے ان کی روح نے ملاقات کی تھی لیکن آپ کو یہاں بھجوانے کا کیا مقصد ہے؟“

”میں یہ نہیں جانتا۔“ ساحل نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔ ”آپ مٹھل سے تو سیدھے

سادھے لگتے ہیں پھر آپ سے قتل کیسے ہوا؟“ مٹھل نے پوچھا۔ اسے یہ نو جوان اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ ساحل نے اسے اپنی پوری روداد سنا ڈالی۔ ساحل کا شادی شدہ ہونے کا سن کر نہ جانے اسے کیوں جھٹکا سا لگا۔ وہ کم کم سی ہو گئی۔ ابھی وہ شاداب نگر کی حدود سے باہر بھی نہ نکلے تھے کہ انہیں روکنا پڑا، تنگ سڑک پر بسنے ماڈل کی ایک شاندار ہنڈا کار ڈاڑی ترچھی کھڑی تھی۔ ساحل نے گاڑی روک کر ہارن بجانا شروع کر دیا۔

کار کے اگلے دروازے کھلتے پر دو صحت مند نو جوان باہر نکلے ایک نائٹنڈ کا اور دوسرا درازنڈ ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے ساتو لے چہرے پر کچھ موچھیں موجود تھیں۔ وہ دونوں لینڈ کروزر کے قریب پہنچے۔ ”مٹھل یہ کون ہے، مجھے کسی اجنبی کے ساتھ تمہارا ٹھکانا پھرنا اچھا نہیں لگتا۔“ اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات تھے۔

”رضوان اپنی اوقات میں رہو، تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے کو کئے والے،“ مٹھل کے چہرے کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”ڈیڈی نے ہمارا رشتہ طے کیا ہے، کیا تم نہیں جانتی؟“ رضوان فرمایا۔

”بکو اس بند کرو، میں ایسے کسی رشتے کو نہیں مانتی اگر آئندہ میرا رشتہ روکا تو میں تمہیں گولی مار دوں گی۔“ مٹھل نے اپنے لباس سے ہٹل نکال کر اس کی نال کا رخ رضوان کی طرف کر دیا۔

”مٹھل اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ رضوان اسے دھمکیاں دیتا ہوا اپنے ساتھی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”تم تو بہت خطرناک لڑکی ہو، یہ ہٹل کہاں سے آیا تمہارے پاس؟“ ساحل نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

”میرے اصرار پر اسلم انکل نے لے کر دیا تھا، اس کا لائنس بھی ہے میرے پاس، مجھے نشانہ میں مہارت حاصل ہے، فارغ اوقات میں اکثر نشانہ بازی

کی مشقیں کرتی رہتی ہوں۔“

”اور میں نے تو زندگی میں کبھی بھی ہتھیار نہیں اٹھایا۔“ وہ گاڑی کو شہر کی طرف جانے والی سڑک پر موڑتے ہوئے بولا۔

”کوئی بات نہیں میں تمہیں ہٹل چلانا سکھا دوں گی۔ اس شاک معاشرے میں رہنے کے لئے سب کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔“

وہ عین آئینہ نگاہوں سے اس باہت لڑکی کو دیکھنے لگی۔ ”سنو کبھی کبھی تم مجھے بہت اداں دکھائی دیتی ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟“ مٹھل نے اپنی آپ بیتی اسے سنا ڈالی۔ ”میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“ مٹھل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اسے اپنے والدین اور بھائی شہت سے یاد آنے لگے تھے۔ باتوں باتوں میں کافی مارا وقت کٹ گیا۔ شہر پہنچ کر مٹھل نے اپنے لئے، بڑے خال اور چاچا ابراہیم کے لئے کپڑے خریدے اور ساتھ ہی ساتھ ساحل کے متع کرنے کے باوجود اس کے لئے بھی ڈھیر ساری شاپنگ کر ڈالی۔ انہیں شاداب نگر واپس لوٹنے لوٹنے شام ہو چکی تھی۔

ساحل چند ہی دنوں میں ان سے یوں کھل مل گیا جیسے وہ اسی گھر کا ایک فرد ہو، اسے رہنے کے لئے ابراہیم چاچا کے برابر والا کمرہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے شب و روز وہیں گزرنے لگے۔ مٹھل اس دوران سے بھی نشانہ بازی سکھاتی رہی، ویسے بھی روپے پیسے کی مٹھل کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ اس کے چیک لکھنے میں بابا صفدر حسین کی اب بھی کروڑوں کی موجودگی تھی۔

ساحل بے چین تھا اسے اپنے گھر والوں اور جانی کی فکر تھی جو شادی کے پہلے روز ہی اس سے منچر چکی تھی، وہ ہر وقت سوچتا رہتا، میری موت کی اطلاع سن کر ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟

ایک روز معمول کے مطابق وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ آدھی رات کے قریب اسے بے چینی کی محسوس ہوئی، چند لمحوں کے بعد کمرے میں ٹھٹھار ہا کر اس

کی بے چینی دور نہ ہوئی، تنگ آ کر وہ کمرے سے باہر نکل کر چھت پر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ چھت پر جا کر کھلی فضا میں ٹھیل کر بے چینی دور کرنے کا تھا۔ چھت پر پہنچ کر ٹھیلے ٹھیلے وہ منڈیر پر جا پہنچا۔ اچانک اسے حویلی کے باہر عجیب قسم کی نقل و حرکت دکھائی دی۔ وہ چونکا ہوا کر چھت پر بی باؤ غدری وال کے پیچھے چھپ کر باہر دیکھنے لگا اسے چند افراد متحرک دکھائی دیئے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں وہ دھیرے دھیرے حویلی کے گرد گھبراڈال رہے تھے، وہ گھبرا گیا۔ اس قسم کی صورتحال سے اس کا کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ حویلی کے گرد گھبراڈالنے والوں کی تعداد تقریباً آٹھ یا سات تھی جو کہ سب کے سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ساحل نے یہاں آ کر مٹھل سے ہٹل چلانا سیکھا تھا۔ اس سے قبل اس نے کبھی بھی ہتھیار نہ اٹھایا تھا۔ وہ سوچنے لگا اگر اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھارہا تو اس سمیت اس حویلی میں موجود تمام افراد کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان کے پاس واحد ہتھیار ایک ہٹل تھا جو کہ اس وقت مٹھل کے پاس موجود تھا وہ تیزی سے چھت سے نیچے اتر اور مٹھل کے کمرے کے مقفل دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پینے لگا۔

”کون ہے؟“ کچھ دیر بعد اندر سے مٹھل کی نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

”مٹھل جلدی باہر آؤ ہم سب کی زندگی خطرے میں ہے۔“ وہ گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا، کچھ ہی دیر بعد مٹھل کمرے سے باہر نکلی، اس کے ہاتھ میں ہٹل موجود تھا۔ ”کیا ہوا ساحل خیریت تو ہے؟“

”اس حویلی کے گرد ہتھیاروں سے مسلح افراد گھبراڈال رہے ہیں۔“ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ وہ دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے چھت پر جا پہنچے۔ انہوں نے مختار انداز میں نیچے جھانکا، ایک شخص اچانک گر دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ حویلی کے احاطے کی دیوار کافی اونچی تھی۔ شاید اس نے اوپر چڑھنے کے لئے رسی کی مدد لی تھی۔ مٹھل نے ہٹل کی نال کا رخ اس کی طرف

کرتے ہوئے ٹریڈر دبا دیا۔ حملہ آوروں کا ساتھی کریناک انداز میں چیخا ہوا اونچی دیوار سے نیچے گرا۔ حویلی سے باہر موجود افراد میں ہچک چکی گئی۔ انہوں نے فوراً ہی پوزیشن سنبھال کر حویلی پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ دونوں نیچے بیٹھ گئے۔ گولیاں ان کے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔ ”ساحل یہ ہم سے تعداد میں زیادہ ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی موجود ہے، اور یہ سب تربیت یافتہ ہیں جبکہ ہمارے پاس صرف ایک پھل ہے اور جس کی گولیاں محدود ہیں۔ یہ فائرنگ کی بوچھاڑ میں حویلی میں گھسنے کی کوشش کریں گے تم یہ پھل پکڑو اگر کوئی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے تو بے دریغ گولی چلا دینا، میں خالہ اور چاچا کو چگا کر گاڑی میں سوار کرتی ہوں، ٹھیک پندرہ منٹ بعد تم بھی چھت سے نیچے اتر آنا، میں گاڑی سمیت حویلی کے پچھلے گیٹ پر موجود رہوں گی۔“ وہ ساحل کے ہاتھ میں پھل تھا کر جھکے اعداد میں دوڑتی ہوئی چھت سے اتر گئی۔

حویلی پر فائرنگ بدستور جاری تھی۔ چاروں طرف گولیوں کی آواز گونج رہی تھی۔ اسی فائرنگ کی آڑ میں ایک شخص نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی، ساحل نے اس پر فائر کیا۔ گولی اسے لگی تو نہیں لیکن وہ گھبرا کر واپس اتر گیا۔ ساحل نے بے درپے چند فائر کئے اور پندرہ منٹ بعد چھت سے اتر کر بھاگتا ہوا حویلی کے عقبی سمت چاہ پتہ چلا۔ پھل، خالہ اور چاچا حویلی کی عقبی سمت گیت کے پاس لینڈ کروزر میں بیٹھ تھے۔ پھل نے اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس سے پھل لے کر نیچے اتری۔ ”یہ تم کیا کر رہی ہو۔“ وہ گھبرا گیا۔

”میں جیسے ہی گیت کھولوں گی، تم تیز رفتاری سے گاڑی باہر نکالنا، میری فکر مت کرو۔ چلتی گاڑی میں سوار ہونا میرے لئے مشکل نہیں۔“ پھل نے جیسے ہی گیت کھولا۔ گاڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی۔ پھل دوڑتی ہوئی چلتی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ باہر دو افراد رانٹلیں ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ لینڈ کروزر ان پر چڑھ

دوڑی۔ انہوں نے نیچے کے لئے چھلانگ لگانا چاہی، مگر انہیں دیر ہو چکی تھی، گاڑی انہیں کھینچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ حویلی سے کافی فاصلے پر پہنچ کر ساحل نے سائیڈ مرر میں دیکھا مبادا کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا لیکن دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان تک نہ تھا، اس نے سکون کا سانس لیا اور اپنی نظریں سامنے مرکوز کرتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ تیز رفتاری کے سبب وہ جلد ہی شاداب ٹرکی کی حدود سے باہر نکل گئے۔ ”مشل اب کہاں جاتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اسلم اٹکل کی کوشی کی چابی میرے پاس ہے، ہم کچھ عرصہ وہیں رہیں گے۔ راستے میں کسی بھی پیٹرول پمپ پر گاڑی روک دینا ہمارا سطرطیل ہے، فیول کم نہیں ہونا چاہئے۔“

تقریباً ایک گھنٹے بعد پیٹرول پمپ دکھائی دیا۔ فیول ڈلووانے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز وہ پھر گیارہ بجے وہ اسلم ایڈوکیٹ کے بنگلے پر موجود تھے۔ کافی عرصہ بند رہنے کی وجہ سے بنگلہ گرد آلود ہو رہا تھا۔ خالد رضیہ صفائی میں جت گئیں اس موقع پر ان کے متح کرنے کے باوجود ساحل اور مشل نے بھی ان کا ہاتھ بنایا۔ دن کا کھانا ہوٹل سے منگوا یا۔ صفائی کرتے کرتے دن ڈھل چکا تھا۔ رات تقریباً آٹھ بجے صفائی سے فارغ ہوئے تو پھل کے چور چور ہو رہے تھے، ہوٹل سے ہی کھانا منگوانا پڑا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔

”ساحل بھائی آپ کی وجہ سے آپ کے گھر والوں کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا، آپ ایسا کریں جا کر اپنے گھر والوں اور خاص کر شاز یہ بھابھی کو یہاں لے آئیں وہ بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے، آپ کی پریشانی بھی ختم ہو جائے گی یہاں رونق بھی ہو جائے گی۔“ مشل بولی۔

”ہاں بیٹیاں درست کہہ رہی ہے۔ تم کل ہی انہیں جا کر لے آؤ۔“ خالہ نے اس کی تائید کی۔

اسی وقت ڈور تیل کی آواز سنائی دی۔ ”یا اللہ خیر!

وقت کون آ گیا یہاں تو ہمیں کوئی جانتا بھی نہیں۔“ گھبرا گئیں۔

”ہو سکتا ہے اٹکل اسلم کا کوئی جاننے والا ہو۔“ پش پش خیال لہجہ میں بولی۔

”ڈور تیل دوبارہ بجی۔“ میں دیکھتا ہوں کون ہے؟“ چاچا اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چل دیئے۔

ابھی آپس گئے ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ چاچا کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ ”تم لوگوں کے اس طرح سے نہ کیا مطلب ہے؟“ وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

مشل نے پھرتی سے اپنے لباس سے پھل نکال کر ہاتھوں میں لے لیا۔ ابھی انہوں نے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ تین سپاہی ایک انسپٹر کے ہمراہ چاچا کو دھکیلے ہوئے کمرے میں گھس گئے۔ انہوں نے رانٹلیں اٹھا رکھی تھیں۔ جن کا رخ ان کی طرف تھا۔ ”خبردار تھیں پھینک کر ہاتھ اور ہاتھالو، غلط حرکت کی صورت میں گولی چلا دوں گا۔“ انسپٹر سانپ کی طرف بھاگا۔

”آفسیر کسی شہری کے گھر میں اس طرح بلا

”میرا نام انسپٹر حشمت ہے، میں اس علاقے کا ذمہ دار ہوں۔ مجھے وکیل کے نام سے مت ڈراؤ۔ تمہیں جو کہنا ہے کورٹ میں کہنا۔ ان دونوں کو گرفتار کرو۔“ انسپٹر بڑے کرفر سے بولا۔

ان دونوں کو احتجاج کے باوجود ہاتھ پشت پر باندھ کر بھٹری پہنادی گئی۔ چچا اور خالہ کے احتجاج کے باوجود وہ انہیں دھکیلے ہوئے کوشی سے باہر لے آئے اور پولیس موبائل میں بیٹھا دیا۔ انسپٹر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ پولیس موبائل تیزی سے سڑک پر چلنے لگی۔ ان کا یہ سفر تقریباً آدھا گھنٹہ جاری رہا۔ اب سنان علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ چونک پڑے، پولیس موبائل تھانے کے بجائے اس ویران علاقے میں موجود ایک عمارت کے سامنے جا کر، ڈرائیور نے ہارن بجایا کٹ کھلا اور ایک وحشت ناک اور گرائنڈیل صورت شخص باہر آیا وہ شکل و صورت سے ہی جرائم پیشہ نظر آ رہا تھا، ان دونوں کو گھسیٹ کر پولیس موبائل سے اتار دیا گیا۔ وہ انہیں رانٹلوں کی زد میں لئے ایک بارہ بائی بارہ کے کمرے میں جا بیٹھے اس کمرے میں کسی قسم کا ساز و سامان موجود نہ تھا۔ دیواروں پر جا بجا اذیت رسانی کے آلات لٹک رہے تھے۔ چھت سے ایک لوہے کی مضبوط زنجیر تالے کی مدد سے لٹک رہی تھی ساحل کو زنجیر کی مدد سے جکڑ دیا گیا۔ جبکہ مشل کو کمرے میں ایک طرف دھکیل دیا گیا۔ ایک سپاہی نے حشمت کے اشارے پر مشل کے پاؤں میں رسی باندھ دی۔ ”یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو اور ہم سے اس سلوک کا کیا مطلب ہے؟“ مشل نے پوچھا۔

”یہ میرا نچی نار چر سیل ہے۔ جسے اوپر پھینچا ہوتا ہے اسے میں یہاں لے کر آتا ہوں۔“ حشمت ہنسا۔

”لیکن تمہاری ہم سے دشمنی کیا ہے؟“ مشل نے بے چینی سے پوچھا۔

”مجھے نہیں رضوان کو تم سے دشمنی ہے تمہارے مرتے ہی تمہاری ساری دولت و جائیداد ان دونوں باپ بیٹوں کو مل جائے گی۔“

”لیکن تمہیں یہ ظلم ڈھانے سے کیا ملے گا،
کیوں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہے ہو؟“
مشعل بولی۔

”رضوان میرا دوست ہے دوسرا اس کام کے مجھے پانچ لاکھ ملے ہیں۔“ اس نے کہا اور ساحل کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد شمشت اور سپاہی میڈیک کی طرح ساحل پر لاتیں گھونے مار رہے تھے کہ وہ ساحل کی چیڑوں سے کوئی بچہ لگا۔ مثل چیخ چیخ کر انہیں اس ظلم و ستم سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رہی۔ وہ خود ہاتھ پاؤں بندھی ہونے کی وجہ سے مجبور تھی۔ چیختے چیختے ساحل بے ہوش ہو گیا اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اسی وقت حشمت کے موبائل فون کی بیل بجی۔ ”ہیلو حشمت اسپیکنگ۔“ وہ کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔

”ایس پی اسفند یار بول رہا ہوں۔ فوراً میرے آفس پہنچو۔ میرے پاس ایک اسی طرح شخص اور ایک بڑی بی بی بیس ہیں جن کا کہنا ہے کہ تم نے ایڈووکیٹ اسلم کے بیٹے سے مثل نامی لڑکی اور ساحل نامی نوجوان کو اغوا کرنا معلوم مقام پر قید کر رکھا ہے۔“ دوسری طرف سے ایس پی نے کہا۔

”سریہ جھوٹ ہے الزام ہے مجھ پر، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”تم لوگ ساحل کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا کر چیک آؤ، میں جب تک ایس پی سے مل کر آتا ہوں اور ہاں خیال رکھنا کہ یہ قتل حادثہ لگنا چاہئے۔ یہاں اس لڑکی کو راشد کی نگرانی میں چھوڑ جاؤ۔“ شمس تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سپاہیوں نے ساحل کو نیچے اتارا۔ ”اب اس کا کیا کریں؟“ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

”ایسا کرتے ہیں اس کی جھٹکری کھول کر رسی باندھ دیتے ہیں اور ریل کی پٹری پر پھینک آتے ہیں۔ آنے والی ٹرین اس کے جسم کے پرچھے اڑا دے گی۔“

وہیے بھی ریلوے لائن یہاں سے نزدیک ہے۔
 دوسرے نے کہا اور ساحل کو کندھے پر لا دو کر کے سب
 باہر نکل گئے۔ کمرے کا دروازہ باہر سے قفل کر دیا گیا۔
 ”راشد لڑکی کا دھیان رکھنا ہم اسے ٹھکانے لگا کر آتے
 ہیں۔“ باہر موجود شخص سے کہہ کر وہ تیزی سے چلے ہوئے
 عمارت سے باہر نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

”یہ تم نے کیا پاگلوں ساحلیہ بنا رکھا ہے۔ کسی کے مرنے سے اس کے ساتھ کوئی مرا نہیں جاتا۔ ساحل مر چکا ہے، اس حقیقت کو تسلیم کر لو اور اداسی، غم کی کیفیت سے باہر نکلو۔ اب تو اسے پھائی چڑھ میں گزر چکے ہیں۔“ شاز یہ کہ قریب بیٹھے ہوئے اس کی کزن مہوش بولی۔

”خبردار جو تم نے ساحل کو کمرہ کہا، وہ زندہ ہے، جب میں زندہ ہوں تو وہ کیسے مر سکتا ہے۔“ شاز نے مہوش کو کمرہ تو ہونے کہا۔ وہ اس وقت اپنے باپ کے شاندار بنگلے میں اپنے کمرے میں موجود تھی۔ یہ وہی کمرہ تھا۔ جہاں اس نے لڑکپن سے لے کر نوجوانی تک کے دن بٹائے تھے۔ جیل سے ضروری کارروائی کے بعد لاش ورتاکے حوالے کر دی گئی تھی۔ وہ ساحل کا چہرہ دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس کو کھینچ لی۔ اس کا کہنا تھا کہ ”یہ ساحل نہیں کوئی اور ہے، ساحل تو زندہ ہے۔“

سب نے کہا۔ شاز یہ حد سے دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ “وہ کئی کئی دن ایک ہی لباس پہنے رہتی، بکھرے بالوں اور جاڑا چہرے کے ساتھ ساحل کے نام کی مالا چھتی رہتی، کھانا پیانا سب کچھ بھول چکی تھی۔ اس کے چہرے کے گلاب ساحل کی جدائی میں مرجھا چکے تھے، اس وقت بھی مہوش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی جس پر اس نے پھر کرمہوش کو برا بھلا کہہ دیا تھا۔ یہ وہ بیڈ پریشی دوبارہ ساحل کے نام کی گردان کر رہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ مہوش نے اٹھا کر دیکھا، اس کا بھائی وقاص عرف وکی کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ ”کہا ہوا کزن یہ کون سا پاپڑا پڑھ رہی

”شہازیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
 ”میں نے پیار اور محبت کی بہت سی کہانیاں سنی
 مگر شہر کے شوق میں بیوی کو پاگل ہوتے پہلی بار دیکھ
 اہوں۔“ وہ بیٹھ کے قریب آ کر بولا۔
 ”پاگل تم ہو گے تمہارے بڑے ہوں گے،
 اصل زندہ ہے، وہ ایک دن ضرور آئے گا۔“ وہ پرتیقین
 تھا۔

”آئے گا کیسے آچکا ہے، ہم وہیں جا رہے ہیں تم
 ہی ہمارے ساتھ چل کر ساحل سے مل لیتا۔“ دکی گہری
 باتیں لے کر بولا۔
 ”یہ تم کون سا شوشا چھوڑ رہے ہو۔“ مہوش
 تنک بڑی۔

”میں بچ کھڑا ہوں“ تم آؤ میرے ساتھ، ماریہ
 نئی کے کمرے میں چلتے ہیں جب تک شازیہ تیار
 نہ ہو جائے گی، تین گھنٹے بعد ہماری روانگی ہے، وہ مہوش کا
 تھوڑا سا کچھڑا کر کے باہر نکل گیا۔

”یہ کیا چکر ہے، بھی؟“ وہ ماریہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ”ماریہ صوفے پر پاؤں چارے بیٹھی تھی۔“ اصل بات یہ ہے مائی سسٹر کہ آج ملتئم، شازبہ، حیدر اور شبیر نے فانی علاقوں کی سیر کو جارا ہے، میں، جارا پر وگرام بہت پہلے سے جانا تھا، تمہارا اور شازبہ کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ سیر و تفریح سے ہو سکا ہے اس کا دل بھل جائے، کیوں آغنی؟ میں سمجھ کر رہا ہوں۔“ وہ ماریہ کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

”وکی کچھ تو خیال کرو، میں تم سے سال دو سال
موسمی ہوں، مجھے آنٹی مت کہا کرو، میرا نام لیا کرو۔“
ایسا عجیب لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”وہیکس آپ چاہے عمر میں مجھ سے کم ہیں لیکن
 اگر دے درمیان موجود رہتے کا تقاضا ہے کہ میں آپ کو
 آنکھیں کھوں۔“ وہ رمان سے بولا اور ماریہ نے منہ ہٹالیا۔
 وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے جبکہ میوش تیاری میں
 مصروف ہوگئی، اسی مصروفیت میں کافی وقت بیت گیا۔
 بلکہ حیدر اور شیریں آن بیچے۔ وہ سیر و سیاحت کے لئے ہائی

لیکس لے کر آئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہائی لیکس تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی اس ہائی لیکس میں وکی، حیدر، شبیر، مہوش اور شازیہ کے علاوہ اچھڑ عمر ڈرائیور سمیت چھ افراد موجود تھے، حیدر اور شبیر وکی کے گھر کے دوست تھے۔

سفر کے دوران وہ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے، جبکہ شازیہ بدستور خاموش تھی۔ ایک پوش علاقے سے گزرتے ہوئے حیدر چلایا۔ ”گھاڑی روکو۔“ ذرا تھوڑے ہی لمحے میں وہ ایک پھاڑوں کے ہائی لیکس ایک جھلکے سے رک گئی۔ ”کیا ہوا بھئی؟“ وہ نے ناگوار لہجے میں پوچھا۔

”یاد رہے مڑک کے سامنے والے گرین گیٹ والے بنگلہ میرے ایڈووکیٹ انکل اسلم کا ہے وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی اس بنگلے کے گیٹ سے ایک لڑکی اور نو جوان کو پولیس گھنٹھیں کر موبائل میں ڈال کر یہاں سے نکلی ہے۔“ وہ پریشان تھا۔

”تو ایسا کرتے ہیں پتہ کر لیتے ہیں۔ یہاں کون رہائش پزیر تھا، ہو سکتا ہے انہوں نے کوئی گمراہی پر دے دی ہو۔“ شبیر نے تبصرہ کیا اور گاڑی سے باہر نکل آئے۔ شبیر، حیدر اور وی چلتے ہوئے جنگل کے گیٹ پر پہنچے اور ڈور بتل بجا دی کچھ دیر بعد گیٹ کھلا اور ایک پریشان صورت بوڑھے کی شکل نظر آئی۔ ”کیا بات ہے بیٹا؟“ اس نے پھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بابائی دراصل یہ کٹھی میرے اٹکل اسلم ایڈووکیٹ کی ہے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ پولیس اہلکار اس جنگلے سے ایک لڑکی اور ایک نوجوان کو گھنٹے ہوئے جنگلے سے باہر لائے اور موبائل میں ڈال کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیسے رہتے ہیں۔“ حیدر نے پوچھا۔

”بیٹا ایڈووکیٹ صاحب میرے مرحوم صاحب کے دوست ہیں۔ انہوں نے اس جنگلے کی چابی ہماری چھوٹی بی بی مثل کو دے رکھی تھی۔ ہم آج یہاں آئے تھے۔ پولیس نے سچ نہیں کیوں ہماری بی بی اور اس کے

بھائی کو گرفتار کر لیا۔ بزرگ نے بتایا۔

”سوری بابا! آپ کو تکلیف دی۔“ وہ معذرت کر کے بولے اور بنگلے کا گیٹ بند ہو گیا۔ چلتے چلتے اچانک حیدر ٹھک کر رکا اور جھک کر نیچے سے کچھ اٹھایا۔ ”کیا ل گیا تمہیں؟“ شیر نے پوچھا۔

”یاریہ لاکٹ نیچے سے ملا ہے۔“ ہاتھ میں پکڑی سنہری چین اسے دکھائی، اس سنہری چین میں ایک خوب صورت لاکٹ تھا، جس پر باریک الفاظ میں آیت الکرسی لکھی تھی۔ ”شاید یہ ان دونوں میں سے کسی ایک نے پہن رکھا ہو، پولیس کی چیھنا بھٹی اور کھینٹے سے نیچے گر گئی ہو۔“ وہ دوبارہ ہائی کس میں سوار ہو گئے۔

ڈرائیور نے حیدر کے اشارے پر گاڑی اشارت کی۔ ”کیا ہوا؟“ وہ نے پوچھا۔

”یاریہ اٹکل کے کوئی واقف ہیں۔ انہوں نے بنگلے کی چابی انہیں دے رکھی تھی۔ پولیس پہنچ نہیں کیوں ان دونوں کو لے گئی۔“ حیدر بولا۔

”ہوسکتا ہے ان سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔“ مہوش نے کہا۔

”ہماری پولیس اتنی اچھی ہے کہ یہ ہمیشہ شریف شہریوں کو ہی تنگ کرتے ہیں اور ان کی مار کھا کر اچھا بھلا شریف انسان بھی جرائم کو تسلیم کر لیتا ہے جو اس نے کئے بھی نہ ہوں۔“

”تم نے وہ لطیف تو سن رکھا ہوگا کہ ہماری پولیس جنگل سے ہرن کو ماری ہوئی نکلی تو وہ کہہ رہا تھا میں ہاشمی ہوں۔“ وہی بولا اور سب ہنس پڑے۔

”یاریہ مجھے یہ لاکٹ نیچے سے ملا ہے۔“ اس نے لاکٹ دکھائی۔

”ڈرا دکھانا۔“ مہوش نے لاکٹ اس سے لے لیا۔ ”اس پر تو آیت الکرسی لکھی ہے ایسا کرتے ہیں اسے شازیہ کو پہنا دیتے ہیں شاید اس آیت کے سبب اس کی دماغی کیفیت پر کوئی خوشگوار اثر پڑے۔“ مہوش نے خاموش بیٹھی کھوئی کھوئی شازیہ کے گلے میں لاکٹ پہنا دیا۔ اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ اپنے خیالات

میں گم مگر شاید ساحل کو یاد کر رہی تھی۔ وہ مختلف مقامات پر گھومتے پھرتے آگے بڑھتے رہے۔ رات کو ایک رہائشی ہوٹل میں رکے۔ دوسرے روز صبح وہاں سے روانہ ہو گئے، گھومتے پھرتے وہ اس بلند و بالا پہاڑی علاقے میں جا پہنچے۔ یہ بلند و بالا پہاڑ برافانی پہاڑ کہلاتا ہے۔ وہ تینوں دوست کو یہ بتا بھی تھے۔ انہوں نے کئی پہاڑوں کی چوٹیاں سر کی تھیں۔ ان کا یہاں آنے کا ارادہ پہلے ہی سے تھا۔ اسی لئے موسم کی مناسبت سے ساز و سامان گرم کپڑے غرض کہ ضرورت کی ہر چیز ان کے ساتھ موجود تھی۔

مہوش چونکہ ایک دو مہماں میں پہلے ہی ان کے ساتھ آ چکی تھی۔ اس لئے کوئی دشواری اسے پیش نہ آئی۔ اس علاقے کی مناسبت سے گرم کپڑے اور سوئٹر کے باوجود بھی انہیں سردی اپنے وجود میں ہوتی تھی۔ البتہ شازیہ کچھ دیر کے لئے اپنی پرانی کیفیت سے باہر آ چکی تھی شاید ایسا سردی اور اس دشوار گزار پہاڑی علاقے کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ بہت محتاط انداز سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ذرا سی غلطی انہیں زندگی سے محروم کر سکتی تھی۔ ”بھئی میں تو تھک گئی ہوں کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔“ مہوش نے کہا۔

”نہیں ابھی نہیں ہمیں رات ہونے سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہئے۔ یہاں بعض اوقات ہواؤں کے جھکڑ چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جو اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو ٹکڑوں کی طرح اڑا دیتے ہیں۔“ حیدر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”اچانک تیر ہواؤں کے جھکڑ چلے گئے۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ قریب ہی ایک بڑی سی چٹان تھی۔ وہ سب چٹان کی اوٹ میں دیک گئے۔“ سب مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لو۔“ وہی چلایا اور انہوں نے مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لئے، ہوا کی شدت اس قدر تھی کہ چٹان کی آڑ میں ہونے کے باوجود انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے یہ ہوا انہیں اڑا کر

لے جائے گی۔ تیز ہوا کی وجہ سے چھوٹے موٹے برافانی ٹوڑے لڑھکتے ہوئے بلندی سے پستی کی طرف چارہ تھے۔ وہ چٹان کی آڑ میں ہونے کی وجہ سے محفوظ تھے۔ ”بھائی آپ نے کہا تھا کہ ساحل سے ملوانے لے جا رہا ہوں، کب ملواؤ گے؟“ شازیہ نے وہی سے پوچھا۔ اس خطرناک ترین چویشن میں شازیہ یوں۔ تو وہ سب مسکرا دیے۔

”فکرمٹ کرو ساحل یہیں کہیں ہوگا۔“ وہی نے اسے پکارا۔ کچھ دیر بعد ہواؤں کے جھکڑ رک گئے۔ وہ اپنے اپنے بیک کندھوں سے لٹکائے آگے کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

”ارے یہ کیا۔“ چلتے چلتے شیر ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کی نگاہیں ایک جگہ پر مرکوز تھیں۔ ان سب نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک انسانی سر انہیں دکھائی دے رہا تھا۔ برف سے اٹا ہوا، وہ انسانی سر انہیں فٹ بال کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

”یاریہ تو کوئی لاش ہے، آگے بڑھو۔“ وہی خوفزدہ لہجے میں بولا۔

”اگر کوئی لاش ہے تو تمہیں کھا تو نہیں جائے گی، میرا واسطہ کئی لاشوں سے بڑھ چکا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے تم نے کئی سو سال پرانی لاش کھنڈروں سے برآمد کی تھی۔“ شیر برف میں دبے انسانی سر کے قریب جا کر بولا۔ شیر آثار قدیمہ کا ماہر تھا۔ اس نے اپنا بیک کھولا اور اس میں سے ایک تاجر نکال کر آتے ہی سے احتیاط کے ساتھ برف کو دے لگا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ وہی نے پوچھا۔ ”یار کھدائی کر کے اس لاش کو باہر نکال رہا ہوں۔ تاکہ یہ تو چلے یہ کون تھا، ہوسکتا ہے اس کے لباس میں کوئی ایسی چیز موجود ہو جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔“ وہ ساتھ ساتھ کھدائی بھی کرتا جا رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے برف ہٹاتا جا رہا تھا۔

حیدر ہمت کر کے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ

بٹانے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ لاش ان کے سامنے تھی۔ خستہ حال کپڑے اس کے جسم سے الگ ہو چکے تھے۔ شیر نے جلدی سے اپنے بیک سے کپڑے نکلے اور لاش کے عریاں جسم پر ڈال دیئے۔ اس دوران دونوں لڑکیاں منہ پھیرے کھڑی رہیں۔ حیرت کی بات تھی کہ لاش صحیح سلامت تھی۔ اس کا جسم کہیں سے گلا سڑا یا خراب نہ ہوا تھا۔ شاید ایسا برف میں دبا رہنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

لاش دیویدکل شخص کی تھی۔ اس کے جسم پر سینے کی جانب گولی کے زخم کا نشان تھا۔ چہرہ سیاہ اور بھیا نک تھا۔ چہرے کے ایک طرف کا حصہ جلا ہوا ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ ایک آنکھ صحیح سلامت اور دوسری آنکھ کا صرف گڑھا تھا۔ جو اس کے چہرے کو مزید خوفناک بنا رہا تھا۔

”لگتا ہے اس کے چہرے کی یہ حالت کسی حادثے میں جلنے سے ہوئی ہے اور موت گولی سے واقع ہوئی ہے۔“ جس کا نشان اس کے سینے میں نظر آ رہا تھا۔ ”لیکن اسے مارا کس نے اور یہ یہاں کب سے دفن ہے؟“ شیر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بولا اور اس کے خستہ حال لباس کی طرف بڑھا جو دمچوں کی صورت میں پڑا تھا۔ مختلف کپڑوں کی دمچوں کو ٹوٹا ہوا کپڑے کی دمچی کو غور سے دیکھنے لگا۔ بڑی سی جیب بنی ہوئی تھی۔ جس پر زپ لگی تھی اس نے زپ کو کھینچا۔ یہ بڑی سی جیب تھی جس میں ایک موٹی سی پلاسٹک کی جھلی میں ایک عجیب ساختہ کی انگوٹھی، شناختی کارڈ موجود تھا۔ شناختی کارڈ پر اس کا نام ارشاد احمد اور سن انیس سو پینتھن درج تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لاش تقریباً بیس سال سے اس برف میں دفن تھی۔“ شیر دیکھنے لگا۔

”یار انگوٹھی یہ بہت بڑی ہے اس لاش کی انگلیاں بھی کافی موٹی ہیں۔ اسی کی ہوگی۔“ شیر نے بولتے ہوئے انگوٹھی لاش کے دائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنا دی۔ ”بات سنو بھائی، لاش پر یہ سرج کا کام بند کرو، دن ڈھل چکا ہے۔ سردی بھی بہت ہے کچھ دیر بعد اندر آ

چھا جائے گا۔ آگے چل کر خیمہ گاڑ لیتے ہیں۔ صبح واپسی کی تیاری کریں گے۔

”تو اس لاش کا کیا کریں؟“ شبیر نے پوچھا۔
”ایسا کرو اسے اپنے گھر لے چلو۔“

”ابے پاگل کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، چلو یہاں سے۔“ وکی نے اسے آگے دھکیلا۔

”یارا سے دوبارہ دفن تو کر لیتے دو۔ وہ رکنا ہی تھا کہ وکی نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔

”ہم تمہاری طرح پاگل نہیں جو سردی میں دوبارہ اسے دفن کرتے رہیں۔ یہاں برف باری ہوتی رہتی ہے۔ رات بھر میں جاری برف باری دوبارہ اس کا جسم ڈھانپ دے گی۔“ کچھ دور چلتے کے بعد انہوں نے

ایک مناسب جگہ خیمہ گاڑا اور کبلوں میں گھس گئے۔ مہوش نے قہر ماس میں موجود چائے سب کو پیش کی۔ اس غضب کی سردی میں چائے انہیں بڑا مزہ دے رہی تھی۔ کچھ دیر

گپ شپ کے بعد کھانا کھایا اور کبلوں میں دیک گئے تھکن سے جلد نیند آ گئی اور وہ سو گئے۔

ایک کریناک انسانی چیخ کی آواز سن کر ان کی آنکھ کھلی وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ ایک دیوہیکل شخص کسی کو کندھے پر ڈالے بجلی کی سی تیزی سے خیمے سے بھاگا۔

”کون تھا یہ؟ کسے اٹھا کر بھاگا ہے؟ اور چیخا کون ہے؟“ وکی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”حیدر خیمہ سے غائب ہے۔“ شبیر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ مہوش اور شازیہ خوف کے مارے کانپ رہی تھیں۔

”چلو اسے ڈھونڈتے ہیں۔“ وہ ٹارچیں ہاتھوں میں لئے خیمے سے باہر نکلے۔ قدموں کے نشان ایک طرف جارہے تھے۔ وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ مہوش نے انہیں روک دیا۔ ”رات بہت ہو رہی ہے سرد ہوا کیں چل رہی ہیں۔ یہ نہ ہو ہم حیدر کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی کھائی میں گر جائیں۔ ایسا کرو یہ رات کی طرح بے سر کرو، صبح حیدر کو ڈھونڈتے ہوئے واپس لوٹ جائیں گے۔“

وہ سب واپس خیمے میں آ گئے۔ ”یارا وہ تھا کون؟ اس کا

چہرہ نہیں دیکھا لیکن لگتا تو انسان تھا۔“ شبیر نے کہا۔
”نہیں وہ بھوت پریت یا ڈریکولا ٹائپ کی کوئی چیز تو نہیں۔“ شبیر نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور سب خوف سے لرز اٹھے۔ ”یہ سب تمہارا قصور ہے شبیر جب سے تم اس لاش کے چکر میں پڑے اسی کے بعد سے مصیبتیں ہم پر ٹوٹ پڑی ہیں۔“ وکی غصے سے چلا یا۔

”آپس میں مت لڑو، آپس میں لڑنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ اگر وہ کوئی بدروح یا بھوت پریت قسم کی کوئی چیز ہے تو ہو سکتا ہے ہمارے پیچھے پڑ جائے، ہمیں چوکنا رہنا ہوگا۔“

شبیر نے کہا۔
”وہ باتیں کرتے رہے جاگتے رہے، ڈر اور خوف کے عالم میں بھلا نیند کیسے آتی ہے۔ وہ جاگتے رہے اور صبح ہوگی۔“

وہ سب حیدر کی پراسرار گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھے۔ ناشتہ بھی نہ کیا۔ سامان سمیت کراہی کے راستے پر چل دیئے، رات بھر ہونے والی برف باری نے قدموں کے نشان مٹا دیئے تھے۔

اچانک ایک غار کے دہانے کے پاس سے گزرتے ہوئے شبیر رک گیا۔ ”اس غار کو بھی دیکھتے چلتے ہیں۔“ وہ غار میں داخل ہو گیا۔

”دیکھو شبیر تمہاری تجسس کی عادت کے ہاتھوں پہلے ہی حیدر کی صورت میں نقصان ہو چکا ہے۔ چھوڑو غار کو واپس چلو۔“ وکی اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔

”ارے یہ دیکھو حیدر کا موبائل فون۔“ شبیر چیختے ہوئے بولا اور ایک طرف پڑا موبائل اٹھالیا۔ وہ غور سے موبائل کو دیکھنے لگے وہ واقعی حیدر کا موبائل تھا۔

”میری مانو تو آگے مت جاؤ ہمارے پاس کسی قسم کا ہتھیار بھی نہیں یہ نہ ہو کہ ہم خطرے میں گھر جائیں۔“ وکی کے لہجے میں تشویش تھی۔

”تو کیا ہم حیدر کو بھول کر یہاں سے لوٹ جائیں، ایک جیتا جاگتا انسان ہمارے درمیان سے غائب ہو گیا وہ ہمارا دوست تھا، ہم واپس لوٹ کر اس

سے کھر والوں کو کیا جواب دیں گے۔“ شبیر جذباتی ہو گیا اور اپنے بیک کی زپ کھول کر تیز دھار خنجر نکال لیا۔ ”تم بھی اپنے بیک سے خنجر نکال لو، اس وقت ہم سوئے ہوئے تھے اس لئے وہ حیدر کو لے جانے میں کامیاب ہو گیا اب جاگتے ہوئے دن کی روشنی میں ہم پر قابو پانا آسان نہیں، ہم دوسروں ہیں ہمارے پاس خنجر موجود ہیں۔“

شبیر پر عزم لہجے میں بولا۔
غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ وہ چلتے رہے غار شیطان کی آنت کی طرح لمبا تھا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اب تک ان کے سامنے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔

کافی آگے جانے کے بعد اندر ہونے لگا انہوں نے اپنی ٹارچیں روشن کر لیں۔

اچانک شازیہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ انہوں نے اپنی ٹارچوں کا رخ اس کی طرف کیا تو ڈر کے مارے انہیں سینے میں اپنا سانس رکنا ہوا محسوس ہوا۔ نیچے

حیدر کی ادھڑی ہوئی لاش موجود تھی۔ اس کا سینا اس بری طرح ادھیڑا ہوا تھا کہ لگتا تھا کسی خونخوار دہنے نے اسے اپنے پنچوں سے ادھیڑا ہوا، شہرہ لگ رہی تھی۔

مہوش اور شازیہ خوف سے چیختے لگیں۔ شازیہ کے ہاتھ اور کپڑے حیدر کی لاش پر گرنے سے خون میں لت پت ہو چکے تھے۔

”شبیر اب بھی وقت ہے، ہمیں سے واپس لوٹ جاتے ہیں یہ بہت خطرناک جگہ ہے، اس غار کا خاتمہ ہو کر نہیں رہا۔ نہ جانے یہ کتنا لمبا غار ہے، اندر ہوا بڑھتا ہی جا رہا ہے۔“ وکی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

حیدر کی خوچنگاں لاش دیکھ کر شبیر بھی ڈر چکا تھا۔ اس نے اس بار کوئی اعتراض نہ کیا اور واپس غار کے دہانے کی طرف پلٹ پڑے۔ شازیہ اور مہوش کے پیچھے وکی چل رہا تھا۔ سب سے پیچھے شبیر ہاتھ میں خنجر تھامے چل رہا تھا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ دھب کی آواز سنائی دی، یوں لگا جیسے کسی نے چھلانگ لگائی ہو، اور ساتھ ہی شبیر کی دلدوز چیخ سنائی دی، وہ تینوں تیزی سے

پلٹے اور خوف سے ان کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔
وہی بھیاں لاش جس کا جسم شبیر نے برف کے نیچے سے نکالا تھا۔ شبیر کو دبوچے ہوئے تھی۔ وکی کی ٹارچ کی روشنی لاش کے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنا جلا ہوا خوفناک چہرہ اوپر کر کے اٹکلی آکھ سے انہیں گھورا۔ وہ چیختے ہوئے غار کے دہانے کی طرف بھاگے۔ خونی لاش نے اچانک اپنے دراتی نما ناخنوں سے شبیر کا سینا ادھیڑ ڈالا، یہ دل دہلا دینے والا لرزہ خیز منظر تھا۔ وہ تینوں چیختے ہوئے غار سے باہر نکل آئے۔ ڈر اور خوف سے ان کے بیک ہاتھوں سے چھوٹ کر غار میں ہی گر چکے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے اس وقت کو کوکس رہے تھے جب انہوں نے اس پہاڑ پر آنے کا پروگرام بنایا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ رک گئے۔ آگے راستہ نامور تھا۔ ان کے ارد گرد خطرناک قسم کی کھائیاں تھیں کوہ پیما کی کاسامان بیگیوں سمیت غار میں رہ گیا تھا لہذا وہ محتاط انداز سے آگے بڑھنے لگے۔

انہیں چلتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی اب بھی وہ کافی بلندی پر تھے۔ خونی لاش کے خوف سے وہ ہمار کے چلتے رہے۔

اچانک انہیں اپنے پیچھے کسی کے غرانے کی آواز سنائی دی مڑ کر دیکھا تو وہی خونی لاش ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اسی وقت مہوش کی چیخ سنائی دی، پلٹ کر دیکھا تو وہ لاش مہوش کو دبوچ چکی تھی، وہ مہوش کو بھول کر چیختے ہوئے ایک طرف بھاگے۔ وکی کے ہاتھوں سے خنجر چھوٹ کر گر چکا تھا۔ شازیہ کافی دور آنے کے باوجود خوف سے چیخ رہی تھی۔

خونی لاش ان کے سامنے تین انسانی زندگیوں کے چراغ گل کر چکی تھی۔ انہیں نشیب میں اپنی ہائی کلس تک پہنچنے کے لئے کافی وقت چاہئے تھا۔ ان کے ڈرائیور کی قسمت اچھی تھی جو اس نے ان کے ساتھ اس برفانی پہاڑ پر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ گاڑی میں کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا سامان وافر مقدار میں تھا اس

لے وہ مطمئن ساد ہیں رہ گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ صحن سے چور ہوئے تو ایک جگہ بیٹھ کر پانی لگے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھ کر چلے گئے۔

اچانک انہیں رکنا پڑا آگے بہت بڑی کھائی تھی۔ جسے پار کرنے کے لئے کوہ پائی کا سامان ضروری تھا۔ اگر کھائی سے بچنا چاہتے ہو تو انہیں طویل چکر کاٹنا پڑتا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں انہیں اپنے پیچھے غراہٹ سنائی دی مڑ کر دیکھا تو خوف سے انہیں بدن سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ ان کے پیچھے وہی خوفناک لاش کھڑی اپنی اگلی آنکھ سے انہیں گھور رہی تھی۔ ان کے سامنے خطرناک چوہن تھی، آگے کھائی اور پیچھے خوف ناک موت وہ خوفزدہ نظروں سے لاش کو دیکھنے لگے۔ لاش نے جھپٹا مارا اور وہ کو دیوچ لیا۔ شاز یہ کی نگاہوں کے سامنے خونی لاش نے اپنے دراختی نما لبے ناخنوں سے وہ کی شہرہ رگ ادھیڑ ڈالی، وہی کا جسم اس کے بازوؤں میں ترپنے کے بعد سارکت ہو گیا۔ اس نے وہی کی لاش ایک طرف پھینکی اور شاز یہ کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ کہتے کے عالم میں کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ خونی لاش نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اچانک وہ پیچھے کی طرف لڑکھرائی اور شاز یہ کے گلے میں پڑے لاکٹ کو گھورنے لگی۔ ”لڑکی یہ لاکٹ اتار دے۔“ خونی لاش نے کھر کھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ دیکھ کر شاز یہ کا حوصلہ بڑھا کہ لاش اس کے گلے میں پڑے لاکٹ سے خائف ہے۔ ”تم کون ہو اور تمہاری ہم سے کیا دشمنی ہے؟“ شاز یہ نے ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

”میں اس پورے علاقے کا طاقتور ترین طان شے ہوں۔ میری ہر انسان سے دشمنی ہے۔ میں اس علاقے سے انسانوں کا خاتمہ کر کے رہوں گا۔“ خونی لاش نے غیر انسانی آواز میں تہقہ لگایا۔ ”طان شے کا کیا مطلب ہے؟“ شاز یہ نے پوچھا۔

”چلو مرنے سے پہلے میری کہانی سن لو۔ پھر

مجھے یہ لاکٹ گلے سے اتارنا پڑے گا۔ میرا تعلق ایک دین دار گھرانے سے تھا۔ میں اپنے والدین کی اگلی اولاد تھا۔ میں نے غربت اور تنگ دستی کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ میں اپنے باپ کی طرح صابر اور شاکر رہا تھا۔ میں راتوں رات امیر بننا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے، میں نے جوان ہوتے ہی بھٹکان شروع کر دیا۔ میری تلاش تھی دولت میں کسی کالے علم کے ماہر کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھاننا رہا۔ ایک روز علاقے میں ایک عمارت دیکھی جس کے بیرونی دروازے پر عجیب قسم کی عبارت درج تھی۔ ”قسمت بدلنے کے لئے اندر تشریف لائیں۔“ میں بلا جھجک اندر جا گھسا۔ کوئی دوسرے گزرتا تو آئے سامنے دو کمرے دکھائی دیئے۔ ایک کمرے کے دروازے کے قریب تختی آویزاں تھی۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے شارٹ کٹ راستہ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ ”اندر آ جاؤ۔“

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ میز کے پیچھے کرسی پر ایک گنجا شخص بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سانپ کی طرح چمک رہی تھیں اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ارشاد احمد۔“

”اچھا تو تم مسلمان ہو، لیکن شارٹ کٹ سے دولت حاصل کرنے کے لئے میری کچھ باتیں ماننی ہوں گی۔“

”میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“

”سب سے پہلے یہ بیو۔“ اس نے شراب کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے بنا سوچے کچھ شراب اس کے ہاتھوں سے لی اور پی گیا۔ ”بہت خوب“ وہ خوش ہو گیا۔ ”سنو ابھی کچھ دیر بعد اس کمرے میں ایک لڑکی آئے گی تم نے اس کی عزت تار تار کرنی ہے۔“ اس نے دوسرا حکم دیا شراب کا شہجہ پراثر انداز ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد واقعی ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوئی، اس شخص کے اشارے پر میں نے اسے

دیوچ لیا اور اس کے سامنے اس لڑکی کو روند ڈالا۔ لڑکی بچتی چلائی رہی۔ ”اب اسے ذبح کر ڈالو۔“ اس نے ایک تیز دھار خنجر میری سمت پھینکا میں نے اس بار اس کا حکم ماننے میں تامل کیا تو وہ چلا یا۔ ”جلدی کرو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“

میں نے خنجر اٹھا کر روٹی بلکتی لڑکی کو ذبح کر ڈالا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لڑکی کی گردن سے بچنے والا خون فرش پر گرنے کے بجائے غائب ہو رہا تھا۔ ”شباباش اب مجھے سمجھ کرو۔“ دولت کی لالچ

اس قدر مجھ پر حاوی ہو چکی تھی کہ میں نے اسے سمجھ کر ڈالا۔ ”آج سے تمہارا نام طان شے ہے، یہ انگوٹھی پہن لو۔“ اس نے ایک انگوٹھی میری طرف بڑھائی اور میں نے اسے پہن لیا۔

”تمہاری زندگی بدل چکی ہے۔ اب تم نے روزانہ ایک نو جوان لڑکی کا قتل کرتا ہے جس کا خون شاکلی بنے گی تمہاری طاقت بڑھتی جائے گی ایک بات کا خیال رکھنا اس انگوٹھی کو کسی پانی نہ لگنے پائے۔ اور خیال رکھنا کبھی بھی کوئی نیک کام مت کرنا۔ شاکلی تمہیں ملا مال کر دے گی، جب تک یہ انگوٹھی تمہاری انگلی میں رہے گی وہ تمہاری مددگار رہے گی۔“

”آپ کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ میں شیطان ہوں اب تم میرے چیلے ہو اور تمہارا نام اب طان شے ہے۔

”طان شے کا کیا مطلب ہے؟“

طان شے کواٹ کر پڑھو تو لفظ شیطان بنتا ہے۔ جو میرے کہنے پر چلتا ہے۔ وہ بھی شیطان کہلاتا ہے۔ اب تم جاؤ۔“

میں اس کے حکم پر کمرے سے باہر نکل گیا۔ گھر پہنچا تو کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ماں سے کھانا مانگا تو وہ بولی۔ ”کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں۔“ میں غصے سے کھول کر رہ گیا اور گھر سے دوبارہ باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ راستے میں ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی انہما کر غور سے دیکھا تو سونے کی اینٹ تھی، جس کا وزن کم

ویش ایک کلو تھا انیس سو چھٹے 1965ء کا دور تھا اس کے باوجود سونے کی اچھی خاصی رقم لگی تھی۔ میں نے اپنے لئے اور اپنے والدین کے لئے اچھے اچھے مہنگے کپڑے خریدے، بازار سے کھانے پینے کی اشیاء سے لدا پھدا گھر پہنچا تو والدین حیران رہ گئے۔ میں نے بہانہ بنا کر کہا۔ ”میری لائری نکلی ہے۔“ میرے سیدھے سادھے والدین مجھے سمجھتے دینے لگے کہ لائری کا پیرہ حرام ہے وہ اس پیسے کی کوئی چیز نہیں کھائیں گے، میں نے انہیں دل ہی دل میں کوسا۔

دوسرے روز میں شیطان سے کیا گیا وعدہ بھول گیا رات کو ایک خوب صورت لڑکی نے مجھے جگایا۔ ”انٹو جلدی سے میرے لئے خون کا بندوبست کر دو تم نے اپنے آقا سے وعدہ کیا تھا۔“ اس کی بات سن کر میں گھبرا گیا، گویا یہ وہی شاکلی تھی جس کا ذکر شیطان نے کیا تھا۔

میں دیوار پھلانگ کر اپنے پڑوس میں واقع ماموں کے گھر میں داخل ہو گیا۔ میری ماموں زاد جیلہ جو کہ میری مکتبہ تھی اس کے کمرے میں گھس کر اس کی شہرہ رگ خنجر سے کاٹ ڈالی۔ وہ گہری نیند میں مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ اس کا خون بہنے کے بجائے غائب ہوتا جا رہا تھا۔ میں وہاں سے لوٹ آیا۔ دوسرے روز ان کے گھر کھرام مچا ہوا تھا۔ میرے دل میں چور تھا اس لئے دھڑکا لگا رہا کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب میرا خون تو عمل بڑھتا جا رہا تھا۔

اور ساتھ ہی میرے پاس دولت دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شہر کے ایک پوش علاقے میں ایک الگ تھلک بنگلہ لے کر وہاں شفٹ ہو گیا۔ ماں باپ اور دیگر خونی رشتوں کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔

شاکلی دیوی نام کی پراسرار عورت نے مجھے خبردار کیا ہوا تھا کہ شیطان کی دی ہوئی انگوٹھی کو سوائے کبھی نہانے کے وقت کے کبھی اپنی انگلی سے نہ اتاروں ورنہ اس کا اور میرا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ انگوٹھی کو پانی کا لگنا میرے لئے نقصان دہ ہے۔ ویسے بھی

میرے لئے خون کا بندوبست کرو۔ مجھے پیاس لگی ہے، یہ نہ ہو کہ مجھے تمہارے ہی خون سے پیاس بجھانی پڑے۔“
مجھے چہرے پر جلن ہو رہی ہے۔“ میں کراہتے ہوئے بولا اور اس نے مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے زخموں میں جلن ختم ہو گئی ہو۔

بزرگ نے سزا کے طور پر میرا چہرہ جلا ڈالا تھا۔ میری ایک آنکھ بھی خالص ہو چکی تھی۔ ہمت کر کے کچھ فاصلے پر واقع ایک حویلی میں جا گھسا۔ پہلے کمرے میں جاتے ہی میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس کمرے میں ایک نوجوان لڑکی بے خبر سو رہی تھی۔ میں دبے قدموں اس کے بیڈ کے قریب جا پہنچا۔

اچانک نہ جانے کیوں اس لڑکی کی آنکھ کھل گئی، میرے ہیمانک چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ خوف سے چیخ پڑی، میں نے اسے دلوچ کراس کی شہ رگ پر خنجر پھیر دیا۔ اس کی چیخ سن کر اس کے گھر والے جاگ پڑے۔ راہداری میں سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ”صفر حسین بہن کو دیکھو اس کی چیخ سنائی دی ہے۔“ میں کمرے سے نکل کر بھاگا۔ ایک کمرے سے نکلنے والا نوجوان مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے اپنا گھٹنا میرے پیٹ میں مارا تو میں کراہ کر جھکا اور میں بھاگ نکلا، چیخ و پکار سے وہاں کے رہائشی جاگ اٹھے تھے، میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ چونکہ سب کی نظروں میں آ چکا تھا۔ اس لئے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا۔ میں نے کافی عرصہ شیطان کی پوجا کی۔ مختلف کالے جادو کے چلے کائے۔ اب میں طاقتور ہو چکا تھا۔ شیطانے طاقتیں میرا ساتھ دے رہی تھیں۔

ان ہی دنوں میں نے شیطان کے کہنے پر ہمیشہ کے لئے امر ہونے کے لئے عمل شروع کیا۔ میں اس کے حکم پر برفانی پہاڑ کے اس غار میں قفل کرنے لگا، جہاں میں نے تمہارے ساتھیوں کو مارا تھا، یہ عمل طویل مدت کا تھا، عمل کے خاتمے میں ایک روز رہتا تھا۔ میرا بدن کافی غلیظ ہو چکا تھا۔ کافی عرصہ سے نہایا نہیں تھا، بدن سے بدبو آنے لگی تھی، میل کی کہیں جسم پر جھی ہوئی تھیں، میں

نے شیطان کی دی ہوئی انگوٹھی پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈالی اور نہانے کے لئے چشمے پر جا پہنچا۔ میں نے انگوٹ باندھ رکھی تھی، لباس ایک طرف رکھا ہوا تھا، میں نہانے میں مصروف ہو گیا۔

اسی وقت کسی کی لٹاکر سنائی دی۔ میں نے نہاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تو اپنی آنکھ پر یقین نہیں ہوا، وہی نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا، جس کی بہن کو میں نے ذبح کیا تھا اور شور مچ جانے پر بھاگ نکلا تھا۔

”تم یہاں کیسے پہنچے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں صفر حسین اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لئے تجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا، اسی دوران میری ملاقات بابا نور جلال سے ہوئی۔ انہوں نے میری مدد کی اور تیری اس پناہ گاہ کے بارے میں بتایا، انہیں یہ غرض تھا کہ تو اس عمل میں کامیاب ہوتے ہی انسانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ دے گا۔“

میں نے اپنے جادو کے کئی وار اس پر آزمائے مگر ناکام رہا۔ اس نے بابا نور جلال کا دیا ہوا لاکٹ بہن رکھا تھا۔ جس پر قرآنی آیت نقش تھی۔ میں اپنے لباس کی طرف بھاگا، میرا ارادہ انگوٹھی نکال کر پہننے کا تھا مگر اس نے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال کر مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی میرے سینے میں بیوست ہو گئی۔ میں چیختا ہوا اپنے لباس پر گرا اور ہوش کھو بیٹھا۔

سالوں بیت گئے اس دوران ہونے والی برف باری سے میں برف میں دفن ہوتا چلا گیا۔ پھر کئی سال بعد تم لوگ یہاں گھومنے آئے، اس دوران تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے، میرے جسم کا کچھ حصہ ظاہر ہو گیا، جسے تمہارے ساتھی نے دیکھ لیا اور مجھے برف سے باہر نکالا اس کی سب سے بڑی بیوقوفی مجھے انگوٹھی پہنانا تھی۔

اس انگوٹھی کی پراسرار قوت سے میں دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اب تیرے مرنے کی بات ہے۔ یہ لاکٹ اتار دے وہ غرایا۔

”میں بیوقوف نہیں جو تمہاری باتوں میں آ جاؤں تم خود ہی اسے اتار دو۔“ وہ بولی اور طمان شے بے بسی

میں بیہوش بعد نہا تھا۔ شا کالی مجھے کالا جادو بھی سکھائی تھی۔ کالے جادو کے حامل صفاتی اور پاکیزگی سے دور رہتے ہیں۔

مجھے شا کالی کے لئے روزانہ رات کو نوجوان لڑکی کے خون کا بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ اب تو میں بھی انسانی خون کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک روز نصف شب کے بعد میں دیوار پھلانگ کر ایک گھر میں داخل ہوا، وہ چھوٹا سا مکان تھا جس کے خستہ حال در و دیوار گھر کے کینوں کی منقش کی داستان حیات سنار ہے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف گائے بندھی ہوئی تھی، بائیں سمت دو کمرے بنے ہوئے تھے اس پر دروازوں کے بجائے پیوند زدہ پردے لٹک رہے تھے، میں نے ایک کمرے کا پردہ ہٹا کر دیکھا اس کمرے میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر ایک بزرگ جوڑا نوحو خواب تھا، لال ٹین کی پہلی زرد روشنی میں بزرگ کا نورانی چہرہ جھک رہا تھا، دودھ کی طرح سفید داڑھی ان کے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی، جسمانی طور پر وہ دبے پتلے اور دراز قد تھے۔ دوسری چار پائی پر درمیانے قد و قامت کی بزرگ خاتون سو رہی تھیں۔ اس کمرے میں میرے مطلب کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں مایوس ہو گیا۔ وہ دن میرے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا تھا اس سے پہلے بھی دو گھروں میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اگر میں شا کالی کو سمجھتا چڑھانے میں ناکام رہتا تو میرا انجام برا ہوتا۔

شاید دوسرے کمرے میں میری امید بر آئے یہ سوچ کر میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا پردہ ہٹاتے ہی یوں لگا جیسے اس کمرے میں چار پائی پر لیٹنا وجود کوئی انسان نہیں بلکہ الف لیلٰی کی داستان کی پری ہو۔ میں بے خود سا اس کے بستر کے قریب جا پہنچا۔ پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا اور اس پر جھکنا چاہا۔

اسی وقت ایک بھاری بھر کم آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔ ”ناہجار تیری ہمت کیسے ہوئی، اپنے ناپاک وجود کے ساتھ اس گھر میں گھسنے کی۔“

میں بے اختیار پلٹا وہ دبے پتلے بزرگ اپنی جلالی

نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے، میں خنجر تھا سے خطرناک ارادے سے ان کی طرف بڑھا، انہوں نے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے ہوں، مجھے اپنے چہرے پر شدید قسم کی جلن محسوس ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ میرے چہرے پر پیٹرول ڈال کر آگ لگا دی گئی ہو، میں تکلیف کی شدت سے چیختے لگا۔ ایک آنکھ سے دکھائی دینا بھی بند ہو چکا تھا۔ میں پلٹے چلنے کے قابل بھی نہ تھا۔

”ملعون تو نے شیطان کا پیر و کار بن کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے اس فانی دنیا کی چند روزہ زندگی عیش و عشرت سے گزارنے کے چکر میں تو آخرت کی ہمیشہ کی زندگی فراموش کر بیٹھا۔ یہ نور جلال کا گھر ہے۔ جو خود کو اور اپنے گھر والوں کو اللہ کے حوالے کر کے سوتا ہے، کیا تو نے کبھی سوچا ہے، مرنے کے بعد اللہ کو کیا جواب دے گا۔“

نور جلال بولتے بولتے چند لمحوں کے لئے رکے، اس شور شرابے میں چار پائی پر دراز حسین لڑکی جاگ کر وہاں سے دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔

”دیکھو مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ گھر نورانی شکتی والے کا ہے، رہی بات مر مر کر جینے کی تو مجھے اس پر یقین نہیں، بھلا کوئی مرنے کے بعد بھی زندہ ہوا ہے۔ مجھے تمہاری طرح زندگی بسر کرنے کا کوئی شوق نہیں بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے، سسک سسک کر جیو۔“ میں زہر خند لہجے میں بولا۔

”لگتا ہے تیرے دل پر مہر لگ چکی ہے، میں تجھے چھوڑ تو رہا ہوں لیکن ساتھ میں تنہی بھی کر رہا ہوں، دوبارہ بھولے سے بھی ادھر کا رخ مت کرنا، شیطانی حرکتیں چھوڑ دے، اللہ کی لاکھی بے آواز ہے۔“ انہوں نے کہا اور مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔

میں جیسے ہی پلٹے چلنے کے قابل ہوا تو وہاں سے بھاگ نکلا۔

کچھ ہی دور گیا تھا کہ شا کالی میرے سامنے ظاہر ہو گئی۔ وہ سخت غصے میں معلوم ہو رہی تھی۔ ”تمہیں کس نے کہا تھا نورانی شکتی والے کے گھر میں گھسو جلدی سے

سے اسے دیکھنے لگا کہ قرآنی آیات پڑھتی ہوئی راستہ بدل کر شیب کی طرف بڑھی۔

خونی لاش کافی دیر تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔ چیخ کر وہ اسے لاکھ اتارنے کو کہتا رہا مگر وہ گرتی پڑنی چلتی رہی۔ مایوس ہو کر طمان شے نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

کئی گھنٹوں بعد جب وہ اپنی گاڑی تک پہنچی تو صحن سے اس کا برا حال تھا۔ ڈرائیور اسے تنہا آتے دیکھ کر چونک پڑا۔ ”آپ کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا تو شازبیہ نے روتے ہوئے اسے پہناڑ پر پیش آنے والے سارے واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ سخت خوفزدہ حالت میں وہاں سے نکلے۔

رات گئے شہری حدود میں داخل ہوئے ہی تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ”لگتا ہے فیول ختم ہو چکا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اب کیا ہوگا؟“ شازبیہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”ہوسکتا ہے شاید کسی گاڑی سے لفٹ مل جائے۔“ اسی وقت دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں، سامنے سے کوئی گاڑی آ رہی تھی۔ ڈرائیور بولا۔

”نیچے اتریں ان سے لفٹ لیتے ہیں۔“ وہ دونوں گاڑی سے اترے کچھ دیر بعد گاڑی نزدیک آ گئی۔

ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک بڑی سی جیب تھی۔ جس میں ڈرائیور سمیت چار افراد سوار تھے۔ تیز رفتار جیب کے بریک چرچرائے اور وہ ان کے قریب رک گئی۔

”بیٹا ہمیں لفٹ چاہئے۔“ ڈرائیور بولا۔

”لفٹ تو مل جائے گی پر تمہیں نہیں اسے۔“

ایک موٹا سا شخص ہنستا ہوا جیب سے اترا اور شازبیہ کی طرف بڑھا۔ ”رک جاؤ خبیث۔“ ڈرائیور نے اسے روکنا چاہا جیب میں بیٹھے افراد میں سے ایک نے اپنے ہولسٹر سے ریو اور نکالا اور ٹیگر بادیا۔ گولی ڈرائیور کے

سینے میں لگی۔ وہ چیخا ہوا سرک پر گرا اور تڑپنے لگا۔ مونے شخص نے خوفزدہ شازبیہ کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور جیب کی طرف بڑھنے لگا۔ شازبیہ چیختے چلاتے ہوئے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ اس نے شازبیہ کو اٹھا کر جیب کی پچھلی نشست پر بٹھا۔ ”ناصر اسے سنبھالو۔ اور اپنے ٹھکانے پر لے چلو۔“

جیب کی پچھلی نشست پر موجود دو افراد نے اسے دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے ان کی گرفت میں جکڑ رہی تھی۔ اس پر وہی مثال صادق آ رہی تھی۔ آسمان سے گرا سمجھور میں الگا۔ وہ طمان شے کے ہاتھوں سے بیچ کر ان لٹیروں کے ہتھے چاڑھی تھی، جو نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

☆.....☆.....☆

مشل اس تنہا کمرے میں بندھی پڑی تھی۔ ساحل کو بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا تھا۔ اسے ساحل کی سلامتی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ شمت واپس لوٹنے کے بعد نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ اس کے لئے مزاحمت کرنا بھی ناممکن تھا۔ دونوں ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے تھے۔ پاؤں بھی مضبوطی سے بندھے تھے۔ اسے معلوم تھا اس وقت عمارت میں راشد نام کا آدمی تنہا موجود ہے۔ اگر وہ بندھی ہوئی نہ ہوتی تو اس اکیلے آدمی پر قابو پانا اس کے لئے ناممکن نہ تھا۔ کچھ دیر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد وہ بمشکل کھینچتی ہوئی باہر سے لاک دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے اس طرح آگے بڑھنے میں کافی دقت ہو رہی تھی۔ بالآخر وہ دروازے پر جا پہنچی۔ اس نے بندھے ہوئے پاؤں زور زور سے لکڑی کے دروازے پر مارنے شروع کئے اور ساتھ ہی ساتھ چلاتی جا رہی تھی۔ ”کوئی ہے؟“ کچھ دیر بعد دروازے کی طرف بڑھتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کھٹک کر دروازے سے کچھ دور ہو گئی۔ قدموں کی چاپ دروازے پر آ کر رک گئی۔ کی ہول میں چابی گھومی اور دروازہ کھلا۔ گرائڈیل راشد راتفل کندھے پر لٹکانے

اس کے قریب آ کر رک گیا۔

”کیا تکلیف ہے؟ کس لئے شور مچا رہی ہو؟“

”ری میرے ہاتھوں اور پاؤں میں اس قدر سختی سے بندھی ہے کہ مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے پلیز! مجھے کھول دو۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولی۔

”تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے جو میں تمہیں کھول دوں۔“

”تم شکل صورت اور دل کے مجھے دکھائی دیتے ہو اور کافی ہنسنے بھی ہو، یقیناً جانو میں تمہاری وجاہت سے سخت متاثر ہوں۔ ویسے بھی میں ایک لڑکی ہوں، ہاتھ پاؤں آزاد ہونے کے بعد تمہارا کیا کیا کر سکتی ہوں۔“

اس کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”تف ہے تمہاری مردانگی پر مرد ہو کر ایک نبی لڑکی سے ڈرتے ہو۔“ مشل نے اس پر طنز کیا۔

عورت اگر کسی مرد پر نظر کر لے تو وہ ہوش کھو بیٹھتا ہے کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا۔ ”میں بڑے بڑے شیروں سے نہیں ڈرتا پھر تم تو ایک معمولی سی لڑکی ہو۔“ اس نے مشل کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے، وہ بمشکل اپنے پاؤں پر کھڑی ہو پائی، کافی دیر سی سے بندھے ہونے کی وجہ سے اسے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ کمرے میں چھل قدمی کرنے لگی۔ راشد وہ چھپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ چکی تھی۔ کچھ دیر غصے کے بعد وہ راشد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ راشد نے اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ اس کی نظروں کے سامنے جلی کی کوندی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور اس کی لک پوری قوت سے راشد کی کپٹی پر پڑی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے نظر آنے لگے۔ ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ فرٹ لگ اس کے سینے پر پڑی تو وہ الٹ کر گرا، گرتے ہی جیسے ہی اٹھا۔ ایک زوردار کہ اس کے جڑے پر پڑا، درد کی ایک کٹیلتی لہر اس کے تن بدن میں بھرنے لگی۔ اس نے کندھے سے رائفل اتار کر سیدھی کرنا چاہی، مشل نے ایک پاؤں پر گھوم کر زوردار لک اس کے رائفل والے

ہاتھ پر ماری، رائفل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گری۔ مشل کو قریب پا کر اس نے مشل کے چہرے پر مکہ مارا مشل نے ایک طرف جھکا کر دے کر خود کو بچایا اور اچھل کر اپنی دھننی کپٹی کا وار اس کے سر پر کیا۔ راشد کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ دھڑام سے منہ کے بل کمرے کے فرش پر جا گرا۔ نیچے گرتے ہی مشل کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ مشل نے تیزی سے اپنا چہرہ فرش پر لگنے سے بچایا۔ ورنہ وہ جس تیزی سے گری تھی اس کے چند دانت لازمی ٹوٹ جاتے۔ مشل نے ٹانگ جھٹکی مگر راشد کی گرفت مضبوطی تھی۔ مشل نے کروٹ لی اور اس کے اوپر سوار ہو گئی اور زوردار کھونہ اس کی ناک پر مارا، راشد کی ناک خون آلود ہو گئی مگر اس کے باوجود بھی اس نے اس کی ٹانگ نہ چھوڑی بلکہ اسے ایک طرف جھٹک کر برق رفتاری سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اس کا پاؤں مروڑ دیا۔ مشل کے جسم میں تکلیف کی ایک لہریں دوڑ گئی وہ اگرچہ مارشل آرٹ کی ماہر تھی، مگر جسمانی طاقت میں کم تر تھی راشد سے۔

اس وقت وہ اس کے خطرناک داؤ میں پھنس چکی تھی اس نے انھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ راشد کی گرفت بہت مضبوط تھی، خود کو آزاد کرانے کے لئے وہ تھوڑی سی اٹھی مگر راشد نے اپنی ٹانگ اس کے گھٹنے کے عقبی حصے پر رکھ دی اور اس کا ہاتھ اوپر پوری قوت سے نیچے کی طرف دبایا مشل کو یوں لگا جیسے اس کی ٹانگ ٹوٹنے والی ہو۔ وہ لگا تار چیخیں مارتی گئی۔ وہ اشتعال میں آ کر اس کی ٹانگ کو کھینچ کر زوردار جھٹک دے رہا تھا۔ راشد نے اسے چند ناقابل اشاعت گالیاں دیں اور مشتعل لہجے میں بولا۔ ”لومڑی کی بچی اب اچھل کر دکھا۔“ اس نے اپنے بدن کا پورا وزن مشل کے پاؤں پر ڈال دیا۔ مشل کے حلق سے لگا تار چیخیں نکلتی چلی گئیں، اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کی ٹانگ جڑے سے اکڑ چکی ہو اس نے ہمت کر کے اپنی دوسری ٹانگ کو ہاتھ میں لہرا کر اس پر وار کرنا چاہا مگر ناکام رہی اور دوبارہ فرش پر گر پڑی، اب وہ مایوس ہونے لگی تھی، اس کی گرفت سے نکلنے کا کوئی

رات کے اس سے اتنی سندر تھاری، اس کھنڈر فیکٹری میں کہاں سے آگئی؟“ فرخ کٹ والے نے اپنے ساتھی کو آنکھ مار کر کہا۔

”آنند لگتا ہے بھگوان ہم سے خوش ہے۔“

موہن بھوٹھی آواز میں ہنستے ہوئے بولا اور مشکل کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ مشکل نے اس کی ناک پر بائیں ہاتھ سے گھونہ مارا۔ موہن پیچھے کی طرف لڑکھایا، اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ انہی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ جب فرٹ لک اس کے چہرے پر پڑی، وہ الٹ کر گرا۔ آنند غضب ناک ہو کر مشکل کی طرف بڑھایا تھا کہ اس نے اچھل کر فلائنگ کلک ماری وہ اچھل کر کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور اس تیزی سے واپس آیا جیسے اس کے جسم میں اسپرنگ لگے ہوں۔ مشکل پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ اچھل کر جب سائیڈ کلک اس کے سینے پر ماری وہ پشت کے بل فرش پر جا گرا، ادھر آند پھرتی سے اٹھ کر اس کی طرف لپکا۔ مشکل اس وقت بچکی بنی ہوئی تھی۔

پے در پے چار پانچ کلک اس کے جسم پر رسید کی۔ وہ دونوں بل کر اس کو کوشش میں تھے کہ کسی طرح مشکل ان کے ہاتھ آجائے مگر اس نے ان کی یہ کوشش ناکام بناتے ہوئے گھونٹوں اور لٹاؤں سے ان کی خاطر تواضع جاری رکھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی کے ہاتھوں بچتے جا رہے ہیں تو آنند نے اپنی پنڈلی سے بندھا تیز دھار خنجر نکال لیا جبکہ موہن نے اپنے ہوسٹر سے بٹل نکال کر اس کا رخ مشکل کی طرف کر دیا۔

”بس اب اپنی اچھل کو بند کر، ورنہ اس بٹل کی ساری گولیاں تیرے جسم میں اتار دوں گا۔“ اسی وقت دروازے کی طرف سے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یہ فاول ہے کچھ تو شرم کو تم دوسرا، ایک نعتی لڑکی سے پٹ رہے ہو اور اب اس کے مقابلے میں ہتھیار نکال لئے، پھینکوا نہیں اور مردانہ وار لڑو، ورنہ میں خود تمہیں گولی مار دوں گا۔“ تینوں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے پر لمبا بڑا ٹکا ورژنی جسم کا مالک ادھر بڑھ کر ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ میں جدید رائفل اٹھا رکھی تھی۔ جس کی نال کا رخ ان

کی طرف تھا۔

”باس آپ۔“ ان دونوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں میں، تم نے سنا نہیں اپنے ہتھیار پھینک کر اس لڑکی کا مقابلہ کرو۔“ وہ غرایا۔ ان دونوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی دونوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے اور ایک ساتھ ہی مشکل پر چھلانگ لگا دی۔

مشکل نے فٹ بازی کھائی اور بچکی کی طرح لہرا کر فضا میں غوطہ لگایا اور ان کے درمیان سے نکل گئی، رائفل بردار باس نے رائفل کندھے سے لٹکانی اور بے اختیار تالیاں بجانے لگا۔ ”واہ دل خوش کرو یا شیر کی بچی۔“ وہ باس کی آواز سن کر دونوں جوش میں آگئے مگر بچکی بنی مشکل کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے جبکہ وہ ان دونوں کی دل بھر کر ٹھکانی لگا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں چند پر پڑنے والی ماری وجہ سے بری طرح پھل رہے تھے۔

باس نے اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ پے در پے دو فائر ہوئے۔ اس کا نشانہ غضب کا تھا۔ گولیاں دونوں کے سروں میں بیوست ہو گئیں۔ ”یہ آپ نے کیا کیا، یہ تو آپ کے ساتھی معلوم ہوتے ہیں۔“ مشکل حیران تھی۔

”جس طرح لوگ زخمی گھوڑوں کو گولیاں مار دیتے ہیں اس طرح میں کمزور ساتھیوں کو مار ڈالتا ہوں۔“ وہ سفاک لہجے میں بولا اور مشکل کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم رات کے اس پہر اس ویران عمارت میں کیوں داخل ہوئی تھیں؟“

مشکل نے اس کے پوچھنے پر اپنی روداد سنائی ڈالی۔ ”اوہ سڑک پر کھڑی پولیس جیپ ٹیم کے لڑکے تھے۔ میں تمہاری بہادری سے متاثر ہوا ہوں، چلو میرے ساتھ میرے ٹھکانے پر۔“ وہ اپنی رائفل کا رخ مشکل کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ وہ بے بسی اور لاچارگی سے اسے دیکھنے لگی۔ رائفل کے سامنے حراحت کے کارنگھی۔ بہتر یہی تھا کہ بے چوں چراں اس کے ساتھ چلی جاتی۔

داؤنچ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

درو کی شدت سے اس کے دماغ میں دھندلی چھاتی چلی جا رہی تھی۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنی دوسری ٹانگ کاٹھایا اور ایک زوردار لٹاؤں کا نشانہ ناف کے نیچے ٹانگوں کے درمیان ماری، جسم کے نازک ترین حصے پر چوٹ لگنے ہی راشد کے حلق سے چیخ نکلی، اس نے مشکل کی ٹانگ چھوڑ دی اور کوع کے بل جبک گیا وہ بری طرح تڑپ رہا تھا جبکہ مشکل اس کی گرفت سے نکلنے کے باوجود کوئی حرکت نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی اس ٹانگ سے محروم ہو چکی ہو۔

بڑی مشکل سے چلتی ہوئی تکلیف کی شدت سے تڑپے راشد تک بچکی اور کھڑی ہتھیلی کا زوردار وار اس کی گردن پر کیا۔ لڑکے کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ کئے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر کر بچکی کی طرح تڑپنے لگا۔

مشکل دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی، راشد کے ساتھ معرکہ آرائی میں اسے واقعی دانتوں تلے پسینہ آ گیا تھا کچھ دیر اسی طرح پڑے رہنے کے بعد اس نے اپنی دکھتی ٹانگ کو آہستہ آہستہ ہلانے شروع کیا۔ اسے اس سے اتفاق ہونے لگا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔

رات آدمی سے زائد بیت چکی تھی۔ وہ چلتی ہوئی گیٹ پر پہنچی، اب اسے چلنے سے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ گیٹ کے پاس ہی ایک گرین نمبر پلیٹ والی جیپ کھڑی تھی جس پر علی حروف سے پولیس لکھا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا اور جیپ تک جا پہنچی، خوش قسمتی سے چابی انکیشن میں موجود تھی، جیپ اشارت کر کے برق رفتاری سے عمارت سے باہر نکلی اور مخالف سمت کی طرف دوڑا دی۔ خدشہ تھا کہ انسپکٹر شمسٹ واپس نہ لوٹ آئے، صورتحال ویسے بھی سنگین ہو چکی تھی، اس کے ہاتھوں ایک پولیس اہلکار مارا جا چکا تھا، اگرچہ وہ مارا جانے والا جرائم

پیشہ تھا لیکن پولیس اہلکار تھا۔ اس کے مقابلے میں وہ اپنے بچی بھائی کا ہی ساتھ دیتے۔

مختلف سڑکوں پر جیپ دوڑاتی ہوئی وہ ویران حدود سے باہر نکل چکی تھی۔

رات کے تقریباً تین بجے وہ ایک سنسان سڑک سے گزر رہی تھی کہ جیپ ایک جھکے سے رک گئی۔ اس نے قبول بنانے والے کانٹے کو دیکھا اور سرد آہ بھری گاڑی کا نیول ختم ہو چکا تھا۔ دور دور تک کسی پٹرول پمپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اگر پٹرول پمپ ہوتا بھی تو اس کے پاس اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی، وہ جیپ سے اترتی اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگی، سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک عمارت دکھائی دینے پر وہ عمارت کی طرف بڑھی، رات کے اس پہر اسے سردی لگنے لگی تھی، وسیع و عریض عمارت کی بیرونی لائسن آف تھیں۔ بیرونی گیٹ پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ وہ بندر کی طرح پھرتی سے دیوار پھلانگ کر اندر کودی، عمارت سنسان پڑی تھی۔ اندرونی لائسن آن تھیں، فرش پر گرد و غبار کی تہہ سی جی ہوئی تھی۔ گویا عرصے سے یہ عمارت کسی انسان کے زیر استعمال نہ تھی۔ وسیع مچن کے اختتام پر درجنوں کمرے بنے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا یہ ہال نما کمرہ تھا۔ جس میں درجنوں کی تعداد میں کیمیکل کے ڈرم پڑے تھے۔ گویا یہ عمارت فیکٹری یا گودام تھی۔ وہ وہاں سے پلٹی اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا، حیرت کی بات یہ تھی کہ کسی کمرے کا دروازہ لاک نہ تھا۔ یہ کمرہ چندرہ بانہ بارہ کا تھا، فرش پر کارپٹ پڑا تھا۔ جب کہ دیواروں کے ساتھ صوفہ سیٹ رکھے تھے۔ وہ ایک صوفے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو گئی۔

کسی کے جھنجھوڑنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے دو درمیانی عمر کے سانولے چہرے والے لصحت مند شخص کھڑے تھے اور غور سے اسے گھور رہے تھے۔ ایک کے چہرے پر تلوار معرکہ بڑی بڑی مونچھیں اور فرخ کٹ داڑھی تھی جبکہ دوسرا کلین شیو تھا۔ ”اوئے موہن!

شاید راستے میں نجات کی کوئی صورت نظر آجائے۔ یہ سوچ کر وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

باس اس کی طرف سے چونکا تھا۔ وہ آگے آگے چل رہی تھی جبکہ رائفل تھا سے باس اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ وہ دونوں گیٹ پر پہنچے تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ باہر ایک شاندار سی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ ”تم گاڑی چلاؤ میں پچھلی نشست پر بیٹھوں گا۔“ مشن نے اس کی ہدایت پر لینڈ کروزر اسٹارٹ کی اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر دوڑادی۔ وہ راستہ بتاتا رہا اور وہ گاڑی چلائی رہی۔ کچھ گھنٹوں بعد ان کی گاڑی جنگل کی حدود میں داخل ہوگئی۔ صبح ہوگئی تھی۔ سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہو رہی تھیں۔ جنگل میں مختلف اقسام کے جانور اپنی اپنی بولیوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلارہے تھے۔ اب وہ کئے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔

”گاڑی دائیں سمت موڑو۔“ اس نے ہدایت دی، مشن نے اسٹیرنگ گھما کر گاڑی کا رخ دائیں سمت کر دیا۔ یہاں درختوں کی تعداد کم تھی۔ کچھ دور جا کر سپاٹ میدان آ گیا۔ میدان کے عین وسط میں طویل و عرض چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس کی دیواریں کئی فٹ اونچی تھیں۔ گیٹ کافی بڑا اور مضبوط تھا۔ مشن نے اس کے اشارے پر گاڑی گیٹ پر روکی، اچانک ارد گرد سے پانچ مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے کمانڈوز طرز کی خاکی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ گاڑی کے قریب آ کر انہوں نے سیلوٹ کیا۔

”گیٹ کھلاؤ۔“ باس نے سر کے اشارے سے ان کے سیلوٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ان میں سے ایک گیٹ کی طرف بڑھا اور دیوار پر نصب ہٹن پر انگلی رکھ دی، گیٹ سے متصل کھڑکی سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور گیٹ کھول دیا۔ مشن نے باس کے اشارے پر گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”بس اب گاڑی یہیں روک کر نیچے اترو۔“ باس نے کہا اور مشن گاڑی روک کر اس کے ہمراہ نیچے اتری۔ چاروں طرف اونچی چار دیواری کی گئی تھی۔ دیواروں پر خاردار تاریں نصب

تھیں جن میں شاید کرنٹ دوڑ رہا تھا۔

گیٹ پر نصف درجن بھر رائفل بردار چونکا کھڑے تھے۔ میدان میں ایک طرف نو جوان رائفل تھا۔ نشانہ بازی کی مشقیں کر رہے تھے جبکہ یونیفارم میں لمبوں ایک مختصا اسادہ عمر کا شخص انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ شاید وہ ان کا انسٹرکٹر تھا۔ وہ ان کے قریب سے گزر کر آگے بڑھے۔ دائیں طرف درجن کے قریب نو جوان کرائے کے مخصوص یونیفارم میں لمبوں کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک درسیائی عمر کا قبول صورت مرد کھڑا انہیں تربیت دے رہا تھا۔ ایک طرف درجنوں کی تعداد میں خیمے موجود تھے، بائیں سمت ایک شاندار سی عمارت تھی۔ مشن حیران پریشان یہ مناظر دیکھتے ہوئے باس کے شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا یہاں کرائے اور نشانہ بازی کی تربیت کیوں دی جا رہی ہے، باس شکل و صورت ہی سے جرائم پیشہ نظر آ رہا تھا۔ اب وہ عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں بھی اکا دکا یونیفارم میں لمبوں رائفل بردار نظر آ رہے تھے۔ آٹنے سامنے تربیت وار کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور مشن کو بھی اندر آئے کا اشارہ کیا۔ اس کمرے میں میز کے گرد چار افراد بیٹھے تھے۔

”میٹھوس مشن“ اس نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس کی برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”سب سے پہلے تو میں آپ سب سے ان خاتون کا تعارف کروانا ہوں۔ یہ ہیں مشن ان کا تعلق شاداب نگر سے ہے۔ ان کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ان کے کزن نے ان کی جائیداد پر قابض ہونے کے لئے ان کے شہر کو ان کے پیچھے لگا دیا جو ان کو قتل کرنے کی نیت سے ایک عمارت میں لے گیا۔ جہاں سے یہ ایک درندہ صفت پولیس اہلکار کو قتل کر کے سرکاری جیب میں بھاگ نکلے۔

ایک ویران فیکٹری میں ہمارے ہی دو کارندوں

کی نیت انہیں دیکھ کر خراب ہوگئی۔ انہوں نے بے مثال بہادری سے ان کا مقابلہ کیا اور خالی ہاتھ انہیں زیر کیا۔ میری زیرک نگاہوں نے ان کی بہادری کے جوہر کو دیکھ لیا اور انہیں یہاں لے آیا۔ اب یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ ہماری تنظیم میں کام کریں گی۔ آپ لوگ انہیں تنظیم کے مقاصد سے آگاہ کریں۔ اور مسٹل یہ چاروں میری تنظیم میں ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلے نمبر پر راجیش، دوسرے نمبر پر اکبر، تیسرے نمبر پر راجہ اور چوتھے نمبر پر راہول۔“ باس نے ان کا تعارف کروایا۔

”مس مشن ہم آپ کو اس تنظیم میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس ملک میں کمزور اور بے بس لوگوں پر بہت ظلم ہو رہا ہے۔ اس کی ایک مثال آپ بھی ہیں۔ پولیس نے آپ کی مدد کرنے کے بجائے آپ کو مارنے کی کوشش کی۔ ہماری تنظیم کی کوشش ہے کہ اس ملک میں انصاف کا بول بالا ہو۔

اس مقدمہ کے لئے ہمارے ارکان جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔“ راہول نامی شخص نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

مشن سوچنے لگی۔ اگر اس نے ان کی مخالفت کی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ان کا ساتھ دینے کی حالی بھر لے اور موقع ملنے پر فرار ہو جائے۔

”آپ کس سوچ میں پرکھیں۔“ راہول اسے سوچتے دیکھ کر بولا۔

”وہ میں سوچ رہی تھی کہ آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اس ملک میں ہمارے ساتھ بہت زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ پھر ہم کیوں خاموش بیٹھیں۔“

”بہت خوب آپ کافی سمجھ دار لگتی ہیں۔ مسٹر راہول آپ انہیں ہی آنے والی لڑکی کے ساتھ رہیں اس نے کافی تنگ کر رکھا ہے۔ یہ انہیں گائیڈ کر لیں گی۔“

باس نے کہا اور راہول کرسی سے اٹھ گیا۔

دونوں ساتھ چلتے ہوئے پانچویں نمبر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں دو لڑکیاں پہلے سے موجود تھیں،

ایک اسٹارٹ اور خوب صورت تقریباً بائیس سالہ لیکن چہرے سے سہمی ہوئی اور خوفزدہ نظر آ رہی تھی جبکہ دوسری پچیس سالہ دلیلی تھی بی بی لنگٹ بالوں کے ساتھ شوخ و چٹیل نظر آ رہی تھی۔

”یہ شازیہ ہیں۔“ راہول نے خوفزدہ لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ مس سارہ ہیں۔ اب آپ لوگ آپس میں کپ شپ کریں میں چلتا ہوں۔“ راہول کمرے سے باہر نکل گیا۔

مشن نے کمرے کا جائزہ لیا۔ چودہ بائی بارہ کے اس کمرے میں دو خوبصورت بیڈ تھے، فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف ٹرائی پر کڑی دی اور DVD رکھا تھا۔ دونوں لڑکیاں ایک ہی بیڈ پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”میرا نام مشن ہے۔“ مشن نے ہاتھ ملاتے ہوئے ان سے اپنا تعارف کروایا۔ اور ان کے برابر بیٹھ گئی۔

”مشن آپ یہاں کیسے پہنچیں؟“ سارہ نے پوچھا اور مشن نے اپنی روداد سنادی۔

”اور تم یہاں کیسے پہنچیں؟“ مشن نے سارہ کی طرف دیکھا۔

”میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ مجھے شروع سے ہی فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ کالج کے ایک اسٹوڈنٹ سے میں پر فارم کر رہی تھی کہ وہاں بیٹھے ایک پروڈیوسر کی نظر مجھ پر پڑی، اس نے مجھے فلموں میں کام کرنے کی آفر کی، میں تو اس کی آفر سن کر ہواؤں میں اڑنے لگی۔ مگر جب گھر میں ذکر کیا تو طوفان کھڑا ہو گیا۔ میرے والدین اور بھائی نے سخت مخالفت کی مگر مجھ پر جنون سوار تھا۔ میری بھوک ہڑتال کا بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں کالج کے یہاں گھر سے نکلی اور پروڈیوسر کے گھر جا پہنچی۔ جو مجھے اپنی چٹنی چٹری باتوں سے اونچے خواب دکھاتا۔ ایک روز اس نے چائے میں مجھے نہ جانے کیا پلوایا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔

رات گئے مجھے ہوش آیا تو پتہ لگا کہ اس کمینے نے میری عزت لوٹ لی تھی۔ میں نے بہت واٹا کیا مگر وہ خبیث ہنستا رہا، اس کا بھئی دھند تھا، بھولی بھالی لڑکیوں کو

بہکا کر بر باد کرنا، بعد ازاں اس نے مجھے عصمت فروشی کے اڈے پر فروخت کر دیا۔ جہاں میں چھ ماہ تک رہی، پھر ایک دن موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ گھر پر پہنچی، میرے صدمے اور رسوائی سے میرا پاپ ہارٹ ایک سے مرچکا تھا۔ والدہ زندوں میں شمار تھی نہ مردوں میں، اسے فاج ہو چکا تھا۔ غیرت مند بھائی نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ در بدر بھٹکتے اور انسان نما بھیڑیوں کے ہتھے چڑھتے چڑھتے میں راہول صاحب تک جا پہنچی۔ جو مجھے یہاں لے آئے اب یہاں پر مجھے تین ماہ سے زائد بیت چکے ہیں۔“ سارہ نے اپنی آپ جتنی ختم کرتے ہوئے پلکیں جھپکا سیں۔

”اب تم بناؤ شازیہ کی تم یہاں کیسے پہنچیں؟“

مشل نے شازیہ کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اداس لہجے میں بولی۔ ”میری داستان عام سی ہے۔ لومیرج کی وصل سے پہلے ہی جدائی ملی، میرے شوہر انتقال کر گئے۔ میں ہر وقت ان کی یادوں میں کھوئی رہتی تھی۔ میرے کزن اور ان کے دوست اپنے ساتھ برفانی پہاڑ پر کھو مانے لے گئے وہاں ہمیں ایک لاش ملی جو برف میں دبی ہوئی تھی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود بھائی کے ایک دوست نے برف کھود کر لاش کو باہر نکالا اس قدر بھیانک لاش تھی کہ میں بتا نہیں سکتی، ہم لاش کو وہاں چھوڑ کر نکلے۔ رات کے وقت خیے میں وہی لاش زندہ ہو کر گھس آئی، غرض یہ کہ اس لاش نے میرے سوا سب کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ میں بھی اس لاکٹ کی بدولت زندہ بچا پائی جو میں نے پہچن رکھا ہے۔ لاش سے نجات پا کر میں گاڑی میں روانہ ہوئی، وہاں چند ادا باشوں نے پکڑ لیا اور ایک ویران مکان میں لے گئے میں نے عزت بچانے کے لئے چیخا چلانا شروع کر دیا۔ راہول صاحب وہاں آن پہنچے۔ انہوں نے مجھے ان سے بچایا اور یہاں لے آئے۔“ شازیہ نے اپنی کہانی ختم کی اور اپنے گلے میں پڑے لاکٹ کو اٹھائے پلٹنے لگی۔

”ایک منٹ یہ لاکٹ مجھے دکھانا یہ مجھے وہی لگتا ہے جو پولیس کی کھینچا تانی میں مجھ سے گر پڑا تھا۔“ مشل

چونک پڑی۔

شازیہ نے اپنے گلے سے لاکٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ ”ہاں یہ وہی لاکٹ ہے جو میرے نانا اور جلال نے میرے لئے بھجوا دیا تھا۔“ مشل بے ساختہ بولی اور شازیہ چونک پڑی۔ ”نور جلال بابا کا نام زندہ خونی لاش نے بھی لیا تھا۔“ شازیہ نے لاش کی زبانی سنی کہانی بھی اسے سنا ڈالی۔

”اگر تمہارے پاس یہ لاکٹ نہ ہوتا اور میں اسی شکل و صورت کی برف میں دفن لاش خواہوں میں بھی نہ دیکھتی تو تمہاری باتوں پر یقین نہ کرتی، ویسے ایک بات تو بتاؤ تمہارے شوہر کیسے مرے تھے؟“ مشل نے پوچھا۔ ”جو ہوتا تھا وہ ہو گیا اب بتانے سے انار دور ہی بڑھتا ہے۔“ وہ اداس لہجے میں بولی اور گرم صدم ہو گئی۔ ”سارہ مجھے تو رانگی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہا اور میرے کی دروازے بال بین نکال کر ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اسے تھما دیا۔ مشل نے پڑھا۔ لکھا تھا کہ ”اس کمرے میں حساس انسٹرکشن فون نصب ہے یہاں ہونے والی ہر بات آفس میں سنی جاتی ہے۔ ان کے خلاف اس عمارت میں کوئی بات مت کرنا اور نہ ہی اس تنظیم کے بارے میں کسی سے کچھ کہنا جو بات کرنی ہو، موقع پا کر عمارت سے باہر میدان میں کرنا۔“ مشل نے پڑھ کر اسے دیکھا، سارہ نے کاغذ کا ٹکڑا اس سے لیا اور ہاتھ روم میں جا کر فلتش میں بھا دیا۔

”سارہ میں تو کہتی ہوں یہ لوگ ہمارے سچے ہمدرد ہیں اس ملک نے ہمیں دیایا کیا ہے۔“ مشل نے سارہ کو آگے مارتے ہوئے کہا اور سارہ مسکرائی۔ ان میں کافی دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، جیسے وہ اس تنظیم کی وفادار ہیں۔ مشل کا ان باتوں سے مقصد تھا کہ تنظیم کے لوگ ان سے بے فکر ہو جائیں۔ اس روز وہ کمرے میں ہی رہیں۔ کافی دیر تک گپ شپ کرتی رہیں۔ ان کا کھانا کمرے میں ہی آیا۔ شازیہ چپ چاپ تھی۔ رات میں وہ جلد ہی سو گئیں۔ آدھی رات کو

شازیہ کی چیخ سن کر ان کی آنکھ کھلی۔ سارہ اور مشل ایک بیڈ پر تھیں جبکہ شازیہ ایک بیڈ پر تھیں۔ سارہ نے پھر کی سے اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ناقابل یقین منظر تھا۔ لمبا چوڑا دیوید کل شخص جس کا چہرہ انتہائی بھیانک تھا۔ شازیہ سے لپٹا ہوا تھا جبکہ وہ چیخیں مارتے ہوئے اسے اپنے اوپر سے دھکیلتے کی کوشش کر رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ پھر وہ شخص کمرے میں داخل کیسے ہوا؟

”غیبت انسان چھوڑ داسے۔“ مشل چلائی اور ساتھ ہی ایک بڑا شوپیں اٹھا کر اس شخص کے سر پر مارا۔ وزنی شوپیں اس کے سر سے ٹکر کر ٹکرے ٹکڑے ہو گیا۔ وہ شازیہ سے علیحدہ ہوا۔ اور کھڑے ہو کر مشل کی طرف اپنی خون آشام آنکھوں سے گھورنے لگا۔ ”کون ہو تم اور یہاں کیسے پہنچے دروازہ تو مقفل تھا؟“ مشل نے حیرت سے پوچھا اور سارہ ایک طرف خوفزدہ سی کھڑی تھی جبکہ شازیہ بیڈ پر سکتے کے سے عالم میں پڑی تھی۔

”میں طان شے ہوں یہ دیواریں اور مقفل دروازے مجھے نہیں روک سکتے نہ ہی تمہاری دنیا کے لوگ مجھ پر قابو پا سکتے ہیں جن کے خون کی خوشبو ایک بار سوگھ لوں یا جسے ایک بار دیکھ لوں پھر وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتا۔ یہ لڑکی میرے ہاتھوں سے بچ نکلی تھی۔ آج جیسے ہی اس کے گلے سے لاکٹ اترا مجھے معلوم ہو گیا اور میں یہاں پہنچا۔ مگر یہاں تو ایک کے بجائے تین تھیں۔ اس کے بعد تم دونوں کی باری ہے۔“ وہ سفاک لہجے میں بولا اور دوبارہ شازیہ کی طرف بڑھا۔

مشل نے فضا میں قلا بازی کھائی اور اسے فلائنگ کلک ماری یہ دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ اپنی جگہ پر تن کر کھڑا تھا۔ فلائنگ کلک کا اس پر ذرا برا اثر نہ ہوا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر زوردار گھونٹہ طان شے کے منہ پر مارا۔ اس کا ہاتھ جھنجھٹا اٹھا اسے یوں لگا جیسے اس نے فولاد کے جسے پر گھونٹہ مارا ہو، اب وہ بھی خوفزدہ ہونے لگی تھی۔ شوپیں کا بھاری بھر کم کھڑا

لگنے کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ زوردار گھونٹہ مارنے کے باوجود اسے چوٹ نہ پہنچی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ مشل کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے آگئی۔ وہ خون آشام بلا اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہوتا جا رہا تھا۔ مشل کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

اچانک اسے ایک خیال آیا اور اس نے بابا نور جلال کا لاکٹ گریبان سے نکال کر اس کے سامنے کیا۔ طان شے لاکٹ کو دیکھ کر اپنی جگہ پر رک گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

اسی وقت کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ سارہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ راہول اور راجیش ہاتھوں میں جدید ساخت کی رائفلیں تھامے اندر داخل ہوئے، طان شے بل بھر میں وہاں سے ایسے غائب ہوا جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو جبکہ شازیہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ سارہ بچتی بچتی لگا ہوں سے اس جگہ کو گھور رہی جہاں چند لمحوں قبل طان شے موجود تھا۔

راہول اور راجیش جیسے سفاک دہشت گردوں کے ہاتھ بھی پکپکا رہے تھے۔ ”یہ کون تھا؟“ راہول خوفزدہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی بھکی ہوئی آتما تھی۔“ راجیش نے کہا۔

”تم لوگ اپنے اپنے مذہب کے مطابق کچھ پڑھ کر سو جاؤ۔“ راجیش نے کہا۔

راہول بولا اور راجیش کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل گیا، پردہ خوف کے مارے رات بھر نہ سو سکے۔ مشل کی ٹریننگ بھی شروع ہو چکی تھی۔ یہ واقعی دہشت گردی کا ٹیمپ تھا۔ جہاں سیدھے سادھے نوجوانوں کو بہکا کر دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ انہیں کرائے، نشانہ بازی، ڈائنامیٹ، دستی بم، ٹائم بم، ریموٹ کنٹرول کے ذریعے بم دھماکوں کی تربیت دی جاتی تھی، اسی عمارت کی مخالف سمت ایک بہت بڑی عمارت تھی جہاں ہر قسم کے بم اور اسلحہ بھاری مقدار

میں موجود تھا۔ مثل کو وہاں رہتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے اس دوران اس نے تقریباً ہر قسم کے اسلحے کا استعمال کیکھ لیا تھا۔ تنظیم کے خاص ارکان اس پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ تربیت کا دورانیہ چھ ماہ تھا۔ اس کے بعد تربیت مکمل کرنے والوں کو ملکی میدان میں اتارا جاتا تھا۔ جو یہاں سے باہر جاتے ہی اپنے ہی وطن کے خلاف اپنی طاقت کا استعمال کرتے تھے۔

اس تین ماہ کے دوران مثل یہاں کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ کچھ رہنمائی سارہ نے بھی کی تھی۔

سارہ کی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ اب کچھ روز بعد اسے بھی اس کمپ سے بھیج دیا جاتا۔ اس وقت وہ دونوں گراؤنڈ میں تربیت حاصل کرنے کے بعد چھل قدمی کر رہی تھیں۔ تنظیمی اراکین اب ان پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان پر نظر نہیں رکھی جاتی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی دوسری عمارت کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ جہاں اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ عمارت کے دروازے پر گینڈے کی جسامت کا ایک سیاسی مال گنجا شخص کھڑا تھا جس کا نام کشن تھا۔ اس کے کندھے سے جدید ساخت کی رائفل لٹک رہی تھی۔ اس کی نگاہیں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر بار بار بندیدوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”ہیلو پیئڈم کیا ہو رہا ہے؟“ سارہ نے اسے پھینچا، پیئڈم کا لقب سن کر خوشی سے اس کی ہانچیں کل گئیں۔ ”اندر آئیں ناں آپ لوگ۔“ اس نے انہیں اندر آنے کی دعوت دی۔

سارہ کے نیم عریاں حسن کو دیکھ کر اس کی عقل خط ہو چکی تھی۔ ”ابھی نہیں میرے ہیرو، میں رات بارہ بجے کے بعد آؤں گی۔“ سارہ نے سرگوشی کی اور مثل کے ہمراہ آگے بڑھ گئی، کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے میں تھیں، ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ رات کا کھانا کھا کر وہ لیٹ گئیں۔ شاز یہ سوچتی تھی جبکہ وہ دونوں جاگ رہی تھیں۔ آدھی رات کے وقت تقریباً عمارت کی تمام

لائٹس آف ہو چکی تھیں۔ ہر طرف سناٹا چھا چکا تھا وہ دونوں اپنے بستر سے انہیں دروازہ کھٹکا سا کھول کر باہر چھانکا، کوریڈور سناٹا پڑا تھا۔ باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور دبے قدموں چلے گئیں۔ عمارت کے داخلی دروازے سے میدان میں پہنچیں تو وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ وہ دونوں حیران تھیں، اتنے بڑے دہشت گردی کے کمپ میں رات کے اس پہر محافظ کہاں جا سوتے تھے۔ یا شاید وہ اس لئے مطمئن تھے کہ اس جنگل میں رات کے اس پہر اول تو کوئی آبی نہیں سکنا اگر آ بھی جائے تو اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ اس کی چار دیواری اس قدر بلند تھی کہ اس پر چڑھنا ناممکن تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف خار دار تاریں تھیں جن میں ہر وقت کرنٹ دوڑتا رہتا تھا۔ عمارت میں بجلی کی سپلائی کے لئے انہوں نے احاطے میں ایک طرف پلانٹ بنا رکھا تھا جہاں سے بجلی سپلائی ہوتی تھی۔

وہ دونوں محتاط انداز میں چلتی ہوئی اس عمارت تک جا پہنچیں جہاں اسلحے کا ذخیرہ موجود تھا۔ دروازے کے پاس کشن بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ تم نے آنے میں بہت دیر کر دی، اس نے سارہ سے گلا کیا۔

”کشن ہم مشرقی لڑکیاں ہیں، سب کے سامنے آنا مناسب نہیں تھا۔ اندر دوسرا تو کوئی نہیں؟“ سارہ نے پوچھا۔

”نہیں میں اکیلا ہوں، ورماکو میں نے رات دس بجے آرام کرنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی، آ جاؤ اندر۔“ اس نے دروازہ کھولا وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں اور اس نے دروازے کو اندر سے چٹختی لگا دی۔

”یہاں بھی کوئی مائیکروفون تو نصیب نہیں؟“ مثل نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”نہیں مجھے جہاں تنظیم کے اپنے بندے ہوں وہاں مائیکروفون نہیں ہوتا۔“

عمارت میں درجن کے قریب کمرے تھے۔ ”کیا سب کمروں میں اسلحہ ہے؟“ مثل نے پوچھا۔

”ہاں سوائے ایک کمرے کے سب کمروں میں اسلحہ ہے، جس کمرے میں، میں آرام کرتا ہوں وہاں اسلحہ نہیں ہے۔“ کشن بولا۔ اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ ”تمہارے پاس موبائل فون تو موجود ہوگا؟“ مثل نے پوچھا۔

”ہاں مگر اس سوال کا مقصد؟“

”دراصل میں چاہتی ہوں کہ تمہیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے! اپنا سیل فون آف کر دو۔“ مثل نے کہا اور اس نے ہتھوڑے کی جیب سے موبائل فون نکال کر آف کر دیا۔ اس وسیع و عریض کمرے میں صرف ایک بیڈ پڑا تھا۔ دیواروں پر جا بجا نیم عریاں اداکاروں کے فوٹو لگے ہوئے تھے۔ بیڈ کے قریب میز پر غیر ملکی شراب کی بوتل دھری تھی جو آدھی سے زائد خالی پڑی تھی، قابائے ان کے آنے سے پہلے شراب نوشی میں مشغول تھا وہ نشے میں جھومتا ہوا سارہ کی طرف بڑھا۔ مثل نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ حیرت زدہ ہو کر مڑا ہی تھا کہ مثل نے زوردار اسٹریٹ کلک اس کی انگلیوں کے بیچ میں ماری۔ وہ کراہتے ہوئے جھک گیا، مثل نے آگے بڑھ کر اپنے گھٹنے کا دار اس کے منہ پر کیا، وہ چیختا ہوا منہ کے بل گرا، مثل اپنی جگہ سے اچھل اس کی بارہنجے گرتے وقت اس کا منہ اٹھوٹا کشن کی گردن پر پڑا، کڑاک کی آواز کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کا جسم چند لمحوں ہی طرح پھڑپھڑایا، پھر ساکت ہو گیا۔ سارہ یہ معرکہ آرائی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ”مثل یم نے کیا کیا۔ اس کی موت کی خبر پھیلے ہی ہم دونوں بری طرح مارے جائیں گے۔“

”گھبراؤ نہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ دہشت گرد ہیں۔ کتنے ہی بے گناہ انسانوں کا خون ان کے سر پر ہے۔ ان سے لڑو۔ وقت ہماری جان بھی چلی جائے تو کوئی حرج نہیں، آؤ یہاں کی تلاشی لیتے ہیں۔“ وہ کمروں کی تلاشی لینے لگی۔ تمام کمروں میں بے انتہا اسلحہ تھا۔ خود کار رائفلیں، مشین گنیں، پھل، دتی بم، ٹائم بم، ڈائنٹامائٹ، وہ ان سب سے بخوبی واقف

تھیں۔ اسی کمپ میں اس تمام اسلحہ کو استعمال کرنے کی تربیت انہیں دی گئی تھی۔ مثل نے دو جدید ساخت کی رائفلیں اٹھائیں۔ ایک خود رکھی اور دوسری سارہ کو تھما دی۔ ”آخر تم کتنا کیا چاہتی ہو؟“ سارہ نے بے تابانی سے پوچھا۔

”تھوڑی دیر چپ رہو، سب کچھ میں آ جائے گا۔“ مثل نے بولتے ہوئے رائفل کندھے سے لٹکائی اور ایک ٹائم بم میں نوے منٹ کا ٹائم سیٹ کر کے بموں کے ذخیرے میں رکھ دیا۔ چار ٹائم بم اٹھائے چند دتی بم سارہ کو تھما دیے اور تیزی سے کشن کے کمرے میں داخل ہو گئی، بیڈ پر پڑے تکیے سے غلاف اتارا اور ٹائم بم غلاف میں ڈال دیے۔ ”تم بھی اپنے دتی بم اس میں ڈال دو۔“ اس نے سارہ کو ہدایت کی۔ سارہ نے اپنے ہاتھ میں موجود دتی بم تھیلے میں ڈال دیے۔ ”اب چلو شاز یہ کے پاس۔“ وہ بولی اور ساتھ ہی اسلحہ خانے سے باہر نکلنے لگی۔ وہ محتاط انداز میں تیزی سے چلتی ہوئی دوسری عمارت میں داخل ہو گئیں۔

شاز یہ اب تک سو رہی تھی۔ مثل نے اسے جھنجھوڑ کے اٹھایا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اس نے بولنے کے لئے منہ کھولا ہی چاہا تھا کہ مثل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اسے خاموش رہنے کو کہا۔ غلاف سے ٹائم بم نکالے اور ان پر ساتھ منٹ کا وقت سیٹ کیا۔ ایک ٹائم بم بیڈ کے نیچے رکھا اور ان دونوں کو کمرے سے نکلنے کا اشارہ کر کے باہر نکل آئی، عمارت میں اب تک سکوت چھایا ہوا تھا۔ عمارت کے کلین آنے والی جتانی سے بے خبر اطمینان سے سو رہے تھے۔

کوریڈور سے نکلے نکلے وہ جگہ جگہ ٹائم بم رکھتی جا رہی تھی۔ عمارت سے باہر نکل کر وہ تینوں محتاط انداز میں گیراج کی طرف بڑھنے لگیں اس گیراج میں تنظیم کے ارکان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ گیراج میں پہنچ کر مثل نے بڑے ٹائزوں والی جیب منتخب کی، جیب سب گاڑیوں سے آگے گیراج کے دروازے پر ہی کھڑی تھی۔

مشل ڈرائیونگ سیٹ پر چابی تھی۔ سارہ نے اس کے برابر والی سیٹ منتخب کی۔ شاز یہ پچھل سیٹ پر درواز ہوئی، وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھی تھیں۔ مشل بار بار اپنی کلائی پر بندھی کھڑی میں ناخوش دیکھ رہی تھی۔ خوش قسمتی سے گاڑی کی چابی انکلیشن میں موجود تھی۔ جب ہم پھٹنے میں پانچ منٹ رہ گئے تو مشل نے جیب اشارت کی اور کیراج سے نکلنے ہی آدھی اور طوفان کی طرح فل اسپینڈ سے مین گیٹ کی طرف دوڑادی۔ جیب جیسے ہی مین گیٹ کے قریب پہنچنے لگی وہاں موجود گاڑز چوکتا ہو گئے۔ انہوں نے رانقلیں کندھے سے اتار کر تائی ہی تھیں کہ مشل اور سارہ نے دو دتی ہم ان کی طرف اچھال دینے ہولناک دھماکہ ہوا اور وہاں موجود گاڑز کے جسم کے پرچے اڑ گئے۔

اسی وقت اسلحہ خانے کی عمارت اور رہائشی عمارت میں پے درپے خوفناک دھماکے شروع ہو گئے۔ دھماکے اس قدر شدید تھے کہ زمین لرز اٹھی۔ دھماکوں کی شدت سے جیب بری طرح لہرا رہی تھی۔ جیب اب مین گیٹ کے قریب پہنچ چکی تھی ان دونوں نے پے درپے دو دتی ہم مین گیٹ پر پھینکے۔ مین گیٹ کے پرچے اڑ گئے، گیٹ کے قریب موجود دو بج جانے والے گاڑز نے جیب پر فائر کئے، خوش قسمتی سے گولیاں لہرائی ہوئی جیب کے ارد گرد سے گزر گئیں، سارہ نے لاک پن ہٹائی اور گھوم کر برست مارا، دونوں گاڑز کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے، جیب ٹوٹے ہوئے گیٹ سے باہر نکل چکی تھی۔ دھماکوں کی آوازیں دور تک آ رہی تھیں۔ دوسروں کو دہشت گردی کا شکار کرنے والے آج اپنے ہی بھوں سے دہشت گردی کا شکار ہو چکے تھے۔

اچانک دو افراد جیب کے سامنے آ گئے، یہ عمارت سے باہر موجود گاڑز تھے۔ انہوں نے اپنی رانقلیں سیدھی کر کے فائر کئے، سارہ کے حلق سے نیچ نکل، دو گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو چکی تھیں۔ مشل نے دانت پیچھے ہونے جیب گاڑز پر چڑھا دی، وہ دونوں جیب سے ٹکرا کر نیچے گرے اور جیب ان کے

جسوں کو چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی، کچھ دور جا کر مشل نے جیب روک دی۔ سارہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ ”یہ کیا ہوا سارہ؟“ مشل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”روؤ مت..... میں نے اپنے..... گناہوں کا کفارہ ادا..... کر دیا ہے..... میری زندگی..... نیک مقصد کی خاطر گئی.....“ سارہ نے کہا اور ساتھ ہی اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئی۔

شاز یہ بے تحاشہ رو رہی تھی، مشل کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ دھماکوں کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔ مشل نے جیب اشارت کی اور آگے بڑھا دی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ شہری حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے جیب ایک طرف روک دی اور شاز یہ کو اتارنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنی رانقل جیب میں ہی رکھی اور نیچے اتر کر نرناک نگاہوں سے سارہ کی طرف دیکھا جو ملک کے دشمنوں سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے چکی تھی۔

شاز یہ کا ہاتھ بکڑ کر وہ ایک طرف چل دی۔ یہ اس کی مجبوری تھی، گولیوں سے چھلنی سارہ کی لاش اور جیب میں موجود اسلحہ ان دونوں کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا، اس نے جیب سے کشن کا موبائل فون نکالا اور پولیس ایمرجنسی کا نمبر ملا یا، رابطہ ہونے پر جہاں جیب کھڑی تھی اس جگہ کا ایڈریس بتا کر بولی، ”اس سڑک پر جیب میں ایک لڑکی کی لاش موجود ہے۔“ اس سے پہلے کہ دوسری طرف موجود آفیسر کوئی سوال کرتا اس نے موبائل فون ایک طرف اچھال دیا۔ ”چلو شاز یہ۔“ اس نے کہا اور اس کا ہاتھ تمام کر چلے گی۔

مشل اور شاز یہ جیب سے دور ہوتی جا رہی تھیں، اچانک انہیں ٹھیک کر کرنا پڑا، انپیکٹر شمت اور رضوان ان کے سامنے کھڑے خباثت سے ہنس رہے تھے۔ شمت کے ہاتھ میں پھل موجود تھا، جس کی نال کارخ ان کی طرف تھا۔ ”میں میری رانی بہت بھاگ دوڑ کر لی، اب کچھ آرام کرلو۔ ہمیں بھی اپنی خاطر تواضع کا موقع

دو۔“ شمت ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یار یہ دوسری کون ہے، ہے تو بڑی خوب صورت اسے مت مارنا۔“ رضوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مہارانی صاحبہ یہ سامنے جو گاڑی کھڑی ہے اس میں تشریف رکھیں۔“ شمت نے ایک طرف کھڑی لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دکھایا۔ ان کے قریب پہنچنے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے ہاتھ بڑھا کر پچھل کی طرف کا دروازہ کھولا، شمت نے پھل کی نال سے مشل کو آگے کی طرف دھکیلا وہ دونوں اندر بیٹھ گئیں۔ شمت اور رضوان ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے، قوی پہل شخص جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے مڑ کر انہیں دیکھنے لگا اس کے چہرے پر بڑی بڑی موچیں اور گال پر چاقو کے پرانے زخم کا نشان دیکھتے ہی مشل چونک پڑی۔ وہ اس منحوس چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی یہ وہی تھا جس نے اس کے والدین اور بھائی کا قتل کیا تھا۔ ”گاڑی چلاؤ گے یا نہیں دیکھتے رہو گے۔“ رضوان نے اسے ڈانٹا۔ تو اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے گاڑی اشارت کی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر سے دوڑتی ہوئی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ لینڈ کروزر دائیں سڑک پر مڑی تو سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک حزار کا بڑا سا گنبد نظر آ رہا تھا۔ حزار کے سامنے سڑک پر پھولوں کی ڈکانیں تھیں، کچھ دور جانے کے بعد گاڑی سڑک سے اتر کر دونوں اطراف سے جھاڑیوں میں گھرے راستے پر جائی، سامنے سینٹ کی چادروں سے بنا ہوا مکان تھا، ڈرائیور نے گاڑی روک کر ہارن بجایا۔ مکان کا دروازہ کھلا اور ایک پستہ قامت سیاہ چہرے والا شخص باہر نکلا۔ ”راجو! نہیں اندر لے جاؤ۔“ شمت نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص سے کہا۔ راجو نے نیچے اتر کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور مشل اور شاز یہ کو اتارنے کو کہا۔ مشل کی پینڈی سے تیز دھار خنجر بندھا ہوا تھا وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی کہ بساط کارخ پلٹ سکے۔ خالی

ہاتھ راجو نے اسے باہر آنے کا کہا تو اس نے سوچا موقع آ گیا ہے۔ باہر نکلتے ہی راجو پر ٹوٹ پڑے گی۔

وہ دروازہ کھول کر جیسے ہی لینڈ کروزر سے اتر کر راجو نے اپنے لباس میں سے ریو اور نکال کر اس کی نال کارخ ان کی طرف کر دیا، وہ دونوں ریو اور کی زد میں مکان کے گیٹ کی طرف بڑھیں، پستہ قامت شخص کو دیکھ کر مشل لہجہ بھر کر کی اور پھر مکان کے اندر داخل ہو گئی، یہ پستہ قامت شخص وہی تھا جس نے راجو کے ساتھ مل کر کئی سال پہلے اس کے والدین اور بھائی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

راجو نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور دونوں لڑکیوں کو اندر جانے کو کہا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ایک طرف چار پائی پڑی تھی، قریب ہی کرسی پر ایک ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ جسے دیکھ کر مشل حیرت سے اچھل پڑی، وہ اس کا بچا اصغر حسین تھا۔

”انکل آپ بھی۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں میں بھی اب تم ان کا غذا پر سائن کر دو، درنہ اپنی زندگی سے محروم ہو جاؤ گی۔“ اصغر حسین کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کیا ہے ان کاغذات میں؟“ مشل نے پوچھا۔

”ان میں لکھا ہے کہ تم اپنی مرضی سے اپنی تمام پراپرٹی اور بزنس میرے نام کر رہی ہو۔ اور تمہارے والد نے کروڑوں روپے کا جو قرض مجھ سے لیا تھا اس کے عوض بیٹوں میں موجود تمام رقم بھی مجھے دو گی۔“ صفدر حسین بولا۔

”یہ دونوں میرے والدین کے قاتل ہیں، ان کی آپ کے پاس موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ ان کے قتل میں آپ کا بھی ہاتھ تھا۔“ مشل نے لہجہ میں بولی۔

”ہاں یہ کام میں نے ہی ان سے کروایا تھا اب جلدی سے ان کاغذات پر سائن کر دو۔“ اصغر حسین فرمایا۔

اسی وقت رضوان اور شمت بھی کمرے میں

داخل ہو گئے۔ حشمت کے ہاتھ میں پٹل اب تک موجود تھا۔ ”کیا ہوا لڑکی سنا نہیں تم نے؟“ حشمت نے انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔

”میں سنا نہیں کرتی، تم نے جو کرتا ہے کرلو۔“ مثل فیصلہ کن لہجے میں بولی اور حشمت نے دانت بھینچے ہوئے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا دیا۔

☆.....☆.....☆

سائل شدید فزنی حالت میں ریل کی پٹری پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر رسی سے مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ اسی وقت ٹرین کی دسل سنائی دی اور پٹریاں ٹرین کے بھاری بھرکم پہیوں کی دھمک سے لرزنے لگیں، بے ہوش پڑے سائل کے سر میں پٹریوں کی لرزش سے دھمک ہونے لگی، اس نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھول دیں، بمشکل گردن گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ خوف سے اس کے روکنے کھڑے ہو گئے۔ وہ ریل کی پٹریوں پر پڑا تھا۔ آنے والی ٹرین کے بھاری بھرکم پہیوں سے پٹریاں لرز رہی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو کراہ کر رہ گیا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کے ساتھ ساتھ پورا جسم تکلیف کی شدت سے پھوڑے کی طرح دھک رہا تھا۔ اٹھنا تو درکنار اس سے ہلنا بھی نہ جا رہا تھا۔ اسی وقت ٹرین کی دسل سنائی دی، اس نے گردن کھمائی دور سے ٹرین آتی دکھائی دے رہی تھی۔

جیسے جیسے ٹرین نزدیک آتی جا رہی تھی، پٹریوں کی لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی، اس بار وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ پہلو بدل کر اٹھ بیٹھا۔ مگر اس کا سر بری طرح پھک رہا تھا۔ وہ مکروری کی شدت سے دوبارہ گر پڑا تو اس کا سر پٹری سے ٹکرایا اور لگا ہوں کے سامنے تارے رقص کرنے لگے، اس کی نگاہوں کے سامنے دھندسی چھا رہی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر ہوش میں آنے کی کوشش کی، اس وقت بے ہوش ہونے کا مطلب اذیت ناک موت تھی، اس نے تیزی سے پلکیں جھپکا نکلیں اور سامنے سے آتی ٹرین کو نزدیک ہوتا دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی وہ بمشکل اٹھ کر بیٹھ

گیا، لیکن کھڑے ہونے کی ہمت اب بھی نہ تھی، وہ کوشش کر کے لرزتے قدموں سے اٹھا۔ پٹریوں کی لرزش بڑھ چکی تھی، ٹرین کے شور کی آواز اس کے کان کے پردے پھاڑ رہی تھی، اس نے قدم آگے بڑھنا چاہے تو محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں من بھر کے ہو چکے ہوں، اس سے ہلنا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا تو آنکھوں کے آگے اندھیرا اچھانے لگا۔

ٹرین اس سے محض چند سو گز کے فاصلے پر تھی۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں، اسی وقت اس کے جسم کو دھکا لگا، وہ اڑتا ہوا سائیکل طرف جاگرا، اور ہوش و حواس سے عاری ہو گیا تھا۔

اسے ہوش آیا تو خود کو کھجور کے بیڑ پر پایا۔ جسم پر جگہ جگہ پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ سر درد کی شدت سے پٹنا جا رہا تھا۔ بیڈ کے سامنے پولیس یونیفارم میں ملبوس ایس پی ریک کا آفیسر بیٹھا تھا۔ ”ہیلو بیک مین کیسے ہو؟“ انہیں پورے دو دن بعد ہوش آیا ہے۔

”سر پورے بدن میں درد کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔“ وہ بمشکل دانت بھینچ کر بولا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا، اسے وہ معصوم لڑکی مثل یاد آنے لگی نہ جانے اس درندہ مفت انڈیکٹر حشمت نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

”نوجوان تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟ تمہیں باندھ کر کس نے ریل کی پٹری پر پھینکا تھا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں پھاٹک کے قریب اپنی گاڑی میں موجود پھاٹک کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ تم پر نظر پڑی، میں بھاگتا ہوا تم تک پہنچا اور تمہیں دھکا دے دیا، تمہاری زندگی تھی اس لئے بچ گئے ورنہ ٹرین تم سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔“ ایس پی بولا۔

”سر میرا نام سائل ہے۔ اور میری اس حالت کا ذمہ دار انڈیکٹر حشمت ہے۔ میں مثل اب تک اس کی قید میں ہیں، نہ جانے اس درندے نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔“ سائل بھرائی ہوئی آواز میں بولا، ایس پی کے پوچھنے پر اس نے ایس پی کو اس عمارت کا ایڈریس

بتایا جہاں انہیں قید رکھا گیا تھا۔ ایس پی نے پینٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملایا رابطہ ہونے پر بولا۔ ”ہیلو ایس پی اسفند یار انڈیکٹر، حشمت کو فوراً گرفتار کرلو۔“ ساتھ ہی اس نے سائل کا بتایا ہوا ایڈریس دہرایا اور رابطہ منقطع کر کے بولا۔ ”تم فکر مت کرو، میں نے ڈی ایس پی کو بھی کو اس کی پٹا گاہ پر ریڈ کرنے کا حکم دے دیا ہے، کچھ دیر بعد ہی نتائج سامنے آ جائیں گے۔“

سائل نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں، اسی دوران ایک خوب صورت سی لڑکی ڈاکٹر آئی اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد اسے پین کٹر انجکشن لگا دیا۔ انجکشن میں شاید کوئی سکون آ اور دماغی وہ دوا کے زیر اثر سو گیا۔ اسے دوبارہ ہوش آیا تو ایس پی اسفند یار سامنے ہی بیٹھا تھا۔ ”نوجوان مجھے افسوس کے ساتھ کہتا پڑ رہا ہے کہ مثل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ انڈیکٹر حشمت وہاں سے فرار ہو چکا ہے۔ اس کی غیر قانونی حرکات کی وجہ سے آئی جی صاحب نے اسے معطل کر دیا ہے۔ بہر حال تم فکر مت کرو، حشمت کے خلاف ایف آئی آر ڈکٹ چکی ہے اور اس کی تلاش میں جبکہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں، دراصل میں مثل کے ملازم نے مجھے حشمت کی اس غیر قانونی حرکت کی کچلیں کی تھی، مگر میرے پوچھنے پر حشمت نے انکار کر دیا کہ اس نے سائل نامی نوجوان اور مثل نامی لڑکی کو حراست میں نہیں لیا اب جبکہ تمہارے بتانے پر وہاں چھاپے مارا تو وہاں سے ایک پولیس اہلکار کی گردن ٹوٹی ہوئی لاش ملی ہے۔ وہاں ٹارچر سیل کا سراغ بھی ملا ہے۔ اذیت رسانی کے آلات بھی ملے ہیں، جانے وقوعہ پر خون کے دھبے بھی پائے گئے ہیں۔ حشمت نہ ہی اپنے گھر پر ہے اور نہ ہی اپنے کسی ٹھکانے پر موجود ہے۔“

ایس پی نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ سائل تقریباً پندرہ دن زیر علاج رہا، اس دوران ایس پی اسفند یار برابر روزانہ اسے ملنے آتا رہا۔ صحت یاب ہوتے ہی ایس پی اسے اپنے گھر لے گیا۔ تقریباً

ایک ہفتہ سائل وہیں رہا۔ اس دوران ایس پی اسے جیب خرچ کے لئے پیسے بھی دیتا رہا۔ ایک روز جبکہ ایس پی اپنے آفس میں تھا سائل وہاں سے نکل پڑا۔ اب وہ اپنی محنت شاذیہ کے گھر اس کے لئے جا رہا تھا۔ شاذیہ کے بچکے کے سامنے پہنچ کر اسے دھچکا لگا۔ گیٹ پر بڑا سا ٹالاکہ رکھا تھا۔ وہ چند لمبے حیرت اور پریشانی سے گیٹ پر لگے تالے کو دیکھتا رہا۔ پھر برابر والے بچکے کی اطلاع چھٹی بجادی۔ گیٹ کھلا اور ایک صحت مند چوکیدار کندھے پر رائفل لٹکائے باہر نکلا۔ ”ہاں صاب کس سے ملتا ہے؟“

”یہ برابر میں بچکے کو ٹالاکا ہے اس کے کلین کہاں گئے؟“ اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ ”اوصاب کیا پوچھتا ہے خوچہ ادھر بہت جلم ہوا ہے امارا تو کو بڑی کام نہیں کرتا کہ ادھر کا لوگ ایسا ہے۔“ چوکیدار اپنے مخصوص لب و لہجہ میں شروع ہو گیا۔ ”خان صاحب میں نے پوچھا ہے یہ لوگ کہاں گئے؟“ اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔

”بات یہ ہے ہائی کہ اس بچکے کا مالک نخل (قتل) ہو گیا۔ اس کا داماد اس کو قتل کے الزام میں پھانسی ہو گیا۔ اس کا بیٹی اپنا رستے دار کے ساتھ گونے گیا۔ اس کا سب رستہ دار قتل (قتل) ہو گیا کو اس کا بیٹی کا گائب ہو گیا۔ اس کا جوان بی وی ماریہ اور سیکریٹری آ بیہاق کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ آ بیہاق (آفاق) نے ماریہ سیکم کو کوئی ماریہ دیا، اس کو پولیس پکڑ کر لے گیا، پولیس کو آ بیہاق نے بتایا کہ اس نے ماریہ کے کہنے پر وادیہ بیٹھ کر قتل کیا تھا۔ اب دولت ہاتھ میں آنے کے بعد نہ اس کا حصہ دے رہا تھا نہ ہی اس سے سادی کر رہا تھا، ام کو تو ایک بات کا اہم ہوس ہے اس کا داماد بیچارہ مفت میں مارا گیا۔“

چوکیدار کی زبانی شاذیہ کی گمشدگی کا سن کر سائل کو ایسا لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر گر آ ہوا۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں وہاں سے چل پڑا۔ وہ پیدل ناک کی سیدھ میں چلتا رہا، رات پڑی تو ایک پارک میں سو گیا۔ وہ شاذیہ کی یاد میں پاگل ہو چکا تھا۔

دن بھر ادھر ادھر گھومتا پھرتا۔ کوئی ترس کھا کر کچھ کھانے کو دیتا تو کھا لیتا، ورنہ بھوکا ہی رہتا۔ رات جہاں پڑتی وہیں سو جاتا، کبھی فٹ پاتھ اور کبھی پارک میں اس کا لیبر ہوتا۔ داڑھی موچیں بڑھ کر جھاڑ جھکاڑ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ لباس میلا پچلا ہو چکا تھا۔ بعض لوگ اسے بھکاری جان کر پیسے دے جاتے تھے۔ وہ سارا سارا دن چلتا رہتا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ ایک روز وہ چلتے چلتے ایک مزار پر جا پہنچا۔ جسرآت کا دن تھا۔ مزار کے باہر جانا پھولوں کی دکانیں تھیں، جن پر چڑھاوے کی چادریں موجود تھیں۔ کئی روز سے پیدل چلنے کی وجہ سے اس کی چپلیں بے حال ہو چکی تھیں اور ننگے پاؤں بری طرح زخمی اور خاک آلود تھے۔ وہ لوگوں کے ہجوم سے گزرتا ہوا دائیں طرف بنے ہوئے احاطے کی طرف بڑھا۔ تقریباً چار سو گز کے گرد چار فٹ کی چار دیواری کی گئی تھی۔ درجنوں کی تعداد میں خواتین مرد اور بچے احاطے کی دیواروں سے جھماک رہے تھے۔ وہ بھی غائب دماغی سے آگے بڑھا ایک موٹی تو ندوالے شخص کو دھکیل کر ایک طرف کیا اور دیوار کے اوپر سے جھانکنے لگا۔ احاطے میں کافی بڑا تالاب موجود تھا جس میں کئی مگرچے موجود تھے۔ مگرچے کا رکھوالا لکڑی کی ڈنڈی سے ان کے منہ میں گوشت کے ٹکڑے ڈال رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ان کا نظارہ کر کے پلٹا۔ وہ مزار کی سڑکیاں چڑھنے لگا۔ ایک طرف ہال نما کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس میں قوال جموتے ہوئے قوالی سنارہے تھے۔ قوالی سننے والے سامعین میں سے دو شخص اٹھ کر دیوانہ وار ناپنے لگے کچھ دیر قوالی سننے کے بعد وہ ہال نما کمرے سے باہر نکلا اور سڑکیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچا۔ بابا کی قبر کے گرد نصب خوب صورت ریلنگ کے پاس بیٹھ کر فاتحہ خوانی کی، دعا مانگتے ہوئے نجانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہاں موجود درجنوں کی تعداد میں خواتین اور مرد اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ”یا اللہ پچھڑے ہوؤں کو ملانے والے شاذ یہ کو صرف ایک بار مجھ سے ملادے۔“

دعا مانگنے کے بعد وہ مزار کی سڑکیاں اتر رہا تھا کہ سڑکیوں پر موجود ایک مجذوب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ مختصر الوجود مجذوب تھا۔ وہ انجھی ہوئی نگاہوں سے مجذوب کو دیکھنے لگا۔ ”عشق مجازی کو چھوڑ، عشق حقیقی کر اپنی امیدیں رحمان سے وابستہ کر لے، منزل آسان ہو جائے گی۔ دنیا کے پیچھے مت بھاگ، دنیا بھوکا ہے جو دنیا کے سراب میں مبتلا ہے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ خالق حقیقی کے عشق میں ڈوب جا، دنیا تیرے پیچھے ہوگی۔“ بند آنکھوں سے مجذوب نے کہا۔

ساحل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ”اب اپنی آنکھیں کھول دے۔“

اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران ہو گیا۔ وہ ایک پہاڑ پر موجود تھا اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ”ہم تو بابا کے مزار پر تھے اب یہاں پہاڑ پر کیسے آ گئے؟“ ساحل نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم نے بابا کے مزار پر بچے چلے دعا کی تھی۔ بابا بچے دل کی پکار سنتے ہیں۔۔۔۔۔ بابا نے ان ہی پہاڑوں میں چلے گا تا تھا اور دعا کی تھی۔“

”بابا کیا شاذ یہ مجھے ملے گی، آپ کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میں مرنے سے پہلے اس سے مل لوں۔“

ساحل نے اپنی خواہش کا اظہار مجذوب سے کیا۔ انہوں نے چند لمحے سوچا اور بولے۔ ”ٹھیک ہے آج سے تم چالیس روز کا چلے کا ٹوٹے ان چالیس دنوں میں تم نے حصار سے باہر نہیں نکلتا۔ میدان کی طرف تمہاری پشت ہوگی۔ تم نے چالیس دن تک پلٹ کر نہیں دیکھنا۔ سوچ لو چلے مکمل کر سکو گے؟“

”ہاں میں تیار ہوں۔“ ساحل نے حامی بھری۔

مجذوب کی ہدایت کے مطابق حصار میں بیٹھ کر مجذوب کا بتایا ہوا وظیفہ ساحل پڑھنے لگا۔ کئی دن گزر گئے۔ اس دوران وہاں گھومنے کے لئے کچھ لڑکے آئے۔ انہوں نے اس فقیر (ساحل) کو عبادت میں مشغول دیکھا تو علاقے میں جا کر بتایا، اپنے اپنے مسائل کا شکار لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لئے

آنے لگے، حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی بھی اس پہاڑ پر چڑھ نہ پاتا۔ جو بھی ساحل تک جانے کے لئے اوپر چڑھنا چاہتا، اس کے قدم اس کا ساتھ چھوڑ جاتے۔ میدان میں موجود لوگ اسے آوازیں دیتے۔ لیکن وہ کسی کی آواز پر توجہ نہیں دیتا، وہ صرف اور صرف وظیفہ پڑھنے میں مشغول رہتا۔ بہت سے لوگوں نے اس میدان میں کھڑے ہو کر دعا مانگیں۔ شاید وہ قبولیت کی کھڑی تھی۔ ان کی مراویں پوری ہوئیں۔ لوگوں نے اسے اس کی کرامات گردانا۔

چلے کے خاتے کا آخری روز تھا کہ وظیفہ پڑھتے ہوئے اس نے ایک ایسی آواز سنی کہ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ آواز وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا اس نے بے اختیار مڑنا چاہا مگر رک گیا، اسے مجذوب کی تنبیہ یاد آ گئی۔ مجذوب نے کہا تھا کہ چلے کے دوران نہ ہی پلٹ کر پیچھے دیکھنا اور نہ ہی حصار توڑنا۔ اس بار وہی آواز اس نے دوبارہ سنی اور وہ نہر سکا اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

☆.....☆.....☆

ایس پی اسفند یار بہت پریشان تھا، اپنی اسروں کے دوران اس کا اس قسم کے حالات سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ شہر سے آئے دن گلابی نو جوان لڑکیوں کی لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ ان کے جسم میں خون کی رقی تک نہ موجود ہوتی تھی۔ اس پر افسران بالا کی طرف سے دباؤ لگ گیا تھا اوپر سے میڈیا پر قانون نافذ کرنے والے اداروں پر سخت تنقید جاری تھی، شہر میں جگہ جگہ پولیس والے چوس رہے تھے۔

مگر اس کا کبھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہر گلی ہر محلے میں پولیس اہلکار گشت کرنے لگے۔ مگر لڑکیوں کی گلا کٹی لاشوں کے ملنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ایس پی اسفند یار اس وقت اپنی کار میں سوار گمر کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک چونک پڑا، اس کے قریب سے ایک لینڈ کروزر گزری تھی، اسے یوں لگا جیسے پچھلی نشست پر شہر میں موجود وہ اس نے کار کی رفتار بڑھادی اور لینڈ کروزر کا محتاط انداز میں پیچھا کرنے لگا۔ لینڈ کروزر میں پچھلی نشست پر دو خواتین

سمیت دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا وہ شہر تھا، لینڈ کروزر ایک پسماندہ علاقے سے گزر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد سڑک کے دونوں اطراف پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ کچھ دور جا کر لینڈ کروزر سڑک سے ہوتی ہوئی سڑک سے اتر کر جھاڑیوں سے گھرے ایک جگہ رک گئی۔

ایس پی اسفند یار نے اپنی کار سڑک پر ہی روکی اور محتاط انداز سے اس راستے پر چل دیا۔ اس ویران راستے میں سینٹ کی چادروں سے بنے مکان کے سامنے لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ وہ جھاڑیوں کی آڑ میں جا چھپا۔ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک پستہ قامت شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ سے دیوید کل شخص اتر اچھلی نشست پر بیٹھی لڑکیوں کو یو ایو کی زد میں لے ہوئے پستہ قامت شخص کے ہمراہ مکان میں داخل ہو گیا جبکہ شہریت اور دوسرا شخص لینڈ کروزر میں ہی بیٹھ رہے، کچھ دیر بعد وہ بھی اس مکان میں داخل ہو گئے۔

مکان کا دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا۔ اسفند یار کچھ دیر وہیں دیکھا رہا، پھر مکان کی طرف بڑھا۔ اچھل کر دیوار پر جا چڑھا۔ اندر جھانک کر دیکھا۔ برآمدے میں کوئی بھی موجود نہ تھا، سامنے موجود کمروں میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بچوں کے بل اندر کودا، چند لمحوں تک دیکھا رہا، جب یقین ہو گیا کہ اس کے کونے کی آواز کسی نے نہیں سنی تو اپنے ہوسٹر سے پھل نکال کر دبے قدموں دروازے پر جا پہنچا، اندر شہریت اور دوسرا شخص ایک لڑکی پر اسلحہ تانے اسے دھمکا رہے تھے، اسی وقت شہریت کے سامنے کھڑے ادیب عمر شخص کی نظر اسفند یار پر پڑی، تو وہ چلا یا۔ ”یہ کہاں سے آ گیا۔“

شہریت نے مڑ کر پھرتی سے فائر کرنا چاہا مگر اسفند یار پھرتی میں اسے مات دے گیا، اس کے مکمل سے نکل گئی۔ شہریت کے سینے میں گئی تو وہ کریناک آواز میں چیخا اور کمرے کے فرش پر گر کر تر پنے لگا۔

راجو کی توجہ اسفند یار کی طرف ہو چکی تھی۔ مشعل

نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ریلوور والے ہاتھ پر کلک ماری ریلوور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ ریلوور ہاتھ سے نکلنے ہی راجو نے مثل کے چہرے پر مکہ مارا، مثل نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ اسٹریٹ کلک ماری تو وہ گر کر زخمی ہو گیا۔

پست قامت نے بساط پلٹتے دیکھ کر حشمت کی لاش کے قریب پڑا مثل اٹھانا چاہا مگر مثل نے اپنی پٹلی سے بندھا خنجر نکالا اور تیزی سے اس کی طرف پھینکا، خنجر اس کے سینے کے سین دل کے مقام پر پیوست ہو گیا۔ وہ بنا آواز نکالے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اسفندیار مثل ہاتھ میں لے کرے میں ہونے والی معرکہ آرائی دیکھ رہا تھا۔ رضوان نے دوڑتے ہوئے اسفندیار پر چھلانگ لگائی، اسفندیار نے ٹریگر دبا دیا، رضوان کی خوش قسمتی کہ اسفندیار کا نشانہ خطا گیا۔ رضوان اس پر جاگرا اور اس کا مثل والا ہاتھ پکڑ لیا، اب دونوں آپس میں گھم گھما ہو چکے تھے۔

اپنے سینے کو اسفندیار سے لڑتے دیکھ کر اصغر حسین ان کی طرف بھاگا۔ اس کے پاؤں کی زوردار ٹھوکر اسفندیار کے ہاتھوں پر پڑی۔ مثل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جاگرا۔ اب اسفندیار کو دونوں باپ بیٹوں سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ اصر کرے میں مثل راجو پر لائن اور گھونے برسر اربی تھی۔

شاز یہ ایک طرف خوفزدہ سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ایک موقع پر راجو نے کلک ماری مثل کی ٹانگ پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اسے دھکا دے کر گرانے کے بعد اس پر چھلانگ لگائی مثل نے ایک طرف کروٹ بدل کر خود کو بچایا اور پھرتی سے کھڑی ہو گئی۔

راجو نے پست قامت کے سینے میں پیوست خنجر نکالا اور غضب ناک ہو کر مثل پر پے در پے وارے کر دیے پیچھے ہٹتے ہوئے خود کو اس کے مہلک حملوں سے بچاتی رہی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے اس کے ہاتھ میں کلک ماری کرسی آ گئی، جسے اس نے تیزی سے اٹھالیا۔ اب وہ کرسی سے اپنا کامیابی کے

نہیں اس کے مرنے کے بعد اس کی اور تمہارے مرنے کے بعد تمہاری بھی دولت و جائیداد میری ہوگی۔“ رضوان ہڈیانی ہنسی ہستے ہوئے بولا۔

”دولت کی لالچ نے تمہارا خون سفید کر دیا ہے، تمہیں اپنے باپ کی موت کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں، سچ کہا ہے کسی نے کہ جو شخص حرام کی دولت سے اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے اس کی اولاد اس کے کسی کام نہیں آتی۔“ مثل نے کہا۔

”بند کرو اپنا لیکچر اور ان کاغذات پر سائن کرو۔“ رضوان بولا۔

اسی وقت نیچے پڑے راجو کا جسم متحرک ہوا وہ گرا ہوتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”بد ذات! شرافت سے ان کاغذات پر سائن کرو۔ ورنہ تیری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔“

مثل کے لیوں پر استہزاء سے مسکراہٹ ابھری۔

”زندگی تمہارے ہاتھ میں نہیں اور نہ ہی تم دونوں کے خواب دیکھنے پر پابندی ہے۔“

”اگر تم زندہ رہی تو دیکھ لو گی کہ میں نے خواب دیکھا ہے یا چنچہ ارادے کا اظہار کیا ہے۔“ راجو کا داغ سلگ اٹھا۔

”اگر تمہارے ارادے پختہ ہیں تو ویرس بات کی ہے چلاؤ گوی۔“ مثل نے اس کی طرف اٹلی اٹھائی اور کشت لہجے میں کہا۔

شاز یہ ایک طرف پریشان سی کھڑی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ رضوان نے مثل کو گندی گالیاں دیں۔ اس کے منہ سے گلیاں سنتے ہی مثل کے تن بدن میں آگ لگ گئی، اس نے رضوان کے ہاتھ میں موجود مثل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برقی مستعدی سے رضوان پر چھلانگ لگادی، اسے مثل سے اس دیر انداز اقدام کی توقع نہ تھی، اس کے مثل سے گولی نہ نکل سکی۔ مثل نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گھونٹوں اور گھنٹوں کی ضربوں پر رکھ لیا۔ نیچے گرنے سے رضوان کا سر کمرے کے فرش پر زور سے

نکرایا تھا، اس لئے وہ مزاحمت نہ کر سکا اور وہ نہ صرف چت ہو گیا بلکہ اس کے ہاتھ سے مثل چھوٹ کر گر پڑا، بنے مثل نے لمحہ بھر میں اٹھالیا۔

راجو نے بھی ایک طرف پڑا مثل اٹھالیا جو شاید مردہ حشمت کا تھا۔ مثل ہاتھ میں آنے کے باوجود وہ مثل پر گولی نہ چلا سکا، شاید اس ڈر سے کہ کہیں گولی رضوان کو نہ لگے، وہ مثل لہرتا ہوا مثل کی طرف لپکا مگر مثل رضوان کے سینے پر بیٹھ کر مثل کی نال اس کی پیشانی پر رکھ چکی تھی۔ وہ سفاک لہجے میں بولی۔ ”مثل پھینک دو ورنہ۔“ رضوان اور راجو کے چہرے خوف سے تاریک ہو گئے، بساط کو پلٹا دیکھ کر دونوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ لڑکی ہونے کے باوجود ان پر حاوی ہو چکی تھی۔

راجو نے مثل کا رخ شاز یہ کی طرف کر دیا۔

”اسے چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ تو مارو نا گولی کس نے منع کیا ہے اس کے بعد رضوان کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی اور اگر مجھ پر گولی چلائی تب بھی نہیں بچے گا، میں مرتے مرتے اسے بھی جہنم رسید کر دوں گی، تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مثل پھینک کر رضوان کی زندگی بچالو۔“ وہ سانپ کی طرح پھنکاری۔

رضوان بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خوف زدہ تھا۔ بلکہ وہ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا۔

”جلدی کرو مثل پھینکو ورنہ گولی چلا دوں گی۔“

”مثل پھینک دو راجو۔“ رضوان بے چارگی سے بولا اور راجو نے مثل پھینک دیا۔

”اب دونوں ہاتھوں سے بلند کر کے پیچھے ہٹو۔“ اس نے مثل کے حکم کی تعمیل کی اور ہاتھوں سے بلند کر کے پیچھے ہٹا۔ مگر پیچھے ہٹتے ہٹتے اس نے زمین پر پڑا خنجر اٹھانا چاہا۔ مثل نے جی کی سی تیزی سے حرکت کی اور راجو کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی راجو کی پیشانی میں اتر گئی۔ اس کے حلق سے کرناک چیخ نکلی اور وہ نیچے گر پڑا۔

”مم..... مجھے معاف کر دو، مجھے مت مارنا۔“
رضوان مثل سے زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ مثل نے دانت کھینچے ہوئے ٹرگر ڈبا دیا۔ گولی، اس کے نیچے دے
رضوان کی پیشانی میں اتر گئی۔ اس کے جنم رسید ہوتے
ہی مثل اس پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

مثل نے ایک طرف خوفزدہ کھڑی شازیہ کا ہاتھ
تھاما اور کمرے میں پڑی رضوان، پستہ قامت شخص اور
راجو کی لاشوں کی طرف نفرت بھری نظر ڈالتے ہوئے ان
کی لاشوں کو پھلانگ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔
برآمدے میں اصغر حسین کی لاش پر نفرت بھری نظر ڈالتے
ہوئے اس نے ایک طرف پڑے اسفند یار کو دیکھا جو
کسمپاسا ہوا اٹھ رہا تھا۔

”آپ دونوں کون ہیں اور انہیں کس نے کیفر
کردار تک پہنچایا ہے۔“ اسفند یار نے کمرے میں پڑی
راجو اور رضوان کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں میرے ہی ہاتھوں مرے ہیں ان
میں سے ایک میرے والدین اور بھائی کا قاتل تھا۔“
مثل لاشوں کی طرف نفرت انگیز نظروں سے دیکھتے
ہوئے بولی۔

”میں ایس بی اسفند یار ہوں، حشرت کو لینڈ
کروڑ میں دیکھ کر اس کا پیچھا کرنے لگا، وہیں پتہ چلا کہ
اس نے آپ لوگوں کو کڈ نیپ کیا ہے، جب یہ آپ لوگوں
کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو میں دیوار پھلانگ کر
مکان میں داخل ہو گیا اس کے بعد جو ہوا آپ کے
سامنے ہوا، آپ دونوں نے اپنا تعارف نہیں
کرایا۔“ اسفند یار اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے
ہوئے بولا۔

”میرا نام مثل ہے اور یہ شازیہ ہے۔“ مثل
نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی روداد سنا ڈالی۔

”ادھ تو آپ ہیں مثل، مجھے ساحل نے آپ
کے بارے میں بتایا تھا، آپ کو جگہ جگہ تلاش کیا مگر
آپ نہیں ملیں اس دوران ساحل بھی غائب ہو چکا
تھا۔“ ایس بی بولا۔

شازیہ، ساحل کا نام سن کر لمحہ بھر کو چکی پھر سوچا۔
”لازمی نہیں کہ یہ میرے ساحل کا ذکر کر رہے ہوں،
ساحل نام کے بہت سے لوگ ہیں۔“

ایس بی اس دوران پولیس ایمر جنسی کا نمبر ملا کر
اپنا تعارف کر دیا اور پولیس پارٹی کو طلب کر رہا تھا۔ اس
کے بعد اس نے رابطہ منقطع کیا اور بولا۔ ”پولیس کے
آنے سے پہلے آپ لوگ یہاں سے جائیں، میں
صورت حال کو سنہال لوں گا۔ آپ دونوں اچھے گھرانے
کی لڑکیاں ہیں، بلاوجہ غیر ضروری تعیش میں پڑ جائیں گی
اور ہاں میں مثل آپ اپنا ایڈریس دے جائیں۔ یہاں
سے فارغ ہو کر آپ سے رابطہ کروں گا۔“

مثل نے سے اپنا ایڈریس دیا اور جانے کی
اجازت چاہی۔ ”آپ اگر چاہیں تو میری کار لے جاسکتی
ہیں۔“ وہ مثل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے یہ
بہادر لڑکی پسند آئی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اس کا آئیڈیل
چل کر اس کے سامنے آ چکا ہو، جھٹک یو آفسر، ہم جنسی
سے چلے جائیں گے۔“ مثل بولی۔

”آفسر نہیں میرا نام اسفند یار ہے۔“ وہ شوشی
سے بولا اور مثل شازیہ کا ہاتھ تھامے مکان سے باہر
نکل گئی۔

اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی فائرنگ اور
ہنگامے کے باوجود اس مکان کی طرف کسی نے رخ نہیں
کیا تھا، یہ وہی نہیں سکتا کہ فائرنگ کی آواز کسی نے نہ سنی
ہو، پھر سوچا پھر کے حالات بھی کس قدر خراب ہیں، آئے
روز کی دہشت گردی نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا ہے۔
مقامی پولیس مجرموں کے بجائے بے ضرر لوگوں کو پکڑ لیتی
ہے، اس لئے بھی لوگ جانتے بوجھتے ہوئے گونگے اور
بہرے بن جاتے ہیں۔

وہ دونوں چلتی ہوئی جھاڑیوں والی گلی سے نکل کر
سڑک پر پہنچیں اور جنسی کا انتظار کرنے لگیں۔ اسی وقت
دو پولیس موبائل آگے پیچھے جھاڑیوں والی گلی میں داخل
ہوئیں۔ ”ہماری پولیس بڑی مستعد اور چاک و چوبند ہے
ہمیشہ واردات کے کئی گھنٹوں بعد پہنچتی ہے۔“ مثل نے

طرز یہ لکھ میں کہا اور شازیہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی۔
جنسی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا، ابھی وہ
نصف کلومیٹر ہی چلی تھیں کہ ٹھٹک کر رک گئیں۔ طان شے
اپنے بھیا یک چہرہ سمیت ان کے سامنے کھڑا خطرناک
تیوروں سے انہیں گھور رہا تھا۔ مثل نے بے اختیار اپنے
گلے میں موجود باپا نور جلال کے لاکٹ کو ٹولا اور دھک
سے دھک لگا، لاکٹ گلے میں موجود نہ تھا شاید بھاگ دوڑ
اور کھینچا تانی سے لاکٹ کہیں گر چکا تھا۔ ان دونوں کو ایسا
لگ رہا تھا کہ ان کا دل خوف سے اچھل کر طعن میں آ گیا
ہو۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جان
بیچانے کے لئے ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئیں۔ طان
شے انہیں بھاگتا دیکھ کر کچھ عفریت کی طرح ان کے پیچھے
دوڑا۔ سڑک سے گزرنے والے لوگ تعجب سے یہ حیرت
انگیز منظر دیکھ رہے تھے۔ دونوں جوان لڑکیاں سڑک پر
بھاگ رہی ہیں جبکہ ایک بھیا یک صورت دیویدیکل شخص
ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے، راستے میں چند افراد نے طان
شے کی راہ میں حرا م ہونا چاہا۔ مگر ان کا حشر بہت ہی برا
ہوا، طان شے نے انہیں کھٹکوں کی طرح اٹھا کر سڑک پر
ٹپو دیا۔ اس کا ہاتھ تھا کہ تھوڑا جیسے پڑتا دوبارہ اٹھ نہ
سکتا۔ ان کا انجام دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ طان شے
کو روک سکیں۔

وہ دونوں بھاگتی ہوئی پہاڑی سلسلے کے درمیان
پہنچ چکی تھیں، چاروں طرف پہاڑ تھے جبکہ درمیان میں
میدان تھا، اس میدان میں درختوں کی تعداد میں لوگ
موجود تھے جو پہاڑ پر موجود ایک شخص کو بڑی توجہ اور
اشہاک سے دیکھ رہے تھے۔

شازیہ، مثل اور ان کے پیچھے بھاگتے بھیا یک
صورت طان شے کو دیکھ کر وہاں موجود لوگ سکتے میں
آ گئے، وہ عفریت معلوم ہو رہا تھا۔ بہت سے لوگوں کی ڈر
کے مارے پیچھے نکل گئیں۔

وہ دونوں بھاگتی ہوئی میدان میں داخل ہو چکی
تھیں۔ طان شے ان کے پیچھے چلتا چلتا دوڑتا رہا تھا۔
یہاں بھی کچھ افراد نے اسے روکنا چاہا۔ جنہیں اپنی غلطی

کا خمیازہ اپنی زندگی سے محرومی کی صورت میں بھگتنا پڑا۔
لوگوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ وہ اس عفریت
سے جان بچانے کے لئے ایک طرف بھاگنے لگے۔ اسی
وقت طان شے ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ
بڑھا کر بھاگتی ہوئی شازیہ کو پکڑ لیا۔ ”اب تجھے مجھ سے
کون بچائے گا؟“ وہ شیطانی آواز میں ہنسا۔
مثل شازیہ کو اس کے ہاتھ میں جکڑے دیکھ کر
اپنی جگہ کر گئی۔ ”میں جان چکا ہوں تو میرے دشمن کی
بیٹی اور دوسرے دشمن کی نوای ہے، اس لڑکی کے بعد تیری
باری ہے۔“

شازیہ یہ خود کو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑاتے
ہوئے بلند آواز سے چیخ رہی تھی۔ ”بچاؤ بچاؤ..... خدا
کے لئے مجھے اس عفریت سے بچاؤ۔“

اسی وقت پہاڑ پر بیٹھے عبادت میں مشغول شخص
نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ شازیہ کی آواز سن
کر مڑا تھا، اس کے بدلے ہوئے جلنے کے باوجود
شازیہ اسے پہچان چکی تھی۔ وہ اس کا محبوب اس کی
محبت ساحل تھا۔ وہی ساحل جو نیل کی کال کو خشری میں
مردہ پایا گیا تھا۔ جسے آہوں اور سکیوں کے ساتھ قبر
میں اتارا گیا تھا۔

شازیہ عفریت کے ہاتھوں میں جکڑی ساحل کو
دیکھ رہی تھی۔

ساحل کو دیکھ کر بھیا یک صورت طان شے کا
خوف اور ڈر دل سے نکل چکا تھا۔ ”ساحل“ وہ بلند آواز
سے چلائی۔

ساحل جو خود بھی اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنا حصار توڑ
کر تیزی سے پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔

اسے نیچے اترتا دیکھ کر ادھر ادھر بھاگنے والے
لوگ رک چکے تھے۔ ”اچھا تو تو نے اسے مدد کے لئے
بلا یا ہے، چل اسے بھی آنے دے۔“ طان شے نے قہقہہ
لگایا۔ اس کا قہقہہ اس قدر خوفناک تھا کہ لوگوں کے دل
دلہ گئے۔ اس اثناء میں ساحل پہاڑ سے اتر کر اس کے
سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

بادل گرجنے لگے، طمان شے نے خوف زدہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک دم ہی موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ بارش اس قدر تیزی سے برس رہی تھی کہ وہاں موجود تمام افراد بل بھر میں بری طرح بھجک چکے تھے۔ طمان شے کی انگوٹھی بارش کے پانی میں بھجک چکی تھی۔ اس نے بھاگنا چاہا تو ساحل نے اپنی محمی میں موجود مٹی طمان شے پر چبھک دی، مٹی کا جسم سے لگنا تھا کہ وہ زمین پر گر کر تر پئے لگا۔

”مثمل بننا اس کے دل میں خنجر اتار دو۔“ مجذوب کی آواز گونجی اور مٹھل نے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر ہاتھ میں لیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر طمان شے کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست کر دیا۔

طمان شے کی آخری چنچیں لرزہ خیز تھیں۔ اب حیرت انگیز طور پر برسنے والی بارش رک چکی تھی۔ طمان شے کی لاش دھوئیں میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی۔ میدان میں موجود تمام افراد خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مجذوب نے ساحل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”چلے کے آخری روز چلہ مکمل کئے بغیر پلٹ کر دیکھنا تیری غلطی تھی، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ مڑ کر مت دیکھنا۔ خیر تو نے مجبوری کی حالت میں یہ سب کیا۔“ مجذوب نے کہا اور ساحل نے اداسی سے اپنی گردی اثبات میں ہلا دی۔

”خیر! اوپر والے کو تجھ پر ترس آ گیا، تو نے بہت دھکے کھائے اور پھر آخر کار اللہ کو خالق کو مالک اور مددگار سمجھتے ہوئے اس سے لو لگایا، چاہی خواہش کی تکمیل کر، اللہ کے آگے ہمیشہ جھکتے رہنا، اور آئندہ کوئی بھی فاش غلطی نہ کرنا۔“ اور یہ بولتے ہی مجذوب اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔

مثمل کے ساتھ ساحل اور شاز یہ نے آگے کی جانب قدم بڑھا دیئے، ان تینوں کوئی زندگی اپنی آغوش میں لینے کے لئے انتظار کر رہی تھی۔

”چھوڑ دے اسے۔“ وہ پرسکون لہجے میں بولا۔
”نہیں یہ دونوں میرا شکار ہیں آج انہیں میرے ہاتھوں مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تو بھی اپنی جان بچا کر بھاگ جا۔“ وہ ہماری بھر کم گونجی آواز میں بولا۔
”شیطان تو اپنی شیطانی طاقتوں پر اتنا گھمنڈ

مت کر۔“ اسے اپنی پشت پر ایک آواز سنائی دی۔ طمان شے نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک مجذوب کھڑا تھا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے تجھے دوبارہ زندگی شیطان نے دی ہے یہ تیری غلط فہمی ہے۔ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ نے اصحاب کہف پر ایک غار میں موت کو طاری کیا پھر وہ زندہ ہو گئے۔ یہ زندگی بھی اللہ کی دی ہوئی تھی۔ تجھے مرنے کے بعد زندگی پر یقین نہیں تھا۔ تجھے یہ زندگی اس لئے دی گئی کہ تو جان سکے کہ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے، مگر تیرے دل پر مہر لگ چکی ہے، اسی لئے تو شیطان کا پیروکار بنا رہا ہے۔

ساحل کا عشق مجازی میں مبتلا ہو کر جیل جانا پھر جیل سے نکل کر مٹھل تک پہنچنا۔ شاز یہ کا تجھ تک پہنچنا۔ ساحل کا عشق مجازی سے عشق حقیقی میں مبتلا ہونا سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ جو اللہ سے لو لگتا ہے شیطان اور اس کے پیروکار اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ساحل نے اللہ سے لو لگایا ہے، اللہ ہی اس کی مدد بھی کرے گا۔ حق حق ہے اور باطل جتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو۔ فتح آخر حق کی ہی ہوتی ہے۔“ مجذوب جلال میں اچکا تھا۔

”یہ تیری بیمول ہے، مجذوب میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، مجھے زندگی میں پہلی بار کسی پر ترس آ رہا ہے، یہ مولوی بلا وجہ میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔“ وہ شاز یہ کو ایک طرف دھکیل کر ساحل کی طرف بڑھا۔

ساحل اپنی نظریں اس پر جمائے پرسکون انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس عفریت سے اسے ذرا برابر بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ شاز یہ اور مٹھل کی آنکھیں خوف سے پھٹی جاری تھیں۔ انہیں ساحل کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ ساحل نے نجانے کس خیال کے تحت زمین سے مٹی اٹھائی اور بلند آواز سے آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ اچانک

